تفقہ فی الدین کا داعی ادارہ

ماہ نامہ

مفاہیم

فقہ اکیڈمی کا ترجمان

وَقَضَيْنَا إِلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ فِي الْكِتَابِ لَتُفْسِدُنَّ

فروری ۲۰۲۴ء بمطابق شعبان ۱۴۴۵ھ

القدس نمبر

جلد ۴/ شمارہ ۲

فقہ اکیڈمی

کتاب	:	ماہنامہ مفاہیم القدس نمبر
سنِ اشاعت	:	شعبان المعظم ۱۴۴۵ھ بہ مطابق فروری ۲۰۲۴ء
تعدادِ اشاعت	:	ایک ہزار
ای میل	:	info@fiqhacademy.com.pk
ناشر	:	مجلسِ ادارت ماہنامہ مفاہیم، فقہ اکیڈمی
ویب سائٹ	:	/https://fiqhacademy.com.pk
بہ اشتراک	:	فاتح فاؤنڈیشن پاکستان
ویب سائٹ	:	/https://fatihfoundation.com

فقہ اکیڈمی کی مطبوعات یہاں دستیاب ہیں

فقہ اکیڈمی کراچی: C-335، گلستانِ جوہر، بلاک 1، بالمقابل جامعہ کراچی، یونیورسٹی روڈ، کراچی

ہاؤس آف فاتح کراچی: B-190، گلستانِ جوہر، بلاک 3، کراچی

جامع مسجد شفیق الرحمٰن، D 49، گلزارِ ہجری اسکیم 33، صائمہ ایلیٹ ولاز، کراچی

ہاؤس آف فاتح لاہور: N 289، ماڈل ٹاؤن ایکسٹینشن بلاک N، ماڈل ٹاؤن، لاہور

ہاؤس آف فاتح اسلام آباد: 6، اسٹریٹ 71، سیکٹر G 13/2، G-13، اسلام آباد

الباقیات الصالحات فاؤنڈیشن: جامع مسجد دارالارشاد، 110، بلاک B، عباس بروہی گوٹھ، نزد گلشنِ معمار، عقب ناردرن بائی پاس، کراچی

مرکزی دفتر الحکمۃ وقف، G-20/4، بلاک B، نارتھ ناظم آباد، نزد ضیاء الدین اسپتال، کراچی

دفتر الحکمۃ وقف، نزد مارننگ اسٹار ہائی اسکول، اختر کاٹیجز، قاسم آباد، حیدر آباد

دفتر الحکمۃ وقف، B/264، یونٹ نمبر 9، میر فضل ٹاؤن، لطیف آباد، حیدر آباد

دفتر الحکمۃ وقف، وارڈ 76، شاہ کالونی، کھپرو، سندھ

دفتر الحکمۃ وقف، حفاظ اکیڈمی، مکان 54، بخاری اسٹریٹ، گارڈن ٹاؤن، ملتان

دفتر الحکمۃ وقف، الحکمۃ اکیڈمی للبنات، محلہ گلفام، گلی 5، ڈہانگری، مانسہرہ

دفتر الحکمۃ وقف، مسجد عمر فاروق، موسیٰ آباد، منڈا، ضلع لوئر دیر

دفتر الحکمۃ وقف، ہاؤسنگ اسکیم نزد عسکری بینک، راولاکوٹ، آزاد کشمیر

من يرد الله به خيرا يفقهه في الدين

زاجتہادِ عالمانِ کم نظر
اقتدا بر رفتگان محفوظ تر

اقبال

ليتفقهوا في الدين

ماہ نامہ

مفاہیم

کراچی

فقہ اکیڈمی کا ترجمان | تفقہ فی الدین کا داعی ادارہ

سرپرستِ اعلی

حضرت مولانا مفتی نذیر احمد ہاشمی صاحب مدظلہ

مدیر

صوفی جمیل الرحمٰن عباسی

نائب مدیر

مولانا حماد احمد ترک

مجلسِ مشاورت

- ڈاکٹر محمد رشید ارشد
- مفتی اویس پاشا قرنی
- مولانا معراج محمد
- مولانا سید اسامہ علی
- مولانا ابرار حسین
- مولانا عابد علی

فقہ اکیڈمی

C-335، بلاک-1، گلستان جوہر، بالمقابل جامعہ کراچی، یونیورسٹی روڈ، کراچی، پاکستان۔ 3474 3662 21 92 + | 3474 3661 21 92 +

FIQHACADEMY.COM.PK FIQHACADEMY FIQHACADEMYPK +92 330 3474223

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قَالَ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ

﴿وَلَمَّا رَأَى الْمُؤْمِنُونَ الْأَحْزَابَ قَالُوا هَذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُولُهُ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُولُهُ وَمَا زَادَهُمْ إِلَّا إِيمَانًا وَتَسْلِيمًا۝مِنَ الْمُؤْمِنِينَ رِجَالٌ صَدَقُوا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ۖ فَمِنْهُمْ مَنْ قَضَىٰ نَحْبَهُ وَمِنْهُمْ مَنْ يَنْتَظِرُ وَمَا بَدَّلُوا تَبْدِيلًا﴾ (الاحزاب:۲۲،۲۳)

”اور جو لوگ ایمان رکھتے ہیں، جب انھوں نے (دشمن کے) لشکروں کو دیکھا تھا تو انھوں نے یہ کہا تھا کہ: یہ وہی بات ہے جس کا وعدہ اللہ اور اس کے رسول نے ہم سے کیا تھا اور اللہ اور اس کے رسول نے سچ کہا تھا۔ اور اس واقعے نے ان کے ایمان اور تابع داری کے جذبے میں اور اضافہ کر دیا تھا۔ انھی ایمان والوں میں وہ لوگ بھی ہیں جنھوں نے اللہ سے جو عہد کیا تھا اسے سچا کر دکھایا۔ پھر ان میں سے کچھ وہ ہیں جنھوں نے اپنا نذرانہ پورا کر دیا اور کچھ وہ ہیں جو ابھی انتظار میں ہیں اور انھوں نے (اپنے ارادوں میں) ذرا سی بھی تبدیلی نہیں کی“۔

فائدہ: نذرانہ پورا کرنے سے مراد جہاد میں جامِ شہادت نوش کرنا ہے اور مطلب یہ ہے کہ جو صحیح معنیٰ میں مومن تھے، انھوں نے اللہ تعالیٰ سے یہ عہد کیا تھا کہ وہ اس کے راستے میں اپنے جان و مال کی قربانی سے دریغ نہیں کریں گے۔ پھر ان حضرات میں سے کچھ نے تو اپنی جان کا نذرانہ پیش کر کے جامِ شہادت نوش کر لیا اور کچھ وہ ہیں جنھوں نے جہاد میں حصہ تو لیا، لیکن شہید نہیں ہوئے اور ابھی اس انتظار اور اشتیاق میں ہیں کہ کب انھیں بھی اللہ تعالیٰ کے راستے میں جان قربان کرنے کا موقع ملے۔

*****

غازیانِ قدس کی فضیلت

قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ:

«لَا تَزَالُ عِصابَةٌ مِن أُمَّتِيْ يُقاتِلُوْنَ عَلَى أَبْوَابِ دِمَشْقَ ومَا حَوْلَهُ، وعلَى أَبْوَابِ بَيْتِ الْمَقْدِسِ ومَا حَوْلَهُ، لَا يَضُرُّهُمْ خِذْلانُ مَنْ خذَلَهُمْ، ظَاهِرِيْنَ عَلَى الْحَقِّ إِلَى أَنْ تَقُومَ السَّاعَةُ». (مسندِ ابی یعلیٰ)

’’میری امت سے ایک جماعت دِمشق کے دروازوں اور اس کے آس پاس، اور اسی طرح بیت المقدس اور اس کے آس پاس برابر جنگ کرتی رہے گی۔ لوگوں کا ان کو بے یار و مدد گار چھوڑ دینا انھیں کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا، وہ غالب رہیں گے۔ (اس معرکے کا سلسلہ چلتا رہے گا) یہاں تک کہ قیامت قائم ہو جائے گی‘‘۔

اس حدیث شریف میں ان مجاہدین کے لیے نبیِ اکرم ﷺ کی طرف سے بشارت موجود ہے جو دمشق اور القدس میں کلمۂ حق کی سربلندی کے لیے باطل کے خلاف برسرِ پیکار ہیں۔ حدیث شریف میں بیت المقدس اور اس کے اطراف کا ذکر کر کے فلسطین کے مجاہدین کو کامیابی کا مژدہ سنایا گیا ہے۔ اس حدیث میں جہاں القدس کے ’’بے تیغ سپاہیوں‘‘ کی کامیابی کا بیان ہے وہیں اُن لوگوں کے لیے وعید بھی ہے جو فلسطینی مجاہدین کو تنہا کر کے انھیں دشمنوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیں۔

*****

فہرست

نعت ۹
مولانا الطاف حسین حالی
اداریہ ۱۲
مدیر ماہنامہ مفاہیم
حماس کا اسرائیل پر حملہ اور چند غلط فہمیوں کا ازالہ ۱۵
شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم
اراضیِ فلسطین سے متعلق حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کا فتویٰ ۲۳
مترجم: مولانا محمد اعجاز
یہودی اقتدار کا شرعی تجزیہ اور اسرائیل ۳۰
حکیم الاسلام قاری محمد طیب قاسمی صاحب رحمۃ اللہ علیہ
مسئلۂ فلسطین برطانوی دستاویزات کی روشنی میں ۳۷
مولانا محمد واضح رشید حسنی ندوی صاحب رحمۃ اللہ علیہ
مسئلۂ فلسطین امریکی دستاویزات کی روشنی میں ۳۹
مولانا محمد واضح رشید حسنی ندوی صاحب رحمۃ اللہ علیہ
مسئلۂ فلسطین اور برطانوی وزیرِ خارجہ بال فور کا موقف ۴۲
مولانا زاہد الراشدی
نظم یروشلم، یروشلم ۴۴
نعیم صدیقی
تاریخِ فلسطین عہد بہ عہد ۴۶
مولانا محمد اقبال
آزادیِ فلسطین کی جدوجہد: دورِ استعمار سے قیامِ ریاست تک ۶۱
مولانا عبد الغفور صدیقی

علامہ اقبال کا سفرِ فلسطین ______ ۷۷
ڈاکٹر جاوید اقبال
نظم فلسطینی شہدا جو پردیس میں کام آئے ______ ۸۶
فیض احمد فیضؔ
فتحِ بیت المقدس ______ ۸۷
صوفی جمیل الرحمٰن عباسی
بیت المقدس کا معاہدہ ______ ۹۴
علامہ شبلی نعمانی
آہ! القدس میں تقدیرِ الٰہی نازل ہوئی ______ ۹۵
ممتاز لیاقت
لشکرِ اسلام القدس کے سامنے ______ ۹۸
مولانا محمد اسماعیل ریحان
صبحِ قیامت ______ ۱۰۶
ممتاز لیاقت
نظم یروشلم ہے کہ راہِ غم ہے!... ______ ۱۱۲
فاضل جمیلی
آزادیِ فلسطین کی جدوجہد: قیامِ ریاست سے ۸۲ء کی جنگِ لبنان تک ______ ۱۱۴
مولانا عبدالغفور صدیقی
فلسطینیوں کی اصل قوت ______ ۱۴۰
احمد جاویدؔ
اُمت کا موجودہ بحران فکرِ اقبال کی روشنی میں ______ ۱۴۹
ڈاکٹر رشید ارشد
قضیۂ فلسطین ______ ۱۵۷
مفتی اویس پاشا قرنی

سید الطائفہ سے طائفۂ منصورہ تک ۱۶۴
صوفی جمیل الرحمٰن عباسی
نظم دیوارِ گریہ ۱۷۳
ابنِ انشآ
اسرائیلی جنگی جرائم ۱۷۸
شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم
بیت المقدس کے اہم مقامات ۱۸۲
مفتی ابولبابہ شاہ منصور دامت برکاتہم
فلسطین اور پاکستانی اُردو ادب ۱۸۹
ڈاکٹر رؤف پاریکھ
مسئلہ فلسطین کلامِ اقبال کی روشنی میں ۱۹۴
صوفی جمیل الرحمٰن عباسی
نظم سرِ وادیِ سینا ۲۰۲
فیض احمد فیضؔ
فلسطین اور لاتوں کے بھوت ۲۰۳
وسعت اللہ خان
آزادیِ فلسطین کی جدوجہد: قیامِ حماس سے آغازِ طوفان الاقصیٰ تک ۲۰۶
مولانا عبدالغفور صدیقی
معرکۂ طوفان الاقصیٰ ۲۵۰
مولانا احماد احمد ترکؔ
القدس کا تاریخی پس منظر اور طوفان الاقصیٰ: ہماری ذمے داری ۲۶۴
مولانا زاہد الراشدی
نظم مسجدِ اقصیٰ ۲۷۰
اداؔ جعفری

مولانا الطاف حسین حالیؔ

نعت

اے خاصۂ خاصانِ رسل وقتِ دعا ہے
امت پہ تری آ کے عجب وقت پڑا ہے
جو دین بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے
پردیس میں وہ آج غریبُ الغُرَبَاء ہے
جس دین کے مدعو تھے کبھی قیصر و کسریٰ
خود آج وہ مہمان سرائے فُقَرا ہے
وہ دین ہوئی بزمِ جہاں جس سے چراغاں
اب اس کی مجالس میں نہ بتی نہ دیا ہے
جو دین کہ تھا شرک سے عالم کا نگہباں
اب اس کا نگہبان اگر ہے تو خدا ہے
جس دین کا تھا فقر بھی اکسیر، غنا بھی
اس دین میں اب فقر ہے باقی، نہ غنا ہے
جس دین کی حجت سے سب ادیان تھے مغلوب
اب معترض اس دین پہ ہر ہَرزہ دَرا ہے

چھوٹوں میں اطاعت ہے نہ شفقت ہے بڑوں میں
پیاروں میں محبت ہے نہ یاروں میں وفا ہے
جس قصر کا تھا سر بفلک گنبدِ اقبال
اِدبار کی اب گونج رہی اس میں صدا ہے
وہ قوم کہ آفاق میں جو سر بہ فلک تھی
وہ یاد میں اسلاف کی اب رو بہ قضا ہے
فریاد ہے اے کشتیِ امت کے نگہباں
بیڑا یہ تباہی کے قریب آن لگا ہے
اے چشمۂ رحمت بِأَبِي أَنْتَ و أُمِّي
دنیا پہ تیرا لطف سدا عام رہا ہے
کر حق سے دعا امتِ مرحوم کے حق میں
خطروں میں بہت جس کا جہاز آ کے گھرا ہے
امت میں تری نیک بھی ہیں، بد بھی ہیں لیکن
دل دادہ ترا ایک سے ایک ان میں سوا ہے
ایماں جسے کہتے ہیں عقیدے میں ہمارے
وہ تیری محبت، تری عترت کی وَلا ہے
جو خاک تیرے در پہ ہے جاروب سے اڑتی
وہ خاک ہمارے لیے داروے شفا ہے
جو شہر ہوا تیری ولادت سے مشرف
اب تک وہی قبلہ تری امت کا رہا ہے

جس ملک نے پائی تری ہجرت سے سعادت
کعبے سے کشش اس کی ہر اک دل میں سوا ہے
کل دیکھیے پیش آئے غلاموں کو ترے کیا
اب تک تو ترے نام پہ اک ایک فدا ہے
ہم نیک ہیں یا بد ہیں پھر آخر ہیں تمھارے
نسبت بہت اچھی ہے اگر حال برا ہے
تدبیر سنبھلنے کی ہمارے نہیں کوئی
ہاں ایک دعا تیری کہ مقبولِ خدا ہے
خود جاہ کے طالب ہیں نہ عزت کے ہیں خواہاں
پر فکر ترے دین کی عزت کی سدا ہے
اے خاصۂ خاصانِ رسل وقتِ دعا ہے
امت پہ تری آ کے عجب وقت پڑا ہے

*****

اداریہ

اہلِ غزہ، غزوے میں مصروف ہیں اور ہم ''تعزیے'' میں !!۔ کہا گیا کہ اسرائیل کے بغیر دنیا بہت خوب صورت ہو سکتی تھی۔ دنیا کی خوب صورتی توفی الوقت میسر نہ ہوئی لیکن یاروں کو خیال آیا کہ آپریشن طوفان الاقصیٰ نہ ہوتا تو دنیا کم از کم اتنی بدصورت تو نہ ہوتی خاص کر فلسطینیوں کے لیے۔ لیکن ایسے پُرخیال دماغوں کو کچھ خیال کرنا چاہیے کہ یہ حسین خیال کتنے دماغوں میں آچکا... کتنے ہی فلسطینی تھے جو دنیا کی خوب صورتی سے مایوس ہو کر کم بدصورتی پر راضی ہوئے۔ جنھوں نے گریبان سی کر ترکِ محبتِ قُدس کا زہر پیا لیکن ''زمانہ'' پھر بھی ان سے خوش نہ ہوا۔

یاسر عرفات مرحوم نے ''زمانے'' کو اپنے ہاتھوں کی شاخِ زیتونِ سبز دکھاتے ہوئے بہت مودّبانہ گزارش کی تھی کہ اس شاخ کو میرے ہاتھوں سے گرنے مت دیجیے لیکن اس شاخ تراش کو زہر سے زیرِ زمیں کر دیا گیا۔ اسی پر بس نہیں بلکہ فلسطینی عربوں کے بچوں کو دیواروں پہ پٹخا گیا۔ اِن کی عورتوں کو سڑکوں پہ گھسیٹا گیا، ان کے جوانوں کو ٹینکوں سے روندا گیا، ان کے بوڑھوں کو پابندِ سلاسل کیا گیا، احتجاج کی آوازوں کو گولیوں کے شور میں دبا دینے کی کوششیں کی گئیں۔ جب فلسطینیوں نے دیکھا کہ شجرِ زیتون کی جڑوں پر تیشہ رکھا جا چکا ہے تب ''دیوانگی میں چاک گریبان ہو گیا'' کے مصداق وہ بہ جنگ آمد ہو گئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حجرِ اسود چومتے نہ دیکھا ہوتا تو وہ اسے کبھی نہ چومتے، اسی طرح اگر فلسطینیوں کو معلوم نہ ہوتا کہ یہ علاقے چند ہزار سال پہلے عربوں نے آباد کیے تھے تو شاید وہ خاموش رہتے۔ اگر یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آسمانی سواری نہ اتری ہوتی، اگر یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نبیوں کی جماعت نہ کرائی ہوتی تو شاید مسلمان خاموش رہتے۔ اگر ابن الجراح رضی اللہ عنہ نے یہاں کا محاصرہ نہ کیا ہوتا تو شاید 'ابو عبیدہ' آج خاموش ہوتا۔ اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پا پیادہ یہاں کا سفر نہ کیا ہوتا، اگر صفرونیوس پادری نے بیت المقدس کی چابیاں

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حوالے کرتے ہوئے بیت المقدس میں یہودی آباد کاری کی ممانعت کی شرط نہ رکھی ہوتی اور اگر داؤد علیہ السلام نے یہود پر لعنت نہ کی ہوتی تو شاید فلسطینی یہودیوں کو گوارا کر لیتے۔ یہودی تو ابراہیم و سلیمان علیہما السلام کے دور کے وہ آسمانی وعدے یاد دلاتے ہیں جنھیں بعد کے نبیوں اور کتابوں نے یہود کے کرتوتوں کے سبب منسوخ قرار دے دیا جبکہ فلسطینیوں کو پچھلی صدی کے وہ فلسطینی پاسپورٹ اور ویزے بھی یاد ہیں جو لے کر یہودی یہاں زیارت کو آیا کرتے تھے اور آج وہ یہاں کی ملکیت کے دعوے دار ہیں تو کئی ہزار سال سے یہاں بسنے والے فلسطینی کیسے خاموش رہ سکتے ہیں۔

اب اگر ہم پاکستانیوں کی طرف آئیں تو باوجود فلسطین اور اہلِ غزہ سے ہمدردی و محبت کے یہاں ''لاعلمی'' بہت ہے۔ فلسطین اور مسئلۂ فلسطین کی تاریخ کیا ہے۔ یہ مقدس سرزمین کن کن خیانتوں سے داغ دار اور کن کن شہادتوں سے گل زار ہے۔ یہاں کون کون شخصیتیں کیسی کیسی تحریکیں سرگرم عمل رہی ہیں اور ان کے سیاسی و فکری رجحانات کیا تھے۔ عالمی ساہوکاروں نے یہاں کیا کیا ہتھکنڈے استعمال کیے۔ یہاں کس نے کیا کیا اور کب کیا ہوا۔ شاخِ زیتون سے غلیل، غلیل سے بندوق اور بندوق سے توپ کا سفر کیسے طے ہوا، اور اس راہ میں ان پر کیا کچھ گزرا، اس سے اکثر ہم وطن بے خبر ہیں۔ لہذا پہلے سے موجود محبتِ اہلِ قُدس کو بڑھانے اور لاعلمی کو گھٹانے کے لیے ماہنامہ مفاہیم کا ''القدس نمبر'' پیش کیا جا رہا ہے۔ یہ دعویٰ تو نہیں کیا جا سکتا کہ اس میں فلسطین کی بابت ہر سوال کا جواب ضرور موجود ہو گا لیکن ہمارا قاری اکثر سوالات کے جواب، ان شاء اللہ ضرور پائے گا۔

اس شمارے میں حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت حکیم الاسلام قاری محمد طیب قاسمی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم اور دیگر اکابر کے افادات کے ساتھ ساتھ ہم ایسے اصاغر کے مضامین بھی ہیں۔ امید ہے کہ حدیثِ مبارکہ ''برکت تمھارے بڑوں کے ساتھ ہے'' کے مصداق ہم اصاغر کے کام میں بھی برکت دی جائے گی۔

اس شمارے کی ترتیب و تزئین میں نائب مدیر جناب حماد احمد تُرک نے بہت زیادہ محنت کی۔ اسی طرح جناب مولانا عبدالغفور صدیقی صاحب اور مولانا محمد اقبال صاحب نے اس کام میں دن رات ایک کیے۔ بندہ اپنے ان رفیقانِ کرام کا تہہِ دل سے شکرگزار ہے۔ دعا ہے کہ اللہ ہماری اس کاوش کو مسلمانوں کے نفع کا ذریعہ بنائے اور اس چھوٹی سی خدمت کا ہمیں اجرِ عظیم عطا فرمائے۔ یہ شمارہ گزشتہ شماروں کی نسبت تین شماروں کے برابر ہے اور اسے کتابی انداز میں شائع کیا جارہا ہے۔ قارئین سے درخواست ہے کہ خود پڑھنے کے ساتھ ساتھ اسے دوست احباب تک ضرور پہنچائیں اور پڑھنے کے بعد اپنے تبصروں اور تجاویز سے مطّلع فرمائیں، بالخصوص کوئی غلطی سامنے آئے تو بلا تکلف ماہنامہ مفاہیم کی مجلسِ ادارت سے رابطہ فرمائیں تاکہ دوسری طباعت کو اغلاط سے محفوظ بنایا جاسکے۔

والسلام

جمیل الرحمٰن عباسی

مدیر ماہنامہ مفاہیم کراچی

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم

حماس کا اسرائیل پر حملہ اور چند غلط فہمیوں کا ازالہ

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم کے خطبۂ جمعہ سے انتخاب

آج کل ہم مسلمان جن حالات سے گزر رہے ہیں اُن میں کسی اور موضوع پر بات کرنا بے وقعت معلوم ہوتا ہے۔ آج ہر وہ مسلمان جس کو حالات کی خبر ہے وہ فلسطین کے مسلمانوں پر جو قیامت برپا ہے اس کی وجہ سے بے چین ہے۔ غزہ میں جس وحشیانہ انداز میں بمباری کی گئی ہے، ہزاروں مسلمانوں کی شہری آبادی کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ اسپتالوں پر حملے ہو رہے ہیں، جو مریض زیرِ علاج ہیں ان پر حملے ہو رہے ہیں، بچوں اور عورتوں کی ایک بڑی تعداد ہے جو اس وحشت ناک بربریت کا شکار ہے اور غزہ شہر کے ایک بہت بڑے حصے کو کھنڈر میں تبدیل کر دیا گیا۔ ان معصوم بچوں کو ان کے ہاتھوں تکلیف اُٹھانے درد سہنے کے حالات کی اطلاع سے ہر مسلمان بے چین ہے۔ اور عالمی طاقتیں جو اپنے آپ کو انسانی حقوق کی علم بردار کہتی ہیں وہ نہ صرف خاموشی سے یہ تماشا دیکھ رہی ہیں، بلکہ اس کی حوصلہ افزائی کر رہی ہیں اور کھل کر اسرائیل کے ساتھ کھڑی ہیں۔

اس موقعے پر دو تین باتیں عرض کرنا چاہتا ہوں: پہلی بات یہ ہے کہ ایک اسرائیلی پروپیگنڈا ہے جو ساری دنیا میں پھیلایا گیا ہے جس کی وجہ سے بہت سی حکومتیں اور بہت سے لوگ غلط فہمی میں مبتلا ہو کر غیر جانب دار بنے ہوئے ہیں۔ بعض اوقات یہ سوال خود مسلمانوں کے ذہن میں پیدا ہوتا ہے کہ حماس کو کیا پڑی تھی کہ وہ اسرائیل پر راکٹ داغ کر جنگ میں کود پڑا۔ جبکہ اسے معلوم تھا کہ اسرائیل کی طاقت اس سے سو گنا سے بھی زیادہ ہے اور انھیں یہ بھی معلوم تھا کہ اس کی پشت پر امریکہ اور برطانیہ جیسے طاقت ور ممالک کھڑے ہیں، تو وہ چند راکٹ داغ کر کیسے اس جنگ میں فتح حاصل کر سکتا ہے؟ لہٰذا بعض لوگ یہ کہہ رہے ہیں

کہ حماس نے یہ خودکُشی کا اقدام کیا۔ یہ کوئی عقل کی بات نہیں تھی کہ اتنی بڑی طاقت کو اس طرح للکار کر ایسی حالت میں کہ حماس کے پاس نہ کوئی فضائی طاقت ہے، نہ اس درجے کے ہتھیار ہیں، جیسے اسرائیل کے پاس ہیں اور اس کے ساتھ امریکہ اور برطانیہ بھی اس کی مدد کے لیے کھڑے ہیں، تو یہ ایک طرح سے خودکُشی کا اقدام ہے۔ لیکن اصل صورتِ حال یہ ہے کہ اسرائیل اپنی ذات میں کوئی قوت نہیں ہے، یہ ساری قوت دے کر اس کو عالمِ اسلام کے بیچوں بیچ کھڑا کیا گیا ہے۔ اور اس کا مقصد صرف فلسطین نہیں ہے، بلکہ اُن کے خیال میں پورے عالمِ اسلام کے لیے ایک ناقابلِ تسخیر قوت پیدا کر دینا ہے۔

میں نے پچھلے جمعے کو عرض کیا تھا کہ ۱۹۴۷ء میں پاکستان قائم ہوا اور ۱۹۴۸ء میں اسرائیل کی حکومت کا اعلان کیا گیا اور ہزاروں لوگوں کا خون بہا کر، ظلم وستم کی انتہا کر کے اس کا قیام عمل میں آیا۔ اسی وقت قائدِ اعظم محمد علی جناح نے یہ کہا تھا کہ یہ مغربی طاقتوں کا ناجائز بچہ ہے۔ ایک طرف پاکستان ایک اسلامی قوت کے طور پر اُبھر رہا تھا، اسی وقت عالمِ اسلام کے بیچ ایک ناسور پیدا کر دیا گیا، جس کا نام اسرائیل ہے۔ اور پھر طرح طرح کے حیلوں بہانوں سے مسلمان ملکوں کو اس بات پر آمادہ کیا گیا کہ وہ ایک یہودی ریاست کے طور پر اسے تسلیم کریں۔ کچھ ریاستیں دباؤ میں آکر اسے تسلیم کر چکیں، مصر اور اردن نے اسے بطورِ ریاست تسلیم کر لیا۔ اب صورتِ حال اس طرح بن رہی تھی کہ اسے تسلیم کروانے کے لیے مسلمانوں کے مرکز یعنی سعودی عرب کے ساتھ تعلقات استوار کرانے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ ایک مرتبہ سعودی عرب اگر اسرائیل کو تسلیم کر لے تو پھر دوسرے مسلمان ملکوں کے لیے مشکل ہو جاتا کہ وہ اس کو تسلیم نہ کریں۔ لہٰذا اس کے ذریعے یہ سازش کی جا رہی تھی کہ سارے مسلمان ممالک اسرائیل کو بطورِ ریاست تسلیم کر لیں۔ ایسا نہیں ہے کہ حماس نے اچانک حملہ کر دیا ہو، بلکہ اس کی پوری ایک تاریخ ہے، اسرائیل کے قیام سے لے کر فلسطینیوں پر ظلم وستم اور بربریت کے وہ اقدامات کیے گئے اور ان اقدامات کی ایک تاریخ ہے جس کو ہر باخبر مسلمان جانتا ہے۔ ہر کچھ عرصے کے بعد فلسطین کے کسی نہ کسی حصے میں فلسطینیوں کو ذبح کیا جاتا تھا۔ تو حماس نے یہ محسوس کیا ہوگا کہ اگر اسرائیل کو ایک مرتبہ سارے عالمِ اسلام نے تسلیم کر لیا تو پھر یہ ناسور پوری طاقت کے ساتھ وجود میں آئے گا اور صرف فلسطین نہیں بلکہ ان کا جو منصوبہ ہے گریٹر اسرائیل کا وہ وجود میں آجائے گا۔ اس لیے انھوں نے یہ

سوچا کہ اگر اس موقعے پر کوئی کاری ضرب لگائی گئی تو یہ تعلقات جو مختلف اسلامی ملکوں سے قائم ہو رہے ہیں کم از کم وہ رک جائیں گے۔ اور ایسا ہی ہوا ان کے اس اقدام کی وجہ سے الحمد للہ مسلمان ملکوں میں ایک شعور پیدا ہوا اور جو معاہدات ہونے جا رہے تھے وہ ختم ہو گئے۔ پہلی کامیابی انھوں نے یہاں حاصل کی، انھوں نے سوچا کہ مرنا تو ہے ہی تو عزت کے ساتھ کیوں نہ مریں، ایک مسلمان مجاہد کی موت کیوں نہ مریں۔ لہذا انھوں نے یہ اقدام کیا۔ اگرچہ یہ اقدام عقل پرستوں کی سمجھ میں نہ آئے، لیکن جس کے پیشِ نظر اللہ کے راستے میں شہید ہونا ہوتا ہے، شہادت جس کی منزلِ مقصود ہوتی ہے، اس کے لحاظ سے یہ بالکل درست اقدام تھا۔ اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اس نے اسرائیل کی شوکت اور دبدبے پر کاری ضرب لگا دی۔ اور اگر استقامت کے ساتھ یہ جنگ جاری رہے اور جو مسلمان ممالک ہیں وہ اپنے فرائض ادا کریں، تو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے بعید نہیں ہے کہ یہ فیصلہ کن معرکہ ہو اور اللہ تعالیٰ اس ناسور سے ہمیں نجات عطا فرمائے۔

دوسری بات جو میں عرض کرنا چاہتا ہوں وہ یہ کہ بعض ذہنوں میں یہ غلط فہمی رہتی ہے کہ اگر یہودی ایک ریاست قائم کرنا چاہتے ہیں اور اس زمین میں قائم کرنا چاہتے ہیں جہاں ان کی تاریخ ہے، یعنی فلسطین کی زمین میں، یہ انبیاے کرام علیہم السلام کی زمین ہے اور بیش تر انبیاے کرام علیہم السلام بنی اسرائیل سے آئے ہیں اور یہ بنی اسرائیل کی اولاد ہیں، اگر یہ وہاں پر اپنی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں تو اس میں کیا مسئلہ ہے اور اس کی مخالفت کیوں کی جاتی ہے؟ بعض اوقات یہ سوال ذہن میں پیدا ہوتا ہے اور یہ پروپیگنڈا اسرائیل کی طرف سے ساری دنیا میں پھیلایا گیا ہے کہ ہم اس زمین کے وارث ہیں۔ ہم اس بات کے زیادہ حق دار ہیں کہ یہاں پر حکومت قائم کریں۔ تو میں یہ بات واضح کر دوں کہ بنی اسرائیل کی حکومت ہزاروں سال کی تاریخ میں فلسطین میں صرف ننانوے سال قائم رہی ہے۔ اس سے پہلے فلسطین کے جو اصل باشندے ہیں وہ کنعانی ہیں۔ اور کنعانی وہ قوم ہے جو جزیرۂ عرب سے منتقل ہو کر فلسطین میں آباد ہوئی تھی۔ گویا شروع سے اس کی ابتدا عربوں سے ہوتی ہے جو وہاں سے فلسطین منتقل ہو کر آباد ہوئے تھے اور صدیوں تک یہیں مقیم رہے۔ اس کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تشریف آوری کے بعد حضرت سموئیل علیہ السلام کی سرکردگی میں فلسطین کو فتح کیا گیا۔ اور اس وقت سے لے کر ننانوے سال بنی اسرائیل نے حکومت کی۔ اگرچہ وہ حکومت ٹوٹتی پھوٹتی رہی اور اس کے اندر مختلف دراڑیں

پڑتی رہیں۔اس حکومت کے دوران انھوں نے انبیاے کرام علیہم السلام کو قتل کیا۔قرآنِ کریم میں اس کی صراحت ہے کہ اپنے دورِ حکومت میں بنی اسرائیل نے انبیاے کرام علیہم السلام کو قتل کیا۔ان کی تاریخ جو عہد نامۂ قدیم میں موجود ہے اس میں لکھا ہے کہ انھوں نے اپنی تاریخ میں ہزاروں انبیا علیہم السلام کا قتل کیا ہے۔فلسطین میں ننانوے سال میں ان کی جو آخری حکومت ختم ہوئی ہے اس کو اٹھارہ سو سال بیت چکے ہیں۔اس اٹھارہ سو سال کے دور میں ایک لمحے کے لیے بھی یہودیوں کی حکومت فلسطین میں موجود نہیں رہی۔اب اٹھارہ سو سال بعد ایک آدمی یہ کہتا ہے کہ چونکہ میرے آبا و اجداد ننانوے سال وہیں رہے تھے، لہٰذا میں حق دار ہوں کہ میں وہیں پر حکومت کروں اور اس وقت جو باشندے ہیں ان کو نکال باہر کروں۔یہ نظریہ اگر ایک بار تسلیم کر لیا جائے تو موجودہ دنیا کا کیا حال بنے گا۔پھر ریڈ انڈین کہیں گے کہ امریکہ پر تو ہزاروں سال ہماری حکومت رہی ہے اور اس کا بہت زیادہ عرصہ بھی نہیں گزرا تو اب ہمارا حق ہے کہ ہم امریکہ کے باشندوں کو باہر نکال کر ریڈ انڈین حکومت قائم کر دیں۔اور یہ پھر صرف ایک ملک پر موقوف نہیں، ساری دنیا کے ممالک کے متعلق اگر یہ اصول تسلیم کر لیا گیا تو موجودہ دنیا تو ختم ہو جائے گی۔اور وہ اٹھارہ سو سال پہلے کے لوگ آکر آباد ہوں اور آباد ہو کر اسی زمین کے باشندوں کو نکال دیں، آخر یہ موجودہ دنیا میں کوئی تسلیم کر سکتا ہے؟لیکن یہ خیال صرف اسرائیل کے حق میں تسلیم کر لیا گیا۔جبکہ یہودی دنیا کے مختلف ممالک انگلینڈ، فرانس، سوئزر لینڈ اور روس وغیرہ میں پھیلے ہوئے تھے۔یہ فیصلہ کیا گیا کہ انھیں جمع کر کے یہاں پر بسایا جائے گا اور یہاں بسانے کے لیے اگر یہاں کے باشندوں کا قتلِ عام کرنا پڑا تو قتلِ عام بھی کیا جائے گا۔

چنانچہ ۱۹۴۸ء میں اسرائیل کے نام سے اس ناجائز ریاست کی بنیاد رکھی گئی۔اس میں سب سے زیادہ ہاتھ برطانیہ کا ہے اور اس کے ساتھ امریکہ ہے، انھوں نے مل کر اس ناجائز بچے کی پرورش کرنی شروع کی۔جب پہلے وزیرِ اعظم بن گوریان نے ریاست اسرائیل کے قیام کا اعلان کیا تو اس کے محض دو گھنٹے کے بعد امریکہ نے اسرائیل کو تسلیم کر لیا۔

اسرائیل کا قیام دیر یاسین[۱] کے مذبح کے بعد عمل میں آیا تھا جس میں بے گناہ فلسطینیوں کا قتلِ عام کیا گیا تھا اور انھیں ان کے گھروں سے بے دخل کیا گیا تھا، اس کے بعد یہ قائم ہوا تھا۔[۲] لہذا یہ کہنا کہ فلسطین ہمارا حق ہے، یہ سیاسی طور پر غلط ہے، کیونکہ اٹھارہ سو سال سے ان کی حکومت وہاں پر نہیں تھی، بلکہ اس دوران کچھ عرصہ عیسائیوں نے حکومت کی، کچھ عرصہ مسلمانوں نے حکومت کی۔ مسلمانوں کی حکومت کے دوران مختلف جگہوں پر ان کو پر امن طریقے سے آباد کیا گیا۔ البتہ سلطنتِ عثمانیہ کے عہد میں سلطان عبد الحمید خان ثانی نے یہود کو فلسطین میں اپنی آبادیاں بنانے کی اجازت ہر گز نہیں دی اور صرف زائر کے طور پر انھیں آنے کی اجازت تھی۔ ہاں، خلافتِ عثمانیہ کے جس خطے میں یہودی آباد تھے انھیں اپنے مذہب پر عمل کرنے کی مکمل آزادی تھی، ایسا نہیں ہوتا تھا کہ ان کے اوپر کوئی ظلم و ستم کیا جا رہا ہو۔ لہذا اٹھارہ سو سال بعد یہ بکھرے ہوئے یہودی کہتے ہیں کہ اب ہمیں سیاسی اعتبار سے اس کا حق ہے، یہ کوئی معقول بات نہیں ہے۔

دوسری بات جو کہی جاتی ہے وہ دینی اعتبار سے ہے، کہ یہاں حضرت داؤد اور سلیمان علیہما السلام نے ہیکل قائم کیا تھا۔ ہم بھی اس کو تسلیم کرتے ہیں، خود قرآنِ کریم میں اس کا ذکر ہے، حضرت داؤد علیہ السلام نے ہیکل بنایا تھا اور حضرت سلیمان علیہ السلام نے مسجدِ اقصیٰ تعمیر کی تھی۔ لیکن یہ ایک بہت بڑا مغالطہ ہے کہ سب سے پہلے مسجدِ اقصیٰ حضرت داؤد علیہ السلام یا حضرت سلیمان علیہ السلام نے تعمیر کی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دو گھر بنائے تھے، ایک گھر مکہ مکرمہ میں بیت اللہ، اس کی تعمیر سب سے پہلے فرشتوں نے کی تھی پھر حضرت آدم علیہ السلام نے کی تھی۔ پھر چونکہ اس کے نشانات مٹ گئے تھے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے آکر اس کی نئی تعمیر فرمائی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام مسجدِ حرام کے بانی نہیں تھے، وہ مجدد تھے، بلکہ جو آثار مٹ گئے تھے انھوں نے اللہ تعالیٰ کے حکم

---

[۱] دیر یاسین فلسطینی مسلمانوں کی ایک بستی تھی جو القدس کے قریب واقع تھی۔ اب یہاں ایک دماغی مرکزِ صحت قائم ہے۔

[۲] فلسطین میں انگریزی حکومت (۱۹۱۷ تا ۱۹۴۸ء) کی سرپرستی میں بہت سی یہودی دہشت گرد تنظیمیں مثلاً آرگن اور ہاگاناہ وغیرہ وجود میں لائی گئی تھیں، جو اکثر مسلمانوں پر حملے کرتی رہتی تھیں۔ ان حملوں کا عروج ۱۹۴۷ اور ۱۹۴۸ء میں ہوا جب انھوں نے سینکڑوں فلسطینی دیہاتوں پر قبضہ کیا اور وہاں کے مسلمانوں کو یا تو شہید کر دیا یا جلاوطن کر دیا، دیر یاسین انھی میں سے ایک علاقہ تھا۔ دیر یاسین کا قتلِ عام اپریل ۱۹۴۸ء میں کیا گیا جبکہ بن گوریان نے اسرائیلی ریاست کے قیام کا اعلان ۱۴، مئی ۱۹۴۷ء کو کیا۔

سے ان کی تجدید کی اور اس کو از سرِ نو تعمیر کیا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام بھی مسجدِ اقصیٰ کے بانی نہیں تھے، بلکہ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح کعبے کی تعمیر سب سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام نے کی تھی اسی طرح بیت المقدس کی تعمیر بھی حضرت آدم علیہ السلام نے کی تھی۔ اس کے آثار مٹ گئے تھے اس لیے حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام نے اس کی تجدید فرمائی، جس طرح حضرت آدم علیہ السلام نے کعبے کی تجدید فرمائی تھی۔ لہٰذا ایسا نہیں ہے کہ حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام نے یہ تعمیر کی ہو۔ حالانکہ وہ ہمارے بھی پیغمبر ہیں، اس لیے اس بنا پر یہودیوں کو اس پر دعویٰ کرنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔ جبکہ ان کی کتاب جس کو وہ تورات یا عہد نامۂ قدیم کہتے ہیں اس کے اندر یہ مذکور ہے کہ سلیمان علیہ السلام آخر میں نعوذ باللہ مرتد اور کافر ہو گئے تھے اور بت پرستی اختیار کر چکے تھے۔ ایک طرف جس کو وہ تورات کہتے ہیں وہ یہ کہہ رہی ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نعوذ باللہ کافر اور مرتد ہو گئے تھے، بت پرستی شروع کر دی تھی اور دوسری طرف ان پر دعویٰ جتلا رہے ہیں۔ قرآنِ مجید نے اس کی تردید کی: ﴿وَمَا كَفَرَ سُلَيْمَانُ وَلٰكِنَّ الشَّيَاطِينَ كَفَرُوا﴾ (البقرۃ:۱۰۲) "سلیمان (علیہ السلام) کافر نہیں ہوئے تھے، لیکن شیاطین کافر ہوئے تھے"۔ ایک طرف تو یہودی ان کو کافر، مرتد اور بت پرست کہتے ہیں اور ایک طرف کہتے ہیں کہ اس کی یادگار کے واسطے ہم اس کے حق دار ہیں۔ لہٰذا اس سے یہ اچھی طرح واضح ہوتا ہے کہ نہ سیاسی اعتبار سے ان کا کوئی حق بنتا ہے نہ دینی اعتبار سے ان کا کوئی حق بنتا ہے۔ لیکن امریکہ اور برطانیہ نے عالمِ اسلام کو منتشر کرنے کے لیے عالمِ اسلام کے دل میں ایک ناسور اسرائیل قائم کیا۔ اور اس وقت سے مسلسل بغیر کسی توقف کے وہ وہاں کے باشندے فلسطینیوں پر ظلم و ستم کے پہاڑ ڈھا رہے ہیں۔ اس لیے حماس نے عرصۂ دراز سے کئی سال تیاری کے بعد قابض صہیونیوں پر حملہ کیا۔ اس حملے کے نتیجے میں واضح تھا کہ اسرائیل کی طرف سے بھی اس کا مقابلہ ہوگا اور اس میں بہت سی شہادتیں ہوں گی، چنانچہ وہ ہو رہی ہیں، یہ ایک بہت بڑا المیہ ہے۔ لیکن اس سے بڑا المیہ یہ ہے کہ پورا عالمِ اسلام، جس کے استحکام کی خاطر حماس کے مجاہدین میدان میں اُترے ہوئے ہیں، وہ اس بارے میں خاموش تماشائی ہے۔ بیانات بے شک دے دیے گئے ہیں، تقریریں ہم بھی کر رہے ہیں،

لیکن ایسی کوئی عملی امداد کہ جس سے ان کو فائدہ پہنچے وہ نہیں پہنچ رہی۔ [۳]

شریعت کا حکم یہ ہے کہ اگر مسلمانوں کے کسی ایک خطے پر غیر مسلم حملہ آور ہوں، تو الاقرب فالاقرب کے اصول کے تحت سارے مسلمانوں پر جہاد فرض ہو جاتا ہے۔ یعنی سب سے پہلے اس خطے کے ساتھ رہنے والے مسلمانوں پر، اگر وہ کافی نہ ہوں تو ان کے برابر رہنے والوں پر، پھر اگر وہ بھی کافی نہ ہوں تو ان کے برابر رہنے والے مسلمانوں پر جہاد فرض ہو جاتا ہے۔ اس لحاظ سے جو قریب کے ممالک ہیں ان پر اہلِ فلسطین کے ساتھ مل کر جہاد فرض ہے۔ لیکن ساتھ ساتھ یہ بھی ہے کہ جہاد بقدرِ استطاعت فرض ہوتا ہے، جس میں جتنی استطاعت ہو وہ اسی استطاعت کے بقدر جہاد میں شریک ہوگا۔ لہٰذا ان کی جانی، مالی اور دفاعی امداد تمام مسلمان ملکوں پر فرض ہے، لیکن اس کے لیے ایسی حکمتِ عملی ضروری ہے کہ جس سے ان کو فائدہ پہنچے نقصان نہ پہنچے۔ اس حکمتِ عملی کے لیے عالمِ اسلام کو چاہیے کہ وہ سر جوڑ کر ایسی حکمتِ عملی تیار کرے۔ خود الحمد اللہ پاکستان ایسی فوجی طاقت رکھتا ہے جو بہت کم ملکوں کو میسر ہے، اس کا فرض ہے کہ اہلِ فلسطین کی امداد کرے۔ لیکن امداد ایسی حکمت کے ساتھ کرے جس سے ان کو فائدہ پہنچے نقصان نہ پہنچے۔ اور اس کا طریقہ یہ نہیں ہے کہ بر سرِ عام جا کر دشمنوں پر میزائل داغ دیے جائیں بلکہ اس کے لیے حکمتِ عملی کی ضرورت ہے۔ میں اس وقت صرف اتنا ہی اشارہ کر سکتا ہوں کہ حکمتِ عملی کی ضرورت ہے۔ اور اس حکمتِ عملی کے ساتھ ان کی امداد بشمولِ پاکستان ہر مسلمان ملک پر فرض ہے، اللہ تعالیٰ ان کو توفیق دیں۔ میں اپنی فوج کے بارے میں اتنی بات جانتا ہوں کہ بنیادی طور پر وہ مسلمان ہے اور اس کے اندر اسلامی جذبات بھی ہیں۔ لہٰذا یہ بات مجھے مستبعد لگتی ہے کہ وہ اس معاملے میں بالکل خاموش بیٹھے ہوئے ہوں اور انھوں نے اس سلسلے میں کوئی حکمتِ عملی تیار نہ کی ہو۔ اور مجھے امید ہے کہ وہ حکمتِ عملی ان شاء اللہ تعالیٰ تیار کی ہوگی، خدا کرے ایسا ہی ہو، ورنہ اگر ایک مرتبہ اسرائیل اس وقت کامیاب ہو گیا تو صرف فلسطین تک محدود نہیں رہے گا، بلکہ وہ پورے علاقے کو اپنی لپیٹ میں لے لے گا۔ اور یہ ایسا سانپ ہے کہ اگر اس وقت اس کا سر نہ کچلا گیا تو پھر

---

[۳] یہ خطاب اکتوبر کا ہے۔ دسمبر کے اختتام تک دار العلوم کی جانب سے ایک ارب تیرہ کروڑ کی امداد اہلِ فلسطین کے لیے روانہ کی جا چکی ہے الحمد للہ۔

وہ دوسرے ملکوں کی طرف بھی آگے بڑھے گا۔ لہذا سارے مسلمان ملکوں کو ایسی حکمتِ عملی تیار کرنے کی ضرورت ہے کہ جس کے ذریعے اس فتنے کا خاتمہ ہو سکے۔ اور پھر ہر عام مسلمان جس میں خود جا کر لڑنے کی طاقت نہیں ہے اور چلا بھی جائے تو فائدہ کوئی نہیں، تو جو امداد وہ پہنچا سکتا ہے پہنچائے۔ ایک بہت چھوٹی سی کوشش کچھ مالی امداد کی صورت میں ان لوگوں کو جو غزہ میں مصیبتوں کا شکار ہیں، ہم نے بھی شروع کی ہے، الحمدللہ وہ پہنچ بھی رہی ہے۔ اس میں بھی ایک مسلمان حصہ لینا چاہے تو لے سکتا ہے اور ساتھ میں دعاؤں کا اہتمام بھی کرنا چاہیے۔ اگر ہم یہ سوچیں کہ ہمارے اوپر بمباری ہو رہی ہو اور ہمارے بچے اور عورتیں شہید ہو رہے ہوں، تو کیا ہم چین سے بیٹھ جائیں گے؟ اس لیے جو امداد بس میں ہے وہ کر لی جائے اور ساتھ میں اللہ تعالیٰ سے رجوع کیا جائے۔ بندے کا کام یہی ہے کہ وہ حتی الوسع اپنی کوشش کرے اور پھر اللہ تعالیٰ سے رجوع کرے کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے: ﴿كَم مِنْ فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللهِ﴾ (کتنی ہی چھوٹی جماعتیں ایسی ہیں جو بڑی جماعتوں پر غالب آگئیں اللہ کے حکم سے) کا مظاہرہ اس موقعے پر دکھادیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین

* * * * *

مترجم : مولانا محمد اعجاز*

اراضیِ فلسطین سے متعلق حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کا فتویٰ

بعض فلسطینی مسلمانوں نے اپنی زمینیں یہودیوں کو فروخت کیں اور بعض علما نے اس کے جواز کا قول اختیار کیا تو عرب علما نے اس فعل کی حرمت کا فتویٰ دیا۔ فلسطینی حضرات نے اس مسئلے میں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو استفتا ارسال کیا، جس کے جواب میں حضرت کی طرف سے بھی اس فتوے کی تائید میں ایک فتویٰ جاری کیا گیا جس میں یہود کو فلسطین کی زمین بیچنے کی حرمت دلائل کے ساتھ واضح کی گئی۔

السؤال: ما حكم الشريعة الإسلامية المطهرة في بعض المسلمين الذين يبيعون أراضي بلاد فلسطين المقدسة أو يتوسطون ببيعها لليهودي الطامعين الذين يقصدون من شراء هذه الأراضي والعقارات جلاء المسلمين عن هذه البلاد المقدسة والاستيلاء على المسجد الأقصىٰ الذي بارك حوله وإنشاء كنيسهم الهيكل مكانه وتشكيل دولة يهودية في فلسطين بمساعدة بعض الدولة المعاوية للإسلام، والتي تبذل كل جهد في محاربته. وماهو الرداع لهم عن هذا العمل المنكر وهل إذا أفتى بعض العلماء بكفر من باع أرضه لليهود أو توسط ببيع أرض غيره لهم مساعدة أهل الكفر على المسلمين والموالات لليهود الذين يعملون ليلاً ونهارًا لِطرد المسلمين وأبعادهم عن بلاد فلسطين والمسجد الأقصىٰ الذي أسرى الله برسوله محمد ﷺ وحرمانهم من الصلوة عليهم ومن الدفن في مقابر المسلمين لخروجهم عن الإسلام. وفيه عبرة لغيرهم ممن تسول له نفسه اقتراف مثل خطيئتهم. فما قولكم في فتواهم وإذاكان هناك زاجر خلافها ذكر أفيدونا ولكم من الله الأجر والثواب.

---

* دارالافتاء فقہ اکیڈمی، فتاویٰ یسئلونک کے تحت اس فتوے کی تحقیق اور ترجمے کا کام سرانجام دیا گیا۔

الجواب وهو الموفق للصدوق والصواب

أما عن الجزء الأول فلنمهد أولاً: الدلائل، ثم نشيد بها السائل، ففي الدرالمختار: فصل الجزية في أحكام أهل الذمة، مانصه (ولايعمل بسلاح) أي: لايستعمله ولايحمله لأنه عزٌّ وكل ماكان كذلك يمنعون عنه، قلت: ومن هذا الأصل تعرف أحكام كثيرة، در منتقى- وهذا أصل كليّ وههنا جزئيات نسرد ها ففى الدرالمختار، (الذمي إذا اشترى دارا) أي أراد شراءها (في المصر لا ينبغي أن تباع منه فلو اشترى يجبر على بيعها من المسلم). وقيل لا يجبر إلا إذا كَثر.(درر) في رد المحتار: (قوله الذمي إذا اشترى دارا إلخ). قال السرخسي في شرح السير: فإن مَصّر الإمامُ في أراضيهم للمسلمين كما مصّر عمر رضي الله عنه البصرة والكوفة. فاشترى بها أهل الذمة دورا وسكنوا مع المسلمين لم يمنعوا من ذلك فإنا قبلنا منهم عقد الذمة، ليقفوا على محاسن الدين، فعسى أن يؤمنوا واختلاطهم بالمسلمين والسكن معهم يحقق هذا المعنى. وكان شيخنا الإمام شمس الأئمة الحلواني يقول: هذا إذا قلوا وكان بحيث لا تتعطل جماعات المسلمين ولا تتقلل الجماعة بسكناهم بهذه الصفة. فأما إذا كثروا على وجه يؤدي إلى تعطيل بعض الجماعات أو تقليلها منعوا من ذلك وأمروا أن يسكنوا ناحية ليس فيها للمسلمين جماعة. وهذا محفوظ عن أبي يوسف في الأمالي. ثم في الدرالمختار بعد أسطر: (وإذا تكارى أهل الذمة دورا فيما بين المسلمين ليسكنوا فيها) في المصر (جاز) لعود نفعه إلينا وليروا تعاملنا فيسلموا (بشرط عدم تقليل الجماعات لسكناهم). شرطه الإمام الحلواني: (فإن لزم ذلك من سكناهم أمروا بالاعتزال عنهم والسكنى بناحية ليس فيها مسلمون). وهو محفوظ عن أبي يوسف بحر عن الذخيرة. وفي رد المحتار تحت القول الآتي من الدر المختار لكن رده (الخ). مانصه فتحصل من مجموع كلام الحلواني والتمرتاشي أنه إذا لزم من سكناهم في المصر تقليل الجماعة أمروا بالسكنى في ناحية خارج المصر ليس فيها جماعة للمسلمين، وإن لم يلزم ذلك

يسكنون في المصر بين المسلمين مقهورين لافي محلة خاصة لإنه يلزم منه أن يكون لهم في مصر المسلمين منعة كمنعة المسلمين بسبب اجتماعهم في محلتهم فافهم. ثم في رد المحتار بعد أسطر بعنوان [تنبيه] قال في الدر المنتقى، وكذا يمنعون عن التعلي في بنائهم على المسلمين ومن المساواة عند بعض العلماء، نعم يبقى القديم. ثم قال بعد بحث طويل والحديث الشريف لا يفيد أن لهم مالنا من العز والشرف بل في المعاملات من العقود ونحوها للأدلة الدالة على إلزامهم الصغار وعدم التمرد على المسلمين وصرح الشافعية بأن منعهم عن التعلي واجب، وأن ذلك لحق الله تعالى وتعظيم دينه فلا يباح برضا الجار المسلم.وقواعدنا لا تأباه فقد مر أنه يحرم تعظيمه، ولا يخفى أن الرضا باستعلائه تعظيم له هذا ما ظهر لي في هذا المحل، والله تعالى أعلم. قلت: وفي الباب روايات لاتحد ولاتعد، وفيما ذكرنا كفاية إن شاء الله تعالىٰ. وإذا كان هذا حكم الكراء والشراء للدار، والتعلي في البناء والجدار فكيف حكم بيع المسلمين أراضيهم من الكفار، وهو أقوى أسباب العزة والشوكة، والقوة والصولة. وإذا كان هذا حكم الذميين وهم مقهورين تحت حكم الإسلام، فكيف حكم غير الذميين الذي ليسوا في شيء من الاستسلام. وهو كما قال الله تعالىٰ:﴿لَا يَأْلُوْنَكُمْ خَبَالًا﴾ وكما قال تعالىٰ: ﴿لَا يَرْقُبُوْنَ فِي مُؤْمِنٍ إِلًّا وَلَا ذِمَّةً﴾ وكما قال الله تعالىٰ:﴿إِنْ يَّثْقَفُوْكُمْ يَكُوْنُوْا لَكُمْ أَعْدَآءً وَّ يَبْسُطُوْا إِلَيْكُمْ أَيْدِيَهُمْ وَ أَلْسِنَتَهُمْ بِالسُّوْٓءِ، وَ وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ﴾ ولله در القائل:

أَحبابَنا نُوَب الزمانِ كثيرة وَأَمَرُّ منها رِفعةُ السُّفهاءِ
فمتى يُفيق الدهرُ من سَكَراته وأَرى اليهودَ بِذِلَّةِ الْفُقهاءِ

وأما عن الجزء الثاني: فإن كان أهل هذه الفتاوى من أهل البصيرة والكياسة، فأقرب محاملها هي السياسية، والعلماء لهم في أمثالها حق الرياسة. وهذا اٰخر الجواب في هذا الباب. والله أعلم بالصواب.كتبه أشرف علي التهانوي من الهند، الحنفي الفاروقي عفي عنه.

سوال: شریعتِ مطہرہ میں ان مسلمانوں کے بارے میں کیا حکم ہے جو فلسطین کی پاک سرزمین لالچی یہودیوں کو بیچ رہے ہیں یا بیچنے میں ثالثی کا کردار ادا کر رہے ہیں جبکہ یہودیوں کا مقصد مسلمانوں کو اس مقدس سر زمین سے نکال کر مبارک مسجدِ اقصیٰ پر قبضہ کرنا اور اس کی جگہ اپنی عبادت گاہ (ہیکل) بنانا ہے۔ اور بعض اسلام دشمن ممالک کی مدد سے کہ جو ہر طرح سے فلسطین کے خلاف برسرِ پیکار ہیں یہودی حکومت قائم کرنا ہے۔ آپ رہنمائی فرمائیں کہ انھیں اس فعلِ قبیح سے کیسے روکا جائے؟ بعض علمائے کرام نے ان مسلمانوں کے بارے میں کفر کا فتویٰ دیا ہے جو اپنی زمین یہود کو بیچتے ہیں یا دوسروں کی زمین بکوانے میں واسطہ بنتے ہیں۔ اس طرح وہ مسلمانوں کے خلاف اہلِ کفر کی مدد و اعانت بلکہ ان یہود کی دوستی کے مرتکب ہوتے ہیں جو دن رات مسلمانوں کو بلادِ فلسطین اور خصوصاً اس مسجدِ اقصیٰ سے نکالنے کے لیے کوشاں ہیں کہ جہاں سے اللہ تعالیٰ اپنے رسول ﷺ کو معراج پر لے گیا تھا۔ نیز ان علما نے ان (موالاتِ کفار کے مرتکب مسلمانوں) کے اسلام سے خروج کے سبب، ان کی نمازِ جنازہ پڑھنے اور انھیں مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کرنے کی ممانعت بھی بیان کی ہے، تاکہ نفسانی وسوسے کے تحت اس گناہ کی طرف رغبت محسوس کرنے والوں کے لیے عبرت کا سامان ہو سکے۔ علمائے کرام کے اس فتوے کے بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں اور اگر اس فتوے کے خلاف کوئی تنبیہ ہو تو ہمارے استفادے کے لیے اس کا بھی ذکر فرمائیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

جواب: ہم پہلے تمہیدی طور پر کچھ دلائل پیش کریں گے اور اس کے بعد سائل کے سوالوں کا جواب دیں گے۔ الدر المختار میں جزیہ ادا کرنے والے ذمیوں کے احکام بیان ہوئے ہیں، اس میں ایک یہ حکم بھی بیان کیا گیا ہے کہ ذمیوں کو اسلحہ استعمال کرنے بلکہ ساتھ رکھنے کی اجازت بھی نہیں، کیونکہ اسلحہ تو عزت و وقار کی علامت ہے۔ اس اصول کی بنیاد پر بہت سے احکام معلوم ہوتے ہیں اور یہ ایک جامع اصول ہے اور اس کی جزئیات ہم الدر المختار سے ذکر کرتے ہیں:

(۱) اگر کوئی ذمی مکان خریدے یعنی وہ شہر میں مکان خریدنے کا ارادہ کرے تو اس کو مکان فروخت نہیں کیا جائے گا، اگر ذمی نے خرید لیا تو اس کو وہ مکان کسی مسلمان کو بیچنے پر مجبور کیا جائے گا۔ اور ایک رائے یہ بھی ہے کہ اگر ان کی زیادہ تعداد نہ ہو تو ان کو مجبور نہیں کیا جائے گا۔

(۲) یہ جملہ: ''اگر کوئی ذمی مکان خریدے''، اس کے بارے میں امام سرخسی رحمۃ اللہ علیہ نے شرح السِیر میں فرمایا: کہ اگر حاکمِ وقت نے مسلمانوں کے لیے ان کی سرزمین میں شہر آباد کیا جیسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے شہر بصرہ اور کوفہ آباد کیا۔ چنانچہ ذمی لوگوں نے وہاں مکانات خریدے اور مسلمانوں کے ساتھ رہنے لگے۔ انھیں ایسا کرنے سے منع نہیں کیا گیا، کیونکہ مسلمانوں نے ان سے ذمی کے طور پر رہنے کا معاہدہ کیا تھا، اس حکمت کے پیشِ نظر کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ گھل مل کر رہتے ہوئے دین کی خوبیوں کو پہچان سکیں اور ایمان لے آئیں۔ شیخ الحلوانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: کہ ذمیوں کو مسلمانوں کے ساتھ رہنے کی یہ رخصت اس وقت ہے جب ذمیوں کی تعداد اتنی کم ہو کہ مسلمانوں کو ان کے رہنے سے تنگی نہ ہو اور نہ ہی مسلمانوں کی تعداد میں مقابلتاً کمی آئے۔ البتہ اگر ان کی تعداد اس قدر بڑھ جائے کہ مسلم برادری میں خلجان اور قلت کا باعث بنے، تو ان کو یہاں رہنے سے منع کیا جائے گا اور حکم دیا جائے گا کہ وہ ایسی جگہ رہیں جہاں مسلم برادری آباد نہ ہو۔

(۳) اگر ذمی شہر میں مسلمانوں کے ساتھ رہنے کے لیے مکان کرائے پر لیں تو یہ جائز ہے، کیونکہ اس سے ہمیں ہی فائدہ ہوگا، وہ یہ کہ ذمی ہمارے معاملات دیکھ کر مسلمان ہو جائیں گے۔ امام الحلوانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: (مسلمانوں کے ساتھ گھل مل کر رہنے کی) یہ اجازت اس شرط کے ساتھ ہے کہ وہاں کے رہنے والوں کی اپنی آبادی کم نہ پڑ جائے۔ اگر وہاں کے مکینوں کی آبادی میں کمی ہوئی تو ان ذمیوں کو حکم دیا جائے گا کہ وہ مسلمانوں سے علیحدہ ہو جائیں اور ایسے علاقے میں رہیں جہاں مسلمان نہ ہوں۔ یہی رائے امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے (جو صاحب بحر الرائق نے الذخیرۃ البرہانیہ کے حوالے سے نقل کی ہے)۔

(۴) امام الحلوانی اور تُمُرتاشی کے کلام سے اجمالاً یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر مسلمانوں کے ساتھ انھی کے شہر میں رہنے سے مسلمانوں کو قلت کا اندیشہ ہو تو ذمیوں کو حکم دیا جائے گا کہ وہ شہر سے باہر کسی ایسے علاقے میں رہیں، جہاں کوئی مسلم کمیونٹی نہ ہو۔ اور اگر یہ ضرر نہ ہو تو وہ شہر میں مسلمانوں کے ساتھ گھل مل کر ان کے مطیع بن کر رہ سکتے ہیں۔ البتہ وہ الگ سے کسی خاص محلہ میں نہیں رہ سکتے کیونکہ اس طرح ان کو مسلمانوں کے شہر

میں وہ عزت و شرف حاصل ہو گا، جو مسلمانوں کو حاصل ہے۔

(۵) الدر المختار میں اسی مقام پر چند سطروں کے بعد "تنبیہ" کے عنوان کے تحت لکھا ہے کہ صاحب الدر المنتقیٰ کہتے ہیں کہ بعض علماے کرام کی رائے یہ ہے کہ ذمیوں کو مسلمانوں کی عمارتوں کے مقابلے میں اپنی عمارات کے بلند کرنے بلکہ برابری سے بھی منع کیا جائے گا۔ البتہ ان کی پرانی عمارات کو باقی رکھا جائے گا۔ پھر انھوں نے ایک طویل بحث کے بعد فرمایا: حدیثِ مبارکہ «لَهُمْ مَا لَنَا وَعَلَيْهِمْ مَا عَلَيْنَا» اس پر بات دلالت نہیں کرتی کہ ان کو وہی عزت و قار دیا جائے جو مسلمانوں کو حاصل ہے۔ بلکہ اس اصولی حدیث کے ذریعے لین دین جیسے معاملات میں ان کو وہ تحفظات دیے جاسکتے ہیں جو عام مسلمانوں کو حاصل ہیں، اس کی دلیل یہ ہے کہ وہ (قرانِ حکیم کی رو سے) چھوٹے ہو کر رہنے کے پابند بنائے گئے ہیں اور انھیں اس کا پابند بنایا گیا کہ وہ مسلمانوں کے خلاف تمرد و سرکشی نہ کریں۔ اس مسئلے میں فقہاے شوافع نے تصریح کی ہے کہ ذمیوں کو مسلمانوں کے مقابلے میں عمارات بلند کرنے سے روکنا واجب ہے (پس عمارتیں بلند کرنا ممنوع ہوا) اور اگر کسی ذمی کا پڑوسی مسلمان اگر اسے بلندی عمارت کی اجازت دے بھی دے تو تب بھی یہ جائز نہیں ہوتا، کیونکہ یہ (کسی فرد کا نہیں بلکہ) خدا تعالیٰ اور اس کے دین کی تعظیم کا حق ہے (جو کسی مسلمان کے اجازت دینے سے بھی ساقط نہیں ہو سکتا)۔ پس ہمارے قواعد و ضوابط (تعظیمِ کفر) کی اجازت نہیں دیتے اور یہ بیان ہو چکا کہ کافروں کی تعظیم کرنا حرام ہے اور یہ پوشیدہ نہیں کہ عمارتوں میں بلندی وغیرہ سے ان کی تعظیم ہوتی ہے جو جائز نہیں ہے۔ اس مسئلے کے بارے میں مجھے یہی شرح صدر ہوا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔ اور میں کہتا ہوں کہ اس باب میں اتنی کثرت سے روایات موجود ہیں کہ ان کا شمار نہیں کیا جاسکتا، بس جو ذکر کیا گیا ہے وہ ہی کافی و شافی ہے، ان شاء اللہ۔

حاصل یہ ہے کہ ماقبل میں مذکور پابندیاں تو صرف مکانات کے کرائے یا خرید و فروخت، مکانات کی تعمیر و بنیاد اور دیوار و چھت کی بلندی وغیرہ کے معاملات پر لاگو کی گئی ہیں۔ تو سوچیں کہ (کفار کا مسلمانوں کی زمین خریدنا اور) مسلمانوں کا کفار کو اپنی زمینیں بیچنا کیسے جائز ہو سکتا ہے جبکہ زمین خریدنا، عزت و شوکت و طاقت کے اسباب

میں سے ایک بڑا سبب ہے، (لہذا یہ سخت ناجائز ہے)۔ (دوسرے یہ کہ مذکورہ بالا ممانعت کا) حکم تو ذمیوں کے لیے ہے جو مسلمان حکومت کے تابع ہوتے ہیں جو کافر مسلمان حکومت کے تابع نہیں ہیں ان کے لیے ممانعت کا حکم کتنا سخت ہوگا، اس کا اندازہ خود کرلیں! خصوصاً جبکہ انھیں اِستِسلام (فرمان برداری اور امن) سے دور کا تعلق بھی نہیں۔ اور ان کا حال آیاتِ ذیل کے موافق ہے (کہ وہ مسلمانوں کے لیے خطرہ ہی خطرہ ہیں): ﴿لَا يَأْلُوْنَكُمْ خَبَالًا﴾ (آلِ عمران:۱۱۸) "یہ تمھاری خرابی میں کوئی کسر نہیں رہنے دیتے"۔ ﴿لَا يَرْقُبُوْنَ فِي مُؤْمِنٍ إِلًّا وَلَا ذِمَّةً وَأُولٰئِكَ هُمُ الْمُعْتَدُوْنَ﴾ (التوبہ:۱۰) "نہیں لحاظ کرتے کسی مسلمان کے حق میں قرابت کا اور نہ عہد کا اور وہ زیادتی کرنے والے ہیں"۔ ﴿إِنْ يَّثْقَفُوْكُمْ يَكُوْنُوْا لَكُمْ أَعْدَآءً وَّ يَبْسُطُوْا إِلَيْكُمْ أَيْدِيَهُمْ وَ أَلْسِنَتَهُمْ بِالسُّوْءِ، وَ وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ﴾ (سورۃ الممتحنہ:۲) "اگر وہ تم پر دست رس پائیں تو اظہارِ عداوت کرنے لگیں اور تم پر برائی کے ساتھ دست درازی اور زبان درازی کرنے لگیں اور وہ تو یہ چاہتے ہی ہیں کہ تم کافر ہی ہوجاؤ"۔ کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے: "دوستو! زمانے کے حوادث بہت سے ہیں۔ ان میں سب سے بڑا حادثہ بے وقوف جاہلوں کی سرداری ہے۔ اور زمانہ اپنی مدہوشی سے کب ہوش میں آئے گا کہ میں تو یہود کے عروج اور ان کی سرپرستی کو فقہاے اسلام (اور ان کے احکام) کی ذلت دیکھتا ہوں"۔ جہاں تک سوال کے دوسرے حصے (یعنی یہود کو زمینیں بیچنے یا سہولت کاری کرنے والوں کی نمازِ جنازہ نہ پڑھنے اور انھیں مسلمانوں کے قبرستان میں دفن نہ کرنے کے فتوے) کا تعلق ہے تو اگر یہ فتویٰ دینے والے حضرات، صاحبِ بصیرت و حکمت مفتیان ہیں (تو ان کا یہ فتوی موقع و محل کے مطابق جائز اور قابلِ عمل ہے)۔ البتہ یہ جان لینا چاہیے کہ یہ ایک انتظامی نوعیت کا مسئلہ ہے اور ان معاملات میں علما و فقہا کو حقِ قیادت حاصل ہے۔ (پس اس فتوے پر عمل کرنا چاہیے) یہاں پر اس مسئلے کا جواب مکمل ہوا۔ واللہ أعلم بالصواب

* * * *

ماخذ: بوادر النوادر، نادرہ نمبر ۴۷

حکیم الاسلام قاری محمد طیب قاسمی رحمۃ اللہ علیہ

یہودی اقتدار کا شرعی تجزیہ اور اسرائیل

﴿ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ أَيْنَ مَا ثُقِفُوا إِلَّا بِحَبْلٍ مِنَ اللهِ وَحَبْلٍ مِنَ النَّاسِ﴾

''ان (یہود) پر ذلت تھوپ دی گئی ہے وہ جہاں بھی ہوں سوائے اللہ کی رسی اور لوگوں کی رسی سے''۔

حبل کے معنیٰ لغت میں رسی کے ہیں اور یہاں حسبِ تفسیرِ مفسرین عہد یا سبب مراد ہے کہ خواہ وہ سبب خالق کی طرف سے ہو یا مخلوق کی طرف سے اس ذلت کو رفع کردے گا۔ اللہ کی طرف کا سبب یہ ہے کہ یہود توبہ کرکے کلمہ و اسلام قبول کرلیں تو ذلت کلیتہً ختم ہوجائے گی، ذلتِ باطنی رہے گی نہ ذلتِ ظاہری۔ اور وہ مسلمان ہوکر تمام ان عزتوں کے مستحق ہوجائیں گے جو اسلام و ایمان کے ساتھ وابستہ ہیں، ان کے حقوق وہی ہوں گے جو ایک مسلمان کے ہوسکتے ہیں۔ لیکن اگر وہ اسلام قبول نہ کریں، بلکہ یہودی ہی رہیں تو حبل من الناس یعنی بندوں کی طرف رفعِ ذلت کا سبب اور علاقہ یہ ہے کہ وہ اسلام کی شوکت قبول کرکے ذمی بن جائیں۔ اس صورت میں ذلتِ باطنی تو باقی رہی ہے، مگر ذلتِ ظاہری ایک حد تک مرتفع ہوجائے گی۔ یعنی ادائے جزیہ کی ذلت باقی رہ جائے گی، مگر وہ عمومی بے کسی اور کس مپرسی کہ وہ ہر جگہ ذلیل و خوار ہی نظر آئیں ختم ہوجائے گی۔ اس صورت میں حسبِ اصولِ شریعتِ اسلام ان کے معاشرتی حقوق بالخصوص مالیاتی اور معاملاتی بہت حد تک وہی ہوں گے جو مسلمانوں کے ہیں۔ لهم مالنا وعليهم ما علينا. ''جو ہمارے لیے ہوگا وہی ان کے لیے ہوگا اور جو ہم پر عائد ہوگا وہی ان پر ہوگا''۔ یعنی ان کے جان و مال کی حفاظت خود مسلمانوں کے ذمے ہوگی۔ ایسے ہی اگر وہ دوسری اقوام کے ذمی بن جائیں تو ان کے معاملات کو بھی اس پر قیاس کیا جائے گا۔ چنانچہ جب اور جہاں بھی یہ ذمہ یہود نے قبول کرلیا ان کی ظاہری ذلتیں باقی نہیں رہیں۔ قرنِ اوّل میں انھوں نے جب یہ ذمہ قبول کرلیا تھا تو وہ ایک حد تک آبرومندی کی سطح پر آگئے تھے، جیسا کہ نبیِ اکرم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے حسنِ معاملہ

سے ظاہر ہے جو یہودیوں کے ساتھ تھا کہ آپ ان سے معاملات بھی رکھتے تھے، ان سے قرض بھی لیتے تھے، ان کے بیماروں کی عیادت بھی فرماتے تھے۔ ان سے خرید و فروخت بھی ہوتی تھی۔ وہ مسجدِ نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں حاضر ہو کر آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ سے مختلف معاملات میں سوالات بھی کرتے تھے اور آپ با احترام انھیں جوابِ ہدایت سے بھی مشرف فرماتے تھے۔ پھر یہی معاملہ خلفاے راشدین کا بھی رہا، لیکن جب انھوں نے غداری اور فریب کاری کی تو اس کی سزا بھگتی اور پھر وہی ذلت لوٹ آئی۔

پھر اسی طرح جس ملک میں بھی وہ رہے، رعایا اور ذمی ہی بن کر رہے۔ مسلم ممالک میں مسلمانوں کے ذمی رہے اور غیر مسلم ممالک میں (یورپ وغیرہ میں سوائے روس کے) غیر مسلموں کے ذمی رہے اور دونوں جگہ اسی حبل من الناس کے سلسلے سے ان کی ذلت ایک حد تک مرتفع ہوتی رہی۔ اسلامی ممالک میں شرعی اصول پر ذمیوں کے احکام ان پر جاری ہوتے رہے۔ جن کے تحت وہ حقوق و معاملات میں مسلمانوں کے مساوی رہے۔ صرف جزیے وغیرہ کی ظاہری ذلت یا وہ باطنی ذلت قائم رہی، مگر حقوق و معاملات کی یکسانی میں کوئی فرق نہیں پڑا۔ اور یورپین ممالک میں عوامی دور شروع ہونے پر رعایا کے لیے جب مساوات کے نام پر قوانین بنائے گئے، جو اکثر و بیش تر اسلام ہی کے اصول سے لیے گئے، جس کے وہ خود بھی معترف ہیں اور ان کا قانون بھی شاہد ہے تو یہود ان سے منتفع ہوئے اور عیسائیت کے دیوِ استبداد سے انھیں اس جدید ذمیت سے کافی نجات مل گئی۔ تو یہاں ذمیت کی شکل اسلامی ذمیت سے کچھ بدلی ہوئی رہی مگر بہر حال ذمیت باقی رہی۔ سو جس حد تک انھوں نے ذمیت کا عہد پورا کیا، اس حد تک ان کی وہ عمومی ذلت بھی ہلکی ہوتی گئی۔ یعنی معاملاتی ذلت ختم ہوگئی، سیاسی ذلت باقی رہ گئی۔ بہر حال قرآنِ حکیم نے نہ صرف یہ کہ اس ذلت کے بارے میں دوام اور ہمیشگی کا اعلان نہیں فرمایا جو یہود کی مادی قوت کے منافی سمجھا جاتا، بلکہ اس کے برعکس اس ذلت کے رفع کرنے کا طریقہ بتلا کر اسے بھی قابلِ زوال اور مشروط بنا دیا۔ ظاہر ہے کہ جب یہ ذلت ہی خود اٹل نہیں رکھی گئی تو یہود کی کسی عزت و قوت کی دوامی اور علی الاطلاق نفی کا اس سے سمجھ لیا جانا نہ صرف قرآن پر اضافہ ہی ہے، بلکہ اس کے مفہوم کے خلاف ایک نیا دعویٰ اٹھا دینا ہے۔ رہی حکومت تو اس کی دو صورتیں ہوتی ہیں: ایک غیر مستقل اور دوسروں کے سہارے کی حکومت، جس میں حقیقی اقتدار اور طاقت دوسروں کے

ہاتھ میں ہو۔ اور قوم اپنی طاقت اور حکومت میں اس کی دست نگر ہو، بالفاظِ دیگر قادر بقدرۃ الغیر اور مقتدر باقتدار الغیر ہو تو اسے حکومت کا نام ضرور دیا جائے گا، لیکن وہ حقیقی حکومت نہ ہوگی۔ دوسری مستقل حکومت جس میں خود اپنی طاقت کسی سہارے کے بغیر کارفرما ہو، سو جہاں تک غیر مستقل یا بااختیار غیر حکومت کا تعلق ہے جس میں یہود اپنی حکمرانی میں دوسروں کے تابع بلکہ دست نگر ہوں تو وہ اگر کسی بڑی حکومت کے سہارے سے انھیں مل جائے اور وہ اپنی رسمی ذلت ختم کر سکیں تو یہ بھی حبل من الناس ہی کی ایک صورت ہوگی جو قرآن کی بتلائی ہوئی تدبیر کے اندر ہی رہے گی۔

ظاہر ہے کہ یہود کی آج کی حکومت جس کا نام اسرائیل رکھا گیا ہے حکومت کی پہلی قسم میں آتی ہے اور کسی طرح بھی اس ذلت کے منافی نہیں جس کا دعویٰ قرآن نے ان کے بارے میں کیا ہے۔ کیونکہ یہ بلحاظِ حقیقت یہود کی براہ راست کوئی حکومت ہی نہیں، بلکہ برطانیہ اور امریکہ کی ایک فوجی چھاؤنی ہے۔ انھوں نے یہود کی ضرورت سے یہ ملک نہیں بنایا بلکہ اپنی اغراض کی خاطر کھڑا کیا ہے، گو فائدہ اس سے یہود بھی اٹھا رہے ہیں۔ بلکہ واقعات کو دیکھا جائے تو برطانیہ وغیرہ نے گو یہود کو اسرائیل کی گدی پر بٹھلا دیا ہے، مگر ساتھ ہی یہ اسرائیل بنانے والی عیسائی قومیں اسرائیل بنا کر بھی یہود کا کوئی وقار و وقعت اور عزت دلوں میں لیے ہوئے نہیں، بلکہ ان کی ذلت ہی کی قائل ہیں، یہی برطانوی جو آج یہود کی حمایت کا دم بھر رہے ہیں وہ بھی نہ صرف اسرائیل کے تصور سے پیش تر ہی انھیں ذلیل جانتے تھے، بلکہ اب بھی انھیں دلوں سے ذلیل ہی سمجھتے ہیں۔ جبکہ انھوں نے یہود کی ضرورت سے اسرائیل نہیں بنایا، بلکہ صرف اپنے چند ناپاک منصوبوں کی خاطر یہود کو آگے رکھ کہ اپنے اس نومولود وطن (اسرائیل) کو اپنے آلۂ کار کی حیثیت سے جنم دیا ہے اور اس جنم دہی کے وقت بھی ان کے دلوں میں یہود کی ذلت و بے وقعتی ہی چھپی ہوئی تھی۔ اس حقیقت کا انکشاف جنگِ عظیم کے دوران جرمنوں نے کیا تھا جبکہ برطانیہ اور امریکہ اسرائیل کی داغ بیل ڈال رہے تھے۔ برطانیہ کے مشہور اخبار ''لندن ٹائمز'' میں یہ حقیقت شائع ہوئی، جس پر اس برطانوی ترجمان نے کوئی نکیر یا تنقید نہیں کی۔ اس لیے جرمنی کا یہ انکشاف برطانیہ کا بھی تسلیم شدہ مانا جائے گا۔ بہر حال اسرائیل بنتے وقت بھی یہ دونوں ہی

(جرمنی اور برطانیہ) اس حقیقت پر متفق تھے، جس کا اظہار صفائی سے جرمنوں نے کر دیا تھا کہ: ’’یہود دنیا کی ذلیل ترین قوم ہے اور اسرائیل کی حکومت یہود کی نہیں بلکہ برطانیہ اور اس کے حلیفوں کی ہے‘‘۔ جرمن وزیر ڈاکٹر گولبس کا مقالہ مع اس کے قائم کردہ عنوان کے درج ذیل ہے:

خون چوسنے والی قوم: لندن ٹائمز کے نامہ نگار کا بیان ہے کہ نازی حکومت کے وزیرِ نشریات ڈاکٹر گولبس نے نازی کانگریس کے سالانہ اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے اس حقیقت کو بے نقاب کیا ہے کہ: ’’یہودی ایک خطرناک اور دوسروں کے خون سے پیٹ بھرنے والی قوم ہے‘‘۔ جس حقیقت کو جرمن قوم اب سمجھی ہے اسے غالبًا انگریز بہت پہلے سے سمجھ چکے تھے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ جرمنوں نے ان خوفناک انسانی جونکوں سے اپنے ملک کو نجات دلانے کے لیے انھیں چُن چُن کر اپنے یہاں سے نکال پھینکا ہے اور انگریزوں نے ان کی اس خوفناک صفت سے فائدہ اٹھانے کے لیے ان کی پرورش اور سرپرستی شروع کر دی۔ تاکہ وہ جس ملک کو اپنی ملوکانہ اغراض کی تکمیل کے لیے آلۂ کار بنانا چاہیں وہاں سب سے پہلے ان جونکوں کا ایک لشکر بھیج دیں اور یہ خون آشام قوم وہاں کے انسانوں کا خون چوس کر بے کار اور مردہ بنا دے اور پھر انگریز بغیر خوفِ مزاحمت آسانی کے ساتھ اس ملک سے اپنی غلامی کا دوامی پٹا لکھوا کر جس طرح چاہیں استعمال کر سکیں۔ چنانچہ ان پروردہ جونکوں کی صلاحیت کا سب سے پہلا تجربہ فلسطین میں کیا گیا ہے اور حالات بتا رہے ہیں کہ یہ تجربہ کامیاب ثابت ہوا ہے، یقین نہ آئے تو فلسطین جا کر وہاں کے عربوں کی حالت اپنی آنکھوں سے دیکھ لیجیے کہ چند ہی سال کی قلیل مدت میں ان کے سرخ سپید چہرے خون کی سرخی سے محروم ہو چکے ہیں یا نہیں؟ (استقلالِ دیوبند، ص:۳ج:۲، نمبر،۱۳۴، ۳۰ستمبر ۳۶ء، رجب، ۵۵ھ)

اسی طرح امریکہ بھی جو اس قوم کی پشت پناہی میں پیش پیش ہے اس کو ذلیل اور روے زمین کا سیادہ داغ سمجھنے اور اس سے بے زار ہونے میں جرمنی اور برطانیہ سے الگ نہیں۔ روزنامہ دعوت دہلی کے ذیل کے اقتباسات سے یہ حقیقت سامنے آ جاتی ہے۔ اخبار دعوت دہلی اپنے ایڈیٹیو کالم میں رقم طراز ہے کہ: ’’حال ہی میں تین ممتاز امریکی مصنفین نے اس (امریکی رائے عامہ دربارۂ یہود) پر تین کتابیں لکھی ہیں، جن کا ایک سوویٹ خبر نامے میں حوالہ دیا گیا ہے... ان تینوں کتابوں میں ۱۹۵۴ء سے اب تک یہودیوں کی

سرگرمیوں اور امریکی عوام میں یہودیوں سے بے زاری کا پتا چلتا ہے۔ رابرٹ گسٹر نے ایسی پچیس انجمنوں کا تذکرہ کیا ہے جو یہودیوں کی دشمن ہیں، ان مصنفین نے کافی معلومات فراہم کی ہیں کہ کارخانوں، دفتروں اور اداروں میں یہودیوں کو سب سے آخر میں ملازمت دی جاتی ہے اور سب سے پہلے انھیں برطرفی کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ صنعت کے کئی میدانوں میں خاص طور پر بھاری برقیاتی ہوابازی، آلات سازی اور فوجی اہمیت رکھنے والی دوسری صنعتوں میں یہودیوں کو اس وقت تک ملازمت نہیں دی جاتی جب تک وہ ممتاز سائنس دان نہیں ہوتے۔ یہی حال یونیورسٹیوں کا بھی ہے، شہروں کی پاکیزہ اور صاف ستھری بستیوں میں انھیں مکان نہیں ملتے، سبھی صحبت گاہوں اور اکثر کلب گھروں میں ان کا داخلہ ممنوع ہے۔ کہیں کہیں ایسی تختیاں بھی لگی ہوئی دکھائی دیتی ہیں کہ: ''یہاں یہودیوں کا داخلہ ممنوع ہے''۔ تین سو سال سے زیادہ عرصے سے یہودی امریکہ میں آباد ہیں اور اس میں بیش تر سفید فام باشندے ہیں، مگر ان کے لیڈروں کی سازشی ذہنیت نے اب تک انھیں وہاں کے سماج کا وفادار حصہ نہیں بننے دیا''۔ (روزنامہ دعوت دہلی، ۲۴، اپریل ۱۹۷۰ء، ایڈیٹوریل بعنوان ''امریکہ کے یہودی'')

اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ جب یہودیوں کے پشت پناہ دوستوں کی نفرت کا یہ حال ہے تو بقیہ دنیا ان کے بارے میں جو بھی حقارت و نفرت کی رائے رکھے وہ رکھ سکتی ہے۔ یہود کی آج تک یہ ذلت و حقارت کی برقراری اور وہ بھی ان کی طرف سے جو یہودیوں کے حامی کہلا رہے ہیں۔ اور پھر ایسے اوقات میں کہ یہود کو ایک ظاہری اقتدار بھی کی کسی حد تک ہاتھ آچکا ہے، اسی خدائی پھٹکار اور تذلیل کا اثر ہے جو ان کے کرتوت کے سبب سے ان پر مسلط ہے۔

بہر حال قرآنی تصریحات لی جائیں یا زمانے کے واقعات دونوں اس سے انکاری نہیں ہیں کہ مادی قوت اور اخلاقی ذلت و دناءت میں کوئی تضاد نہیں کہ دونوں جمع نہ ہو سکیں۔ جرمنی، برطانیہ اور امریکہ کو یہودی ذلت و دناءت کا بھی اعتراف ہے اور ساتھ ہی ان کی حکومت بنا کر اس کے تسلیم کر لینے سے بھی انکار نہیں، جس سے واضح ہے کہ جیسے قرآن کے نزدیک کسی نفس کی جوہری ذلت اور اس کی مادی قوت میں منافات نہیں ایسے ہی دنیا کی اقوام کے نزدیک بھی یہ دونوں باتیں جمع ہو سکتی ہیں۔ جہاں تک واقعات کا تعلق ہے، یہود کی

موجودہ حکومت اسرائیل ظاہری طور پر یہود کی حکومت ضرور سمجھی جاتی ہے مگر حقیقتاً یہ ملک ان کے قبضے میں ہے جنھوں نے اس ملک کو اپنی طاقت سے بنایا اور وہ یقیناً یہود نہیں بلکہ برطانیہ اور امریکہ ہیں۔ اگر عربوں کو آج اسرائیل پر ہاتھ ڈالنے میں پس و پیش ہے تو اسرائیل کی اس وقتی اور محتاج غیر قوت سے نہیں بلکہ برطانیہ، فرانس اور امریکہ کی مستقل طاقت سے ہے۔ چنانچہ ۱۹۵۶ء میں جب نہرِ سوئز پر حملہ ہوا تو بھی برطانیہ اور فرانس پردے سے باہر نکل کر کھلے بندوں اسرائیل کی پشت پناہی کر رہے تھے نہ کہ اسرائیل خود اپنی کسی طاقت سے نبرد آزما ہو رہا تھا۔ اور آج بھی اگر اسرائیل مصر اور عرب ممالک کا مقابلہ کر رہا ہے تو اسرائیل کی پشت پر امریکہ مدِ مقابل ہے نہ کہ خود اسرائیل۔ پھر امریکہ اور برطانیہ نے اگر دھوکے سے اسرائیل کو ایک وطنی اقتدار کے نام پر قائم کیا تو وہ در حقیقت عربوں کی طاقت گھٹانے یا مٹانے اور عالمِ عرب کو نیچا دکھانے کے لیے کیا نہ کہ یہود کی ہم دردی یا ان کی عزت یا ان کی کسی مستقل طاقت بڑھانے کے لیے یا انھیں ایک باوقار قوم سمجھ کر ان کی طاقت قائم کرنے کے لیے۔ اگر آج عیسائی اقوام یہود یا اسرائیل کی سرپرستی سے دست بردار ہو جائیں تو پھر اسرائیل کی کوئی طاقت نہیں کہ وہ عرب کی کسی ایک ریاست کے مقابلے میں بھی ٹھہر سکے۔ پس یہود ان مغربی طاقتوں اور ان کی ڈپلومیسیوں کے تحت خود ان کے اقرار سے ایک آلۂ کار کی حیثیت سے زائد نہیں جیسا کہ ابھی لندن ٹائمز کا اقتباس گزر چکا ہے۔ وہ اس وقت بھی عیسائیوں کے ماتحت اور ان کے آلۂ کار تھے جب اسرائیل کا وجود نہیں تھا اور آج بھی جبکہ انھی کے بنائے ہوئے یہ اسرائیل بن چکا ہے، جو ان کے آلۂ کار کی حیثیت سے زائد نہیں۔ اس لیے اس میں کسی شبہے کی گنجائش نہیں کہ اسرائیل حقیقتاً یہود کا ملک نہیں۔ اندریں صورت یہود اگر قادر بقدرتِ غیر اور مقتدر باقتدارِ غیر کے اصول پر قابض ہیں تو یہ نہ یہود کی قدرت ہے، نہ اقتدار اور نہ انھیں کسی بھی صورت سے خود کار صاحبِ اقتدار یا مستقل صاحبِ قدرت و شوکت مانا جا سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسا عارضی اور محتاجِ غیر اقتدارِ یہود اس ذلت کے منافی تو کیا ہوتا، بلکہ اس کے حق میں ایک شاہد اور وجہِ ثبوت کی حیثیت رکھتا ہے کہ یہود اتنی قوت پا کر بھی غیر اقوام کے غلبۂ اقتدار کی ماتحتی اور تذلیل سے باہر نہ آ سکے اور ان کی وہ محتاجی اور دست نگری بدستور قائم رہی جو پہلے سے قائم تھی، پس اس سے ان کی جوہری ذلت پر کیا اثر پڑا بلکہ ذلت کی شان اس آلۂ کار بننے سے اور بڑھ گئی۔

خلاصہ یہ کہ حبل من اللہ سے تو یہود کی ذلت کلیۃً ختم ہو جائے گی، تدبیر کا قرآن نے اعلان کیا، جیسا کہ قرنِ اوّل میں جن سعادت مند یہود نے اس حبل من اللہ کو تھام لیا، وہ ظاہری اور باطنی عزت کے مالک بن گئے۔ اور حبل من الناس سے جزئی طور پر خاتمۂ ذلت کی تدبیر کا اعلان کیا، جیسا کہ قرنِ اوّل اور قرونِ مابعد میں یہود نے حبل من الناس کے تحت ذمی بن کر اپنا ظاہری وقار حاصل کر لیا۔ ایک صورت میں وہ یہودی نہ رہے اور مطلقاً عزت حاصل کر لی، ایک صورت میں یہودی، یہودی رہے، مگر دوسری اقوام کے تابع اور محکوم بن کر انھوں نے فی الجملہ عزت پالی۔ تیسری صورت، یہود رہتے ہوئے ان کی غیر مستقل حکومت ہے جو بڑی طاقتوں کے بل بوتے پر ان کے آلۂ کار کی حیثیت سے قائم ہے، جیسا کہ آج کی صورت ہے۔ سو یہ بھی ایک قسم کا ذمہ ہے جس کا نام عہد ہوگا، جو حبل من الناس ہی کی ایک صورت ہے۔ فرق اتنا ہے کہ پہلی صورت میں قوم ذمی رہتی ہے اور دوسری صورت میں اس کی نام نہاد حکومت ذمی بن جاتی ہے، اس لیے ان میں کوئی صورت بھی بہ نصِ قرآن ان کی ذلت کے منافی نہیں۔ کیونکہ دونوں میں دوسری اقوام کی دست نگری قائم رہتی ہے اور یہ دونوں صورتیں یہود کی باطنی ذلت کے ساتھ جمع ہو سکتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ تینوں صورتیں جبکہ حبل کے نیچے تھیں تو قرآن حکیم کے عمومی مفہوم سے باہر نہیں جاتیں، کہ ان کے وجود پذیر ہونے پر قرآنی مخالفت کا سوال پیدا ہو۔ البتہ چوتھی صورت یہود کی مستقل حکومت کی ہے کہ یہود، یہود رہتے ہوئے نہ حبل من اللہ سے استفادہ کریں اور نہ حبل من الناس سے اور پھر بھی انھیں حکومت اور وہ بھی مستقل حکومت حاصل ہو جائے، تو قرآن نے جیسے اس کا اثبات نہیں کیا۔ اس کی نفی بھی نہیں کی، بلکہ اس سے سکوت اختیار کر کے اسے حالاتِ زمانہ پر چھوڑ دیا ہے۔ اور اس کی عائد کردہ ذلت پر اس سے بھی کوئی اثر نہیں پڑتا، جیسا کہ اجمالاً اس کے بارے میں سطورِ سابق میں تذکرہ آچکا ہے۔

*****

ماخذ: یہودی اقتدار کا شرعی تجزیہ: اسرائیل کتاب و سنت میں کی روشنی میں، حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ، مکتبۃ العلوم الاسلامیۃ کراچی، ۲۰۲۱ء، ص: ۳۳

مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ

مسئلۂ فلسطین برطانوی دستاویزات کی روشنی میں

۱۰، اگست ۱۸۴۰ء کو برطانوی وزیرِاعظم پلمر سٹون نے ترکی میں تعینات برطانوی سفیر کو ایک خط بھیجا کہ: ''یورپ کے مختلف شہروں میں رہنے والے یہودیوں میں یہ احساس بڑھ گیا ہے کہ اب فلسطین میں اپنا وطن قائم کرنے کا وقت قریب آگیا ہے اور یہ اچھی طرح معلوم ہے کہ یورپ کے یہودی بڑے دولت مند ہیں، لہذا جب یہودی قوم عثمانی بادشاہ کی سرپرستی اور حمایت میں فلسطین واپس آجائے گی تو یہ محمد علی اور ان کے جانشینوں کے خطرناک پلان کے نافذ العمل ہونے کے راستے میں رکاوٹ بنیں گے اور ترکی حکومت بھی اس کو مسئلۂ فلسطین کے حق میں مفید سمجھتی ہے کہ اس طرح کے ایک معمولی قانون کے ذریعے وہ بہت سے ملکوں میں اپنے حمایتی اور دوست حاصل کر سکتی ہے''۔[۱]

۱۸۶۱ء میں برطانوی قلم کار تھامس کلارک نے اپنی کتاب ہندوستان اور فلسطین میں لکھا کہ: ''اگر یہودی قوم کو دوبارہ کھڑا کر دیا جائے تو عن قریب بنی اسرائیل میں بیداری اور حرکت پیدا ہو جائے گی اور اس سے سب زیادہ فائدہ ہم کو حاصل ہو گا۔ یہ یقین رکھنا چاہیے کہ فلسطین میں یہودی وطن کا قیام از حد ضروری ہے، اگر برطانیہ تجارت کو اپنی ریڑھ کی ہڈی سمجھتا ہے اور اسے معلوم ہے اس کی تجارت تین براعظموں سے ہو کر گزرتی ہے اور اسے یہ بھی معلوم ہے کہ یہودی بنیادی طور پر ساہوکار اور تاجر قوم ہے تو اسے اپنی تجارت کی ترقی اور فروغ کے لیے بنی اسرائیل کو فلسطین میں بسانا انتہائی ضروری ہے، از سرِ نو انھیں ان کی قومیت اور ان کا ملک واپس کر دیا جائے، کیونکہ دنیا کی کوئی طاقت اس کو ان سے نہیں چھین سکتی''۔[۲]

۱۳، مارچ ۱۹۱۶ء کو سابق روسی دار السلطنت پٹروگراڈ میں قائم برطانوی سفارت خانے نے روسی وزیرِ خارجہ کو ایک خط لکھا تھا جس میں فلسطین میں یہودیوں کے قیام سے متعلق روس کی رائے جاننی چاہی تھی۔ اس

خط میں سرادوارڈ گری نے صاف لفظوں میں لکھا ہے کہ اس وقت برطانیہ کے بادشاہ سلامت فلسطین میں یہودیوں کی آباد کاری پر بھرپور توجہ دے رہے ہیں، خط میں پیش کیا گیا نقطۂ نظر اگر صحیح ہے تو صہیونیت کے ذریعے اہم سیاسی نتائج برآمد ہوں گے اور سب سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ اس طرح مشرق اور امریکہ کے یہودیوں کو اپنے حلیفوں کی طرف لایا جاسکتا ہے۔ (۳)

۲، نومبر ۱۹۱۷ء کو برطانیہ کے وزیرِ خارجہ بال فور نے وعدہ کیا کہ ملکِ معظم کی حکومت پوری ہمدردی اور ذمے داری کے ساتھ سرزمینِ فلسطین میں یہودی مملکت کے قیام پر غور کر رہی ہے اور ان کی حکومت اس مقصد کے حصول کے لیے ہر ممکن کوشش کرے گی اور ہر ایسے کام سے گریز کرے گی جس سے فلسطین میں رہنے والی غیر یہودی آبادی کے شہری اور مذہبی حقوق متاثر ہوں یا دوسرے ملکوں میں رہنے والے یہودیوں کے حقوق اور ان کی سیاسی پوزیشن متاثر ہو۔ (۴)

بال فور ا، اگست ۱۹۱۹ء کو کینیج کراین امریکی کمیشن کو ایک خط میں لکھتا ہے کہ: صہیونیوں کے تعلق سے چار ممالک نے اپنے وعدے بخوبی پورے کیے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ صہیونی خواہ وہ حق پر ہوں یا باطل پر اور خواہ وہ اچھے ہوں یا برے، ہماری تہذیب، ہماری ضرورت اور مستقبل کی ہماری آرزوؤں کی تکمیل میں ان کا اہم رول ہے۔ وہ عرب ممالک میں آبادسات سو ہزار عربوں کی خواہشات سے کہیں زیادہ اہمیت کے حامل ہیں"۔ (۵)

۲۰، اپریل ۱۹۲۰ء کو جب دوست ممالک کی کونسل نے فلسطین میں برطانوی مینڈیٹ کو منظوری دے دی تو اس وقت شاہِ برطانیہ نے یہودیوں کے نام ایک پیغام میں کہا کہ: "تمام دوست ملکوں نے یہ فیصلہ اور عہد کر لیا ہے کہ تدریجی طور پر فلسطین میں یہودی وطن کے قیام کو یقینی بنایا جائے گا"۔ (۶)

حوالہ جات:

(۱) ملف وثائق فلسطین ''موف'' الهيئة المصرية العامة للاستعلامات، ص:۴۸
(۲) ایضا، ص:۵۳ (۳) ایضا، ص:۱۹۱ (۴) ایضا، ص:۲۱۷ (۵) ایضا، ص:۲۵۷ (۶) ایضا، ص:۲۷۵

****

ماخذ: مسئلۂ فلسطین: سامراج اور عالمِ اسلام، مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ، دار الرشید لکھنؤ، ہندوستان

مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ

مسئلۂ فلسطین امریکی دستاویزات کی روشنی میں

امریکی ماہرین کے ایک کمیشن نے امریکی صدر ولسن کو ۱۲، جنوری ۱۹۱۹ء کو اپنی مفصل رپورٹ پیش کی کہ: ''کمیشن سفارش کرتا ہے کہ برطانوی مینڈیٹ میں فلسطین میں یہودیوں کا قومی وطن قائم کر دیا جائے اور دنیا بھر کے یہودیوں سے اپیل کی جائے کہ وہ فلسطین میں آکر بسیں اور انھیں ہر طرح کا تعاون بہم پہنچایا جائے اور ساتھ ہی اس بات کا بھی خیال رکھا جائے غیر یہودی باشندوں کے حقوق متاثر نہ ہوں''۔ (۱)

کینج کراین امریکن کمیٹی نے فلسطین کے زمینی سروے کے بعد ۲۸، اگست ۱۹۱۹ء کو رپورٹ پیش کی جس میں صراحت کے ساتھ کہا گیا کہ: ''فلسطین کی اصل غیر یہودی آبادی جو نوے فیصد ہے فلسطین میں صہیونی پروگرام کو قبول نہیں کرے گی اور یہ بات بھی واضح ہو گئی ہے کہ صہیونیوں اور یہودیوں سے عداوت کا احساس اب صرف فلسطین ہی میں محدود نہیں رہا، تمام انگریز افسروں کا ماننا ہے کہ صہیونی پروگرام کو صرف اور صرف فوجی طاقت ہی کے بل پر نافذ کیا جا سکتا ہے اور یہ فوجی طاقت پچاس ہزار فوجیوں سے کم نہ ہو، یہ خود اس بات کی واضح دلیل ہے کہ صہیونی پروگرام میں اصل فلسطینی باشندوں کے حقوق کی کھلی پامالی ہے، لہذا ان ظالمانہ قراردادوں کے نافذ کرنے کے لیے فوج کو بھیجنا ضروری ہے، دوسری طرف صہیونیوں کا بنیادی مطالبہ یہ ہے کہ وہ فلسطین میں دو ہزار سال سے آباد ہیں، یہ دعویٰ ناقابلِ توجہ ہے، جو لوگ فلسطین کو یہودی ریاست بنانا چاہتے ہیں انھیں نتائج کا صحیح اندازہ نہیں ہے اور نہ انھیں فلسطین میں پائی جانے والی مخالفت اور عداوت کا اندازہ ہے، خاص طور پر دنیا کے ان حصوں میں جہاں کے لوگ فلسطین کو مقدس سرزمین سمجھتے ہیں، بالفاظ دیگر فلسطین میں یہودیوں کی ہجرت کو یقینی بنایا جائے اور فلسطین کو یہودی اسٹیٹ بنانے کے منصوبے سے کلی طور پر گریز کیا جائے''۔ (۲)

۱۶، مارچ ۱۹۴۴ء کو امریکی صدر فرانکلین روزولٹ نے اپنے ایک بیان میں کہا: ’’آج مجھے بڑی سعادت محسوس ہو رہی ہے، اس لیے کہ یہودی پناہ گزینوں کے لیے آج فلسطین کے دروازے کھول دیے گئے ہیں۔ مستقبل میں جب اہم فیصلے کر لیے جائیں گے تو ان لوگوں کو انصاف مل جائے گا جو یہودیوں کے قومی وطن کے لیے کوشاں ہیں، ہماری حکومت اور امریکی قوم دونوں اس کو محسوس کرتے ہیں اور آج تو کچھ زیادہ ہی اس کا احساس ہے‘‘۔(۳)

دسمبر ۱۹۴۵ء کو یورپ کے یہودیوں کے مسائل اور مسئلۂ فلسطین پر غور کرنے کے لیے جو اینگلو- امریکن کمیٹی تشکیل دی گئی تھی اس کی سفارشات میں کہا گیا کہ: ’’فوری طور پر ان یہودیوں کو فلسطین میں داخلے کی اجازت دے دی جائے جو نازیوں اور فاشسٹوں کے مظالم کا شکار بنتے رہے ہیں۔ اس مقصد کے حصول میں امریکہ اور برطانیہ دونوں اہم رول ادا کر سکتے ہیں۔ فلسطین کو یہودی اور فلسطینی ریاست میں تقسیم نہ کیا جائے، ایسے اقدامات کیے جائیں جن سے یہودی، مسیحی اور اسلامی حقوق کی حفاظت کو یقینی بنایا جا سکے۔ یہودیوں کو اپنے ملک اور قومی یہودی وطن سے تعلق رہا ہے، اگرچہ ان کی تعداد بہت کم رہی ہے لیکن اب یہ حقیقت بن گیا ہے، اس کے ساتھ یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ فلسطین خالص یہودی سرزمین نہیں ہے اور نہ مستقبل میں ایسا ہو سکتا ہے، یہ عالم عربی کے دوراہے پر ہے اور عرب جن کے اسلاف یہاں کے قدیم زمانے سے اصل باشندے ہیں وہ اس کو اپنا قومی وطن سمجھتے ہیں۔ عرب اور یہود دونوں سے صاف لفظوں میں کہہ دیا جائے کہ اگر کسی نے بھی تشدد کا راستہ اختیار کیا یا غیر قانونی فوج بنائی تو اسے کچل کر رکھ دیا جائے گا‘‘۔(۴)

ملک عبدالعزیز کے ایک خط کے جواب میں جس میں انھوں نے مسئلۂ فلسطین کے تعلق سے امریکی رویے پر اپنے خدشے کا اظہار کیا تھا۔ امریکی صدر ٹرومان نے کہا: ’’امریکا اپنے رویے پر اٹل ہے، وہ یہ کہ عوام کو ان کی حکومت دی جائے گی اور فلسطین میں یہودیوں کی بازآبادکاری بھی ضروری ہے‘‘۔(۵)

۲۴، فروری ۱۹۵۷ء کو منعقد ہونے والی یہود و نصاریٰ کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے امریکی صدر جان کنیڈی نے کہا کہ: ’’مجھے یقین ہے کہ عرب اور یہود دونوں شہری دوستی پر متفق ہو جائیں گے اور اس راستے میں داخلی سطح پر دونوں کو جس ملامت اور تنقید کا سامنا کرنا پڑے گا اس کو برداشت کریں گے اور جنگ کے

راستے کو چھوڑ کر تمام کوششوں اور مالی وسائل کو تعمیری رخ پر لگائیں گے۔ اسرائیل ایک تیز روشنی ہے جو شرقِ اوسط میں پھوٹ رہی ہے"۔(۶)

۲۷، اکتوبر ۱۹۹۴ء کو امریکی صدر بل کلنٹن نے اپنے اسرائیلی دورے میں اسرائیلی پارلیمنٹ میں یہ بیان دیا کہ تمھارا زوال ہمارا زوال ہے، امریکا اب بھی تمھارے ساتھ ہے اور آئندہ بھی رہے گا"۔(۷)

حوالہ جات:

(۱)ملف وثائق فلسطين ''موف'' الهيئة المصرية العامة للاستعملامات، ص:۲۴۱

(۲)ایضا، ص:۲۵۹　(۳)ایضا، ص:۵۳۵　(۴)ایضا، ص:۶۵۷　(۵)ایضا، ص:۸۵۹

(۶)ایضا، ص:۱۵۶۱　(۷)صحیفہ (اصل کتاب میں حوالہ نامکمل ہے)

* * * * *

ماخذ: مسئلۂ فلسطین: سامراج اور عالمِ اسلام، مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ، دار الرشید لکھنؤ، ہندوستان

مولانا زاہد الراشدی

مسئلہ فلسطین اور برطانوی وزیرِ خارجہ بال فور کا موقف

روزنامہ پاکستان لاہور ۲۳، اپریل ۲۰۰۷ء کی ایک خبر کے مطابق اسرائیلی سپریم کورٹ نے فلسطینیوں کے قتل کو جائز قرار دے دیا ہے۔ خبر میں بتایا گیا ہے کہ ۹، نومبر ۲۰۰۵ء کو اسرائیلی فوج نے ایک فلسطینی کو راہ چلتے شہید کر دیا تھا جس پر انسانی حقوق کی تنظیموں اور عرب ممالک نے صدائے احتجاج بلند کی۔ اسرائیلی سپریم کورٹ نے اس احتجاج کے خلاف فیصلہ دیتے ہوئے اعلان کیا ہے کہ فلسطینیوں کو قتل کرنا جائز ہے، فیصلے میں کہا گیا ہے کہ سرحد پر تعینات فوجی کسی بھی فلسطینی کو دیکھتے ہی گولی مار دے۔ اسرائیلی فوج کے ہاتھوں فلسطینیوں کے قتلِ عام کا سلسلہ اسرائیل کے قیام کے وقت سے جاری ہے اور اب تک ہزاروں فلسطینی اسرائیلی فوج کی اس بربریت کی بھینٹ چڑھ چکے ہیں۔ لیکن انتہائی حیرت اور افسوس کی بات یہ ہے کہ اس قتلِ عام کو ایک ایسے ادارے کی طرف سے باقاعدہ جواز کی سند دی جارہی ہے، جس ادارے کو دنیا کے کسی بھی ملک میں انصاف کی برتری اور انسانی جان و مال کے تحفظ کی سب سے بڑی علامت تصور کیا جاتا ہے۔ اور ستم بالائے ستم یہ ہے کہ اسرائیل کو اس نسل پرستی، ظلم و جبر اور دہشت گردی کے باوجود انسانی حقوق کے علم بردار مغربی ملکوں کی مسلسل حمایت حاصل ہے اور اس کے ہر جائز و ناجائز اقدام کی مغربی ممالک کی طرف سے پشت پناہی بے دریغ جاری ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ جس کام کی بنیاد ہی ظلم و جبر، ناانصافی اور حق تلفی پر رکھی گئی ہو اس سے کسی مرحلے میں خیر کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ ابھی چند روز قبل پروفیسر سید حبیب الحق ندوی کی کتاب ''فلسطین اور بین الاقوامی سیاست'' میں ہم نے یہ پڑھا کہ جب برطانوی وزیرِ خارجہ بال فور نے ۱۹۱۷ء میں ایک اعلامیے کے ذریعے فلسطین کو یہودیوں کا قومی وطن تسلیم کرنے کا اعلان کیا، تو اس وقت معروضی صورتِ حال یہ تھی کہ

فلسطین سلطنتِ عثمانیہ کا ایک صوبہ تھا، اس کی آبادی نوے فی صد سے زیادہ عربوں اور مسلمانوں پر مشتمل تھی، ملک کی ستانوے فی صد زمین عربوں کی ملکیت تھی اور یہودیوں کی آبادی پورے فلسطین میں آٹھ فی صد سے زائد نہ تھی۔ اس صورتِ حال میں جب یہ سوال اٹھایا گیا کہ ان زمینی حقائق کی روشنی میں فلسطین کو یہودیوں کا قومی وطن کیسے قرار دیا جا سکتا ہے تو برطانوی وزیرِ خارجہ بال فور نے ۱۱، اگست ۱۹۱۹ء کو ایک یادداشت کے ذریعے دنیا کو بتلایا کہ: ’’ہمیں فلسطین کی مقامی آبادی سے مشورہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں، چار بڑی طاقتیں صہیونی قوت سے وعدہ کر چکی ہیں۔ رہی صہیونیت، تو یہ غلط ہو یا صحیح، اچھی ہو یا بری، اس کی جڑیں قدیم روایات سے سرایت کر چکی ہیں جو گہری ہیں۔ دورِ حاضر کے تقاضے ہوں یا مستقبل کی امیدیں، ان کے اثرات سات لاکھ عربوں سے، جو فی الحال اس قدیم سرزمین پر آباد ہیں، کہیں زیادہ عمیق اور گہرے ہیں‘‘۔ یہ وہ فکری اور اخلاقی بنیاد ہے جس پر برطانیہ اور اس کے ہمنواؤں نے فلسطین کو یہودیوں کے قومی وطن کے طور پر تسلیم کرنے کا اعلان کیا تھا بلکہ برطانیہ نے ۱۹۱۷ء سے ۱۹۴۷ء تک فلسطین پر اپنے قبضے کے دوران دنیا بھر سے یہودیوں کو جمع کر کے فلسطین میں انھیں آباد کیا اور اس طرح فلسطین میں یہودی ریاست کے قیام کی راہ ہموار کی۔ یہ فلسطین کی بدنصیبی کی انتہا ہے کہ عرب دنیا اور عالمِ اسلام ان فلسطینیوں کے حقوق، تشخص اور تحفظ و آزادی کے لیے اسی مغربی دنیا سے توقعات وابستہ کیے ہوئے ہیں، جن کے ہاتھوں فلسطین اور فلسطینی اس مقام تک پہنچے ہیں۔ اس پر مظلوم فلسطینیوں کے لیے بارگاہِ ایزدی میں رحم کی دعا کے سوا اور کیا کیا جا سکتا ہے؟

*****

ماخذ: https://zahidrashdi.org/2454

نعیمؔ صدیقی

یروشلم، یروشلم

لہو اگل رہا ہے آج، میرا پُر فنوں قلم
شکستِ آرزو کا کیا، فسانہ ہو سکے رقم
خیال پرزے پرزے ہیں، کروں میں کس طرح بہم
...یروشلم، یروشلم!

یروشلم، یروشلم، تو اک حریمِ محترم
ترے ہی سنگِ در پہ آج منھ کے بل گرے ہیں ہم
تجھے دیا ہے ہاتھ سے، بہ زخمِ دل بہ چشمِ نم
...یروشلم، یروشلم!

جہاں کی ساری راحتیں سپردِ سیلِ نار کیں
کئی ہزار میتیں، گلی گلی نثار کیں
ترے وقار کے لیے، لہو دیا قدم قدم
...یروشلم، یروشلم!

یہیں سے ہو کے عرش کو، سواریِ نبی گئی
ابھی تک اِن فضاؤں میں ہے اک مہک بسی ہوئی
یہاں کی خاک پر ٹکے، براقِ نور کے قدم
...یروشلم، یروشلم!

نمازِ بے مثال یاں، وہ کی گئی ہے اک ادا

بہ اقتدائے مصطفیٰ، حبیبِ خاص کبریا
کھڑے تھے اک قطار میں ملا کے انبیا قدم
... یروشلم، یروشلم!

تسلطِ یہودیاں، رہے؟ نہیں، کبھی نہیں
یہ ظلم ایسا ظلم ہے کہ جس کی تاب ہی نہیں
میں دیکھتا ہوں آج پھر "صلاحِ دین" کا علَم
... یروشلم، یروشلم!

بہ راہِ داستانِ دل، مہیب حادثوں کے موڑ
صدارتوں کی سازشیں، سفارتوں کے جوڑ توڑ
مثالِ زلف یار ہیں، سیاستوں کے پیچ و خم
... یروشلم، یروشلم!

* * * * *

مولانا محمد اقبال

معاونِ شعبۂ تحقیق وتصنیف، فقہ اکیڈمی

تاریخِ فلسطین عہد بہ عہد

سرزمینِ فلسطین وہ بقعۂ مبارکہ ہے جسے ہزاروں انبیاے کرام علیہم السلام کی قدم بوسی کا شرف حاصل ہے اور جہاں رسولِ عربی صلی اللہ علیہ وسلم نے انبیاے کرام علیہم السلام کی امامت فرما کر عزت بخشی ہے۔ یہ ارضِ مقدسہ جسے نطقِ قرآن نے ہمیشہ کے لیے امر بنا دیا ہے۔ جس کی عظمت وشوکت کی گواہی حضرت داؤد وطالوت علیہما السلام کی عظیم قربانیوں نے دی ہے اور جسے رسولِ عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان اور طالوتِ اُمّتِ عربی، امیر المؤمنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی بنفسِ نفیس حاضری نے سرفرازی بخشی ہے۔ اور اسی خطے میں وہ شہرِ قدس موجود ہے جس کے اندر مسلمانوں کا قبلۂ اوّل مسجد الاقصیٰ واقع ہے، جس کے چپے چپے پر انبیاے کرام علیہم السلام کے سجدوں کے نشان ثبت ہیں۔

فلسطین کا محلِ وقوع اور وجہِ تسمیہ

سرزمینِ فلسطین برِ اعظم ایشیا کے اس مغربی علاقے میں واقع ہے جسے مشرقِ وسطیٰ کہا جاتا ہے۔ اس کی حدودِ اربعہ یہ ہیں: مغرب میں بحرِ احمر، مشرق میں شام اور اردن، شمال میں لبنان جبکہ جنوب میں خلیجِ عقبہ اور مصر واقع ہیں۔ فلسطین کا کل رقبہ، ستائیس ہزار مربع کلومیٹر ہے، جس کا عرض زیادہ سے زیادہ ساٹھ کلومیٹر اور طول ساڑھے چار سو کلومیٹر ہے۔ فلسطین کے مشہور اور تاریخی شہر یروشلم، موجودہ بیت المقدس، عسقلان، خلیل، رملہ، طولکرم، رام اللہ، غزہ، خان یونس، اریحا، بیتِ لحم، نابلس اور یافا ہیں۔ فلسطین کی وجہِ تسمیہ کے متعلق علامہ یاقوت حموی رحمۃ اللہ علیہ نے معجم البلدان میں لکھا ہے کہ اسے فلسطین بن سام بن ارم بن سام بن نوح علیہ السلام کے نام سے موسوم کرکے فلسطین کہا گیا ہے۔ اسی طرح علامہ یاقوت حموی نے ایک قول یہ بھی نقل کیا ہے کہ

ہشام بن محمد کہتے ہیں کہ فلسطین فلیشین بن کسلوخیم کے نام سے موسوم ہے، جو یافث بن نوح علیہ السلام کی اولاد میں سے تھے۔ چنانچہ فلیشین کو بعد میں فلسطین سے بدل دیا گیا۔

فلسطین پر حکومتوں کی تاریخ کا جائزہ

سرزمینِ فلسطین کی تاریخ انسان کی تاریخ کی طرح بہت پرانی ہے۔ اس سرزمین پر حضرت آدم علیہ السلام اور اس کے بعد حضرت نوح علیہ السلام کی اولاد کی بود باش تاریخ سے ثابت ہے۔ البتہ قدیم مصادر میں اس کی تاریخ اجمال کے ساتھ بیان ہوئی ہے، اس سرزمین کی بالکل ابتدائی تاریخ کہ وہاں کس حکومت تھی اس کے متعلق تفصیلی معلومات دستیاب نہیں ہیں۔ عہد نامہ قدیم سے پتا چلتا ہے کہ شروع میں یہاں چھوٹی چھوٹی مستقل حکومتیں تھیں۔ تاریخی اعتبار سے ارضِ فلسطین پر جن قوموں کی حکومت رہی ہے اس کی تفصیل درج ذیل ہے:

فلسطین عرب دور میں

۱) معلوم تاریخ کے مطابق فلسطین کو سب سے پہلے کنعانیوں نے آباد کیا جو بالاتفاق عرب تھے (انھیں عرب بائدہ یعنی قدیم عرب قبائل کہا جاتا ہے)۔ اسی مناسبت سے اس علاقے کا نام "ارضِ کنعان" پڑ گیا۔ کنعانی دور کی ابتدا ۲۵۰۰ قبلِ مسیح سے ہوتی ہے۔ قومِ کنعان فلسطین میں آباد ہوئی تو اس نے ارد گرد کئی شہر آباد کیے۔ انھی میں بیت المقدس بھی تھا۔ اس کا نام انھوں نے "اور و سالم" رکھا جس کا معنی مدینۃ السلام (سلامتی والا شہر) تھا۔ یہی نام بگڑ کر بعد میں یروشلم ہو گیا۔ فلسطین کو جن کنعانیوں نے آباد کیا تھا وہ یَبُوس قبیلے کے لوگ تھے۔ تورات میں عربوں کا ذکر اسی نام سے متعدّد مقامات پر موجود ہے۔ اسی مناسبت سے فلسطین کا ایک نام یَبُوس بھی تھا۔ ابنِ جریر طبری کے بیان کے مطابق کنعانی در اصل عمالقہ کی ایک شاخ تھے۔ جن کا نسب عِملیق بن لَوِذ بن سام بن نوح علیہ السلام سے ملتا ہے۔ انھی کو قرآنِ کریم میں جبّارین کہا گیا ہے۔

فلسطین میں سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی آمد

۲) غالباً ۱۹۰۰ قبلِ مسیح میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے عراق سے فلسطین کی طرف ہجرت کی اور آپ کے ذریعے یہ علاقہ نورِ توحید سے منور ہوا۔ یہاں ابراہیم علیہ السلام کو کسی مخالفت کا سامنا نہیں کرنا پڑا بلکہ یہاں کے بادشاہ کی طرف سے آپ کی پذیرائی کی گئی۔ آپ نے فلسطین میں اس علاقے میں رہائش اختیار کی جسے آج کل الخلیل کہا جاتا ہے۔ آپ علیہ السلام نے اپنے ایک بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو مکہ میں بسایا جہاں انھوں نے کعبہ شریف کو اپنے محترم والد کی سرپرستی میں آباد کیا۔ جبکہ دوسرے فرزند حضرت اسحاق علیہ السلام کو آپ نے فلسطین میں آباد کیا۔ یہیں آپ کے بیٹے یعقوب علیہ السلام (ابراہیم علیہ السلام کے پوتے) پیدا ہوئے۔ ارضِ فلسطین میں یہ بنی اسحاق یا بنی اسرائیل کی ابتدا ہے۔ اور یہ بھی بطورِ حاکم نہیں بلکہ اپنے جدِ امجد حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرح ایک معزز دین دار مہمان کی حیثیت سے جو عرب حاکموں کے مہمان تھے۔

پھر حضرت یوسف علیہ السلام کے عزیزِ مصر بن جانے کے بعد حضرت یعقوب علیہ السلام اپنے اہل و عیال کے ساتھ مصر میں رہائش پذیر ہوئے۔ پھر سینکڑوں سال مصر میں رہنے کے بعد جب فرعون رامسیس (۱۳۰۳ قبلِ مسیح غالباً) کی یہاں حکومت آئی تو اس کی حکومت میں بنی اسرائیل کو غلام بنا لیا گیا۔ پھر بنی اسرائیل حضرت موسیٰ علیہ السلام کی سرکردگی میں مصر سے صحرائے سینا کے راستے فلسطین کی طرف روانہ ہوئے۔ فلسطین میں اس زمانے میں کنعانی عمالقہ کی حکومت تھی۔ مرورِ زمانہ سے وہ اس توحید کو چھوڑ چکے تھے جو اللہ کے نبی ابراہیم علیہ السلام نے انھیں سکھائی تھی۔ لہٰذا عمالقہ سے جہاد کا حکم آیا تو بنی اسرائیل نے پس و پیش سے کام لیا تو اس بزدلی کی وجہ سے وہ چالیس سال تک وادیِ تیہ میں نامراد گھومتے رہے۔ اسی عرصے میں حضرت ہارون علیہ السلام انتقال کر گئے۔ پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کی نئی نسل کو لے کر عمالقہ سے جہاد کے لیے نکلے۔ اس کے نتیجے میں فلسطین کے بعض علاقے فتح ہوئے اور بنی اسرائیل یہاں فلسطین میں آباد ہوئے۔ یہاں جن علاقوں میں وہ آباد رہے انھی میں ان کی حکومت رہی۔

فلسطین میں بنی اسرائیل کی حکومت کا پہلا دور

۳) حضرت موسیٰ علیہ السلام کی رحلت کے بعد حضرت یوشع بن نون علیہ السلام کی قیادت میں ان عبرانیوں نے کنعان، شام اور شرقِ اردن کو فتح کیا یہاں سے عبرانی یعنی بنی اسرائیلی دور کا آغاز ہوا۔ تورات کے مطابق حضرت یوشع بن نون علیہ السلام نے ستائیس سال فلسطین پر حکومت کی۔ لیکن حضرت یوشع بن نون علیہ السلام نہ تو پوری طرح عمالقہ کی قوت توڑ سکے اور نہ ہی یروشلم پر قبضہ کر سکے۔

۴) حضرت یوشع بن نون علیہ السلام کے انتقال کے بعد دین و سلطنت کی ذمے داریاں تقسیم کی گئیں۔ دینی قیادت و سیادت حضرت یعقوب علیہ السلام کے بیٹے 'لاوا' کی نسل میں تھی جبکہ اقتدار 'یہودا' کی اولاد میں تھا۔ حضرت یوشع بن نون علیہ السلام نے سرزمین فلسطین کو یہود کے قبائل میں تقسیم کر کے ان پر ایک ایک قاضی مقرر کیا۔ اس طرح بنی اسرائیل چار سو سال تک فلسطین میں آباد رہے۔ مگر یہاں وہ جس مقصد کے لیے آئے تھے وہ بھول گئے اور طرح طرح کی خرابیوں اور سرکشیوں میں مبتلا ہوئے۔ چنانچہ عیلی کاہن کے دور میں اشدود کی رہنے والی قوم نے بنی اسرئیل پر حملہ کیا اور بنی اسرئیل کو شکست دی اور تابوتِ سکینہ چھین لیا، جس میں تورات کا اصل نسخہ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا بھی شامل تھا۔ اگلے ڈیڑھ سو سال کے لگ بھگ بنی اسرائیلی پھر مغلوب ہی رہے۔

۵) پھر ۱۰۲۰ قبلِ مسیح میں حضرت سموئیل علیہ السلام نے بنی اسرائیل کی خواہش پر سیدنا طالوت کو ان کا بادشاہ مقرر کیا جو بن یامین کی اولاد میں سے تھے، اس لیے باقی بنی اسرائیل نے ان کی قیادت پر اعتراض کیا۔ مگر حضرت سموئیل علیہ السلام کے معجزات کے ظہور نے انھیں بالآخر طالوت کی قیادت تسلیم کرنے پر مجبور کیا۔ چنانچہ ان کی قیادت میں مخالف قوم کے خلاف ایک جنگ لڑی گئی جس میں حضرت داؤد علیہ السلام نے دشمن قوم کے کمانڈر جالوت کو قتل کیا اور اس طرح فلسطین کے سارے علاقے پر سیدنا طالوت کی حکومت قائم ہو گئی۔ سیدنا طالوت کی حکومت صرف سولہ سال (۱۰۲۰ تا ۱۰۰۴ قبلِ مسیح) تک قائم رہی۔

۶) حضرت داؤد علیہ السلام نے جالوت کو قتل کر کے بنی اسرائیل میں ایک امتیازی مقام حاصل کیا اور ان کے دلوں

میں اپنی محبت بٹھا دی۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے انھیں نبوت و خلافت سے نوازا۔ چنانچہ آپ کی حکومت ۱۰۰۴ تا ۹۶۵ قبل مسیح (انتالیس سال) رہی۔ آپ کے بعد آپ کے جلیل القدر صاحب زادے حضرت سلیمان علیہ السلام کو حکومت ملی جس کی نظیر پھر کسی دوسرے بادشاہ کو نصیب نہ ہوسکی۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کی حکومت کا عرصہ ۹۶۵ تا ۹۲۶ قبلِ مسیح (اکتالیس سال) ہے۔

۷)حضرت سلیمان علیہ السلام کے دور کے بعد ان کے بیٹے رحبعام بن سلیمان اور یربعام بن نباط کے درمیان حکومت کے لیے اختلاف پیدا ہوا۔ اس اختلاف کے نتیجے میں مملکت دو ریاستوں میں تقسیم ہوگئی۔ ایک حصے پر رحبعام بن سلیمان نے قبضہ کرلیا اور بیت المقدس اس کا دار الحکومت بنایا گیا، اس ریاست کو یہودا ریاست کا نام دیا گیا۔ جبکہ دوسرے حصے پر یربعام بن نباط نے حکومت قائم کی اور نابلس اس کا دار الحکومت قرار دیا گیا اور اسے بنی اسرائیل ریاست کا نام دیا گیا۔ اس دور کو عہد الانقسام کہا جاتا ہے۔ اس عہد کے بعد بنی اسرائیل آپس کی رقابتوں اور اپنے کرتوتوں کی وجہ سے پھر دشمن کے لیے تر نوالہ ثابت ہوئے۔

۸)اس کے بعد دونوں مملکتوں میں سے ریاستِ بنی اسرائیل جو تقریباً ۲۰۴ برس تک قائم رہی، اس دور میں دو نبی حضرت الیاس علیہ السلام (۷۸۷ تا ۷۴۷ قبلِ مسیح) اور حضرت یسع علیہ السلام (۷۴۷ تا ۷۳۵ قبلِ مسیح) مبعوث ہوئے اور انھوں نے بنی اسرائیل کو سرکشیوں اور نافرمانیوں سے روکنے کی کوشش کی مگر بنی اسرائیل کے بادشاہ نے بجائے اس کے کہ وہ حق کی دعوت کو قبول کرے، اس نے حضرت الیاس علیہ السلام کو زبردستی ملک بدر کردیا۔ اس سرکشی کا نتیجہ یہ نکلا کہ تقریباً ۷۲۲ قبلِ مسیح آشوریوں نے فلسطین پر قبضہ کیا اور ہزاروں یہودیوں کو تہِ تیغ کرتے ہوئے بنی اسرائیل کی ریاست کو تباہ کردیا۔ جبکہ یہودا ریاست نسبتاً کفر و شرک میں کم گرفتار تھی اس لیے خدائی مہلت کی بدولت بدستور قائم رہی۔ مگر اس ریاست میں بھی دو انبیا حضرت یسع اور حضرت یرمیاہ علیہما السلام مبعوث ہوئے۔ انھوں نے قوم کو بداعمالیوں سے اجتناب کرنے کی دعوت دی۔ جب یہاں کے باشندے اپنی بداعمالیوں سے باز نہیں آئے تو شروع میں یہ ریاست ۶۰۳ قبلِ مسیح فراعنۂ مصر کے ہاتھوں تباہ ہوئی اور مصریوں نے اس کو باج گزار ریاست بنا دیا، مگر آخر میں ظالم بادشاہ بختِ نصر اس پر عذاب بن کر ٹوٹ پڑا۔

فلسطین پر بخت ِنصر کی فرماں روائی

۹)۵۸۶ قبلِ مسیح میں عراق کے حکمران بخت ِنصر دوم نے فراعنہ سے شام وفلسطین کی زمین چھین لی۔ اور اس نے ریاست یہودا، جس کا دار الحکومت یروشلم تھا کو فتح کیا اور یہاں کے باشندوں کو قتل کیا اور کئی کو اسیر بنا کر اپنے ساتھ بابل لے گیا۔ جس کی طرف قرآنِ کریم نے سورۂ بنی اسرائیل میں اشارہ کیا ہے کہ: ”چنانچہ جب ان دو واقعات میں سے پہلا واقعہ پیش آیا تو ہم نے تمھارے سروں پر اپنے ایسے بندے مسلط کر دیے جو سخت جنگجو تھے اور وہ تمھارے شہروں میں گھس کر پھیل گئے“۔ اس اسیری کے دور میں حضرت دانیال علیہ السلام مبعوث ہوئے۔

فارسیوں کی سرپرستی میں بنی اسرائیل کی جزوی حکومت

۹) ۵۳۹ قبلِ مسیح میں سائرس اعظم نے بابل سمیت شام اور فلسطین کے پورے علاقے پر قبضہ کر لیا اور جلا وطن یہودیوں کو فلسطین واپس جانے کی اجازت دی۔ یہ یہودیوں کے لیے ایک بار پھر مہلت تھی، تاکہ وہ اپنے اعمال کا جائزہ لیں۔ اس دور میں حضرت عزیر علیہ السلام مبعوث ہوئے، انھوں نے یہاں دوبارہ ہیکلِ سلیمانی تعمیر کیا اور تورات کے مطابق قوم کی اصلاح کی۔

یونانیوں کا دور

۱۰) ۳۳۲ قبلِ مسیح میں مقدونی بادشاہ سکندرِ اعظم نے یہ علاقہ فارسیوں سے چھین لیا اور فارس کی حکومت یہاں سے ختم ہوگئی۔ سکندر کی وفات کے بعد اس کی سلطنت تین حصوں میں تقسیم ہوئی اور شام کا حصہ سلوقی سلطنت کے تحت رہا۔ اس سلطنت کے حکمران انٹیوکس ثالث نے ۱۹۸ قبلِ مسیح فلسطین پر قبضہ جمایا۔ اس نے یہودیوں پر بے انتہا مظالم کیے۔ پھر جب انٹیوکس رابع ۱۷۵ قبلِ مسیح حاکم بنا تو اس نے یہودیوں پر ظلم کی انتہا کر دی اور بیت المقدس میں بت رکھوائے جس کی وجہ سے بنی اسرائیل کے اندر زبردست اشتعال پیدا ہوا اور انھوں نے بغاوت کر دی، جسے مکّابی بغاوت کہا جاتا ہے۔

فلسطین پر دوبارہ بنی اسرائیل کی مستقل حکومت

۱۱) اس بغاوت کے نتیجے میں ان کی آزاد حکومت قائم ہوئی جو ۶۷ قبلِ مسیح تک قائم رہی۔ یہ حکومت ان علاقوں تک بھی پھیل گئی جو حضرت داؤد و سلیمان علیہما السلام کے زمانے میں بھی فتح نہیں ہوئے تھے۔ اپنے مزاج کے مطابق آہستہ آہستہ قومِ یہود آپس کے اختلافات اور دینی بد اعمالیوں کا شکار ہوئی، جس کے نتیجے میں رومیوں نے فلسطین پر قبضہ کر لیا۔

فلسطین پر رومیوں کا تسلط اور بنی اسرائیل کی جزوی حکومتیں

۱۲) ۶۳ قبلِ مسیح میں روم کے حکمران پومپی نے فلسطین پر اپنی حکومت قائم کی، پھر ہیرود نامی ایک یہودی کو یہاں کا حکمران بنا دیا جو رومیوں کے زیرِ سایہ کام کرنے لگا۔ اس کی حکومت فلسطین اور شرقِ اردن پر ۴۰ تا ۴ قبلِ مسیح رہی۔ اس شخص کو ہیرودِ اعظم کہا جاتا ہے۔ اس کے زمانے میں بنی اسرائیل پھر اخلاقی زوال سے دوچار ہوئے۔

۱۳) ہیرود اعظم کے بعد اس کی حکومت تین حصوں میں تقسیم ہوئی، ایک حصے پر ہیرود اعظم کے ایک بیٹے ارخلاؤس، دوسرے حصے پر ہیرود کے دوسرے بیٹے ہیرود اینٹی پاس جبکہ تیسرے حصے پر ہیرود کے تیسرے بیٹے فلپ نے حکومت بنائی۔ پھر کسی وجہ سے ارخلاؤس کی حکومت رومیوں نے واپس لی مگر باقی دو حصوں پر بدستور بنی اسرائیل کی حکومت برقرار رہی۔ اس دور میں بنی اسرائیل کی اخلاقی حالت بری طرح خراب ہوئی اور وہ مختلف روحانی امراض میں مبتلا ہوئے۔ انھیں حکومتوں کے ادوار میں حضرت زکریا، حضرت یحیٰی اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام مبعوث ہوئے۔ مگر یہودیوں نے مذکورہ انبیاے کرام علیہم السلام کو بہت اذیتیں دیں۔ حضرت زکریا اور حضرت یحیٰی علیہما السلام کو شہید کر دیا۔ ان کی شہادت کے بعد وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جان لینے کے درپے ہوئے۔

۱۴) ۴۱ء میں رومیوں نے مذکورہ تمام ریاستوں کو ضم کر کے ہیرود اعظم کے پوتے ہیرود اگرپا کو حکومت سونپ دی۔ مگر اس شخص نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پیروکاروں پر ظلم و جبر کے پہاڑ توڑے۔ اس کے بعد اس کا بیٹا حکمران بنا مگر وہ بھی اپنے باپ کے نقشِ قدم پر چلا۔ چنانچہ انبیاے کرام علیہم السلام سے دشمنی کی پاداش میں اس پر

رومی عذاب کی صورت میں مسلط ہوئے۔

رومیوں کی صورت میں بنی اسرائیل پر عذاب

۱۵)۷۰ء میں طیطس (Titus) رومی نے یہود کو فلسطین سے نکالا، بیت المقدس کو تباہ و برباد کر دیا۔ ہزاروں یہودیوں کا قتل عام ہوا اور ہزاروں کو غلام بنا لیا۔ بعض یہودیوں کو مصر کی کانوں میں کام کرنے کے لیے بھیج دیا گیا۔ یہ وہ سرکشی تھی جسے قرآنِ کریم نے دوسرا وعدہ قرار دیا ہے: ’’چنانچہ جب دوسرے واقعے کی میعاد آئی (تو ہم نے دوسرے دشمنوں کو تم پر مسلط کر دیا) تاکہ وہ تمھارے چہروں کو بگاڑ ڈالیں اور تاکہ وہ مسجد میں اسی طرح داخل ہوں جیسے پہلے لوگ داخل ہوئے تھے اور جس جس چیز پر ان کا زور چلے، اس کو تہس نہس کر کے رکھ دیں‘‘۔ اس ذلت کے بعد رومی دور میں یہودی سرکشی کرتے رہے اور مار کھاتے رہے یہاں تک کہ انھوں نے اسلامی حکومت کی آغوش میں پناہ لے لی۔

فلسطین اور القدس اسلام کے سائے میں

۱۶)مرکزِ توحید اور قبلۂ اول ہونے کی وجہ سے کسی کافر کو بیت المقدس کی تولیت کا حق نہیں ہے۔ جیسے یہودی بوجہِ کفر اس کی تولیت سے محروم اور ان کی جگہ رومی عیسائی یہاں کی تولیت سے سرفراز کیے گئے تھے، اسی طرح نبی آخر الزمان ﷺ پر ایمان نہ لانے کی وجہ سے عیسائی یہاں کی تولیت سے محروم اور محمد اور امتِ محمد ﷺ یہاں کی تولیت کے حق دار ہوئے۔ سفرِ اسرا، مسجدِ اقصیٰ میں جنابِ رسول اللہ ﷺ کا انبیاے کرام علیہم السلام کو امامت کروانا اور کچھ عرصہ بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنا اسی کا مظہر تھے۔ حضورِ اکرم ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں ارضِ مقدس کے حصول کی طرف توجہ دی گئی تھی اور غزوۂ تبوک اور موتہ اس کا ثبوت ہے۔ جنابِ رسول اللہ ﷺ کی رحلت کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت میں حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کی سرکردگی میں فلسطین کے بعض علاقے مثلاً، نابلس، لد وغیرہ مسلمانوں نے فتح کیے تھے، البتہ بیت المقدس کی فتح ۱۶ھ، بمطابق ۶۳۷ء میں دورِ فاروقی میں تکمیل کو پہنچی۔ یہاں کے باشندوں کی درخواست اور صحابۂ کرام کے مشورے

سے خود حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہاں تشریف لائے۔ ایک معاہدے کے تحت بیت المقدس مسلمانوں کے زیرِ حکومت آیا اور پھر اگلی چھے صدیوں تک مسلمانوں کے ہاتھ میں رہا۔

۱۷) خلافتِ راشدہ کے بعد فلسطین کا علاقہ بنوامیہ کی حکومت کے تحت رہا، اس کا دور ۴۰ھ بمطابق ۶۶۱ء سے ۱۳۲ھ بمطابق ۷۵۰ء تک ہے، اس دور میں قبۃ الصخرہ کی تعمیر ہوئی۔

۱۸) بنوامیہ کے بعد بنو عباس ۱۳۲ھ بمطابق ۷۵۰ء سے خلافتِ اسلامیہ پر متمکّن ہوئے، ان کے دور میں فلسطین کا علاقہ ۲۶۵ھ تک بنو عباس کے تحت تھا۔

۱۹) ۲۶۵ھ بمطابق ۸۷۸ء میں والی مصر احمد بن طولون جو خلافتِ عباسیہ کے اضمحلال کے باعث خود مختار حکومت قائم کر چکا تھا اس نے شام و فلسطین پر بھی قبضہ کیا۔ یہ اگرچہ بنو عباس کا خطبہ پڑھتا تھا مگر ان کی حکومت خود مختار ہو چکی تھی۔ یہ حکومت ۲۹۲ھ بمطابق ۹۰۴ء تک رہی۔

۲۰) عباسی خلیفہ مکتفی باللہ نے ۲۹۲ھ بمطابق ۹۰۴ء میں دوبارہ مصر اور شام کو دولتِ طولونیہ سے آزاد کرا کر براہِ راست خلافت کے ماتحت کر دیا۔ پھر یہ علاقہ ۳۲۴ھ بمطابق ۹۳۶ء تک عباسیوں کے زیرِ انتظام تھا۔

۲۱) مصر میں امرا کی کش مکش سے تنگ آ کر عباسی خلیفہ راضی باللہ نے ایک قابل ترک سردار ابوبکر محمد بن طغج کو یہاں کا امیر مقرر کیا، اس کے بعد ۳۲۳ھ میں شام و فلسطین کی ذمے داری بھی انھیں سونپ دی جو "اخشید" یعنی ملک الملوک کے لقب سے مشہور ہوئے۔ دوسری طرف خلیفہ ایک دوسرے سردار محمد بن رائق کو امیر الامراء کے نئے منصب پر فائز کر کے خود امورِ سلطنت سے لاتعلق ہو گیا۔ نتیجہ یہ کہ سلطنت میں طوائف الملوکی پھیل گئی جس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے محمد بن طغج الاخشید نے ممالکِ محروسہ میں ۳۲۷ھ بمطابق ۹۳۹ء میں باقاعدہ خود مختار حکومت قائم کی۔ لہٰذا اب مصر، شام اور فلسطین پر مملکتِ اخشیدیہ قائم ہوئی۔ ۳۳۴ھ بمطابق ۹۴۶ء میں ابوبکر محمد بن طغج کی وفات کے بعد عملاً دولتِ اخشیدیہ پر کافور کی حکمرانی رہی۔

اس حکومت کا خاتمہ ۳۵۸ھ،۹۶۹ء میں عبیدیوں کے ہاتھوں ہوا۔

۲۲) دولتِ اخشیدیہ کے خاتمے کے بعد شروع میں مصر پر عبیدیوں اور فلسطین اور شام پر قرامطہ نے قبضہ کیا۔ قرامطہ نے چھینے ہوئے علاقوں میں فساد برپا کر دیا اور خطبے سے عباسی خلیفہ کا نام نکال دیا گیا۔

۲۳) عبیدیوں (فاطمیوں) نے مصر پر قبضہ مستحکم کرنے کے بعد ۳۶۳ھ بمطابق ۹۷۳ء میں فلسطین کا علاقہ قرامطہ سے چھین لیا۔ عبیدی اس پورے علاقے پر تقریبًا ایک صدی قابض رہے، یہاں تک ۴۶۳ھ، ۱۰۷۰ء میں سلجوق سلطان جلال الدولہ ملک شاہ نے یہ علاقہ عبیدیوں سے چھین لیا۔

۲۴) سلجوق ترکستان کا ایک ترک قبیلہ تھا، اس نے سامانیوں کے زوال کے بعد طبرستان، خوارزم، کرمان، اصفہان، رَے، نیشاپور پر مشتمل علاقوں پر حکومت تشکیل دی۔ طغرل بیگ کو اپنا فرمان روا منتخب کیا اور ۴۴۸ھ میں طغرل بیگ نے بغداد میں بنوبُویہ کی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ اس کے بعد ۴۶۳ھ بمطابق ۱۰۷۰ء میں سلجوق سلطان جلال الدولہ ملک شاہ نے شام اور فلسطین کا علاقہ عبیدیوں سے واگزار کرایا۔

۲۵) یہ وہ زمانہ تھا کہ صلیبی ارضِ مقدسہ کے مختلف شہروں پر غارت گری کر رہے تھے۔ سلجوقی ان کی پیش قدمی روکنے میں مصروف تھے۔ اس وقت جہاں صلیبی افواج مملکتِ اسلامیہ پر حملہ آور تھیں وہاں بدقسمتی سے سلجوقی آپس کے اختلافات کا شکار تھے۔ چنانچہ عبیدیوں نے سلجوقیوں کے آپس کے اختلافات سے فائدہ اٹھا کر صلیبیوں کی مدد سے ۴۹۱ھ بمطابق ۱۰۹۷ء میں بیت المقدس کو دوبارہ ان سے چھین لیا۔

سرزمینِ فلسطین صلیبیوں کے قبضے میں

۲۶) پانچویں صدی ہجری کے آخر میں جب مرکز خلافت انتہائی کمزور ہو چکا تھا، ہر طرف خود مختار حکومتیں قائم ہو رہی تھیں، مسلمانوں کے خلیفہ کا نام صرف خطبے کی حد تک باقی تھا، بلکہ بعض ممالک میں تو اس کا بھی اہتمام نہیں رہا۔ چنانچہ ایسے حالات میں لاطینی چرچ کی سرپرستی میں صلیبی افواج نے شام اور فلسطین کی سرزمین پر کئی بار حملے

کیے۔ شروع میں مختلف مقامات پر ان افواج کو ہزیمت کا سامنا کرنا پڑا، مگر متحدہ قوت نہ ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کو بالآخر کئی علاقوں سے ہاتھ دھونا پڑے۔ صلیبی جنگوں کا یہ سلسلہ جاری رہا یہاں تک کہ بیت المقدس جو عبیدیوں نے حال ہی میں صلیبیوں کی مدد سے سلجوقیوں سے چھینا تھا، اس پر صلیبیوں نے قبضہ کر لیا۔ چنانچہ ۴۹۲ھ بمطابق ۱۰۹۹ء میں قبلۂ اوّل کا سقوط ہوا۔ اس قبضے میں صلیبیوں نے وہی کیا جو موجودہ صہیونی اور امریکی کر رہے ہیں، انھوں نے بے دردی سے ہزاروں مسلمانوں کو شہید کر دیا۔ خواتین، بچوں اور بوڑھوں تک کو معاف نہیں کیا گیا۔ قبۃ الصخرہ پر صلیب نصب کر کے مسجدِ اقصیٰ کو گرجاگھر میں تبدیل کر دیا گیا۔ بیت المقدس پر ناجائز قبضے کے بعد صلیبی فلسطین کے دوسرے علاقوں پر بھی قابض ہوئے، فلسطین کا آخری شہر عسقلان ۱۱۵۲ء تک فاطمیوں کے ہاتھ میں رہا، مگر اس کے بعد صلیبیوں نے یہ بھی چھین لیا۔

سلطان صلاح الدین کی جدوجہد اور فلسطین کی آزادی

۲۷) سلجوقیوں کے بعد شام میں زنگی خاندان کی حکومت قائم ہو چکی تھی جو شام کے دوسرے علاقوں پر صلیبی افواج کے قبضے میں رکاوٹ بنی۔ اس حکومت نے مختلف مواقع پر مسلم مملکت پر صلیبیوں کے حملوں کا بھرپور جواب دیا۔ جب مصر میں عبیدیوں کو اندرونی سازشوں اور فرنگی حملوں نے تنگ کیا تو اس سلطنت کے آخری فرماں روا ابو یوسف العاضد نے سلطان نور الدین زنگی سے مدد طلب کی۔ چنانچہ نور الدین زنگی نے امدادی فوج روانہ کی جس میں ایک کمانڈر صلاح الدین ایوبی بھی شامل تھے۔ صلاح الدین ایوبی نے مصر آکر عاضد کی وزارت قبول کی اور آخر کار عبیدی سلطنت کا خاتمہ کر کے مصر کی حکومت خود سنبھالی۔ اسی طرح سلطان نور الدین زنگی کے انتقال کے بعد شام پر بھی صلاح الدین ایوبی کی حکومت قائم ہو گئی۔ سلطان صلاح الدین مصر آنے سے پہلے ہی فرنگیوں سے کئی دفعہ جنگ کر چکے تھے، جیسے ہی سلطان بنے تو آپ مصر اور شام کے بعد سر زمینِ فلسطین کی طرف متوجہ ہوئے۔ آپ نے کئی معرکوں میں صلیبیوں کا مردانہ وار مقابلہ کیا اور کئی میں فرنگیوں کو زبردست شکست دی۔ ان میں سب سے زیادہ مشہور لڑائی حطین کے مقام پر برپا ہونے والا معرکہ ہے، یہ معرکہ ۵۸۳ھ بمطابق ۱۱۸۷ء کو پیش آیا، جس میں تیس ہزار سے زیادہ صلیبی مارے گئے اور تقریباً

اتنے ہی گرفتار ہوئے۔ مذکورہ لڑائی کے صرف تین ماہ بعد ۵۸۳ھ بمطابق ۱۱۸۷ء میں سلطان صلاح الدین ایوبی نے بیت المقدس کو فتح کرکے صلیبیوں کو فلسطین سے نکال باہر کیا۔ اس کے بعد سرزمینِ فلسطین پر سات صدیوں تک مسلسل مسلمانوں کی حکومت رہی۔ سلطان صلاح الدین ایوبی فتحِ بیت المقدس کے بعد بھی مسلسل صلیبیوں کے خلاف میدان میں رہے، یہاں تک ۵۸۹ھ میں سلطان کی وفات ہوئی۔ سلطان کی وفات کے بعد مملکت ایوبی ان کے بیٹوں کے ہاتھوں میں رہی۔ عہدِ ایوبی کے بعد پھر مملوکوں کا دور آیا۔

۲۸) ۶۵۱ھ بمطابق ۱۲۵۳ء میں اہلیت کی بنیاد پر سلطنت ایوبی کے وارث مملوک قرار پائے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ سلطان صلاح الدین کے بعد ان کے بھائی ملک العادل کچھ اختلافات کے بعد سلطان بنے، ان کے بعد ان کے بیٹے ملک الکامل سلطنتِ ایوبیہ کے وارث قرار دیے گئے۔ ان کے بعد ان کے بیٹے صالح ایوب مسندِ اقتدار پر بیٹھے۔ ان کے دور میں ۱۲۴۹ء میں فرانس کے لوئی نہم نے مصر پر حملہ کیا اور کئی قریبی شہروں پر قبضہ کیا۔ چنانچہ اسی عرصے میں صالح ایوب کا انتقال ہوا۔ صالح ایوب کے بعد ان کی بیوی شجرۃ الدر اور ان کے بیٹے توران شاہ نے حکومت کی ذمے داریاں سنبھالیں۔ انھوں نے مملوکوں کی مدد سے فرانس کی افواج پر ۱۲۵۰ء کو جوابی حملہ کیا۔ مملوک وہ غلام تھے جنھیں ایوبی حکمرانوں نے خرید کر ان کی ایک فوج بنادی تھی۔ چنانچہ انھیں مملوکوں کے کمانڈر رکن الدین بیبرس نے فرانس کی فوج کو شکست دے کر شاہ لوئی کو گرفتار کرلیا۔ اس کے بعد اسے بھاری تاوان کے بدلے رہا کردیا۔ اس کے بعد شجرۃ الدر نے مملوک کمانڈر عزالدین ایبک سے شادی کرلی اور اسے الملک المعز کا لقب دے کر حکمران بنایا۔ عزالدین ایبک کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے نور الدین کو حکمران بنایا گیا مگر کم عمری کے باعث وہ ہر طرف سے دشمنوں میں گھرے ملک کا دفاع نہیں کرسکتا تھا، اس لیے عظیم کمانڈر سیف الدین قطز کو اس کا سرپرست بنادیا گیا۔ چونکہ اس زمانے میں سقوطِ بغداد ہوا تھا اور تاتاری ٹڈی دل کی طرح اسلامی ممالک کو روندے چلے آرہے تھے اس لیے تاتاریوں کے مقابلے میں ایک مضبوط حکمران کی ضرورت محسوس کی گئی۔ اسی ضرورت کے پیشِ نظر سیف الدین قطز کو الملک المظفر کا لقب دے کر نیا حکمران منتخب کیا گیا۔ سیف الدین قطز کا نسبی تعلق عظیم مجاہد شاہ خوارزم جلال الدین کے خاندان سے ہے جن کے خاندان کے کئی افراد کو چنگیز کی

فوج نے ان کی شکست کے بعد قیدی بناکر دمشق میں بیچا تھا۔ چنانچہ سیف الدین قطز بھی ان میں شامل تھے۔ حکمران بننے کے بعد سیف الدین قطز نے ۶۵۸ھ بمطابق ۱۲۶۰ء کو فلسطین کی سرزمین پر نابلس اور بیسان کے درمیانی علاقے عینِ جالوت میں اب تک ناقابلِ شکست تاتاریوں کو تاریخ ساز شکست دی۔ اسی معرکے ہی کی بدولت ہلاکو کے ہاتھوں بغداد میں ختم ہونے والی عباسی خلافت کو دوبارہ مصر میں قائم ہونے کا موقع میسر آیا۔ اس پس منظر میں مملوکوں کی حکومت قائم ہوگئی جو ایک لمبے عرصے تک قائم رہی آخر کار ۹۲۳ھ بمطابق ۱۵۱۷ء میں سلطان سلیم عثمانی کے ہاتھوں ختم ہوئی۔

۲۹) جب سلطان سلیم عثمانی نے ایران کے حاکم اسماعیل صفوی کے خلاف کارروائی کی تو اس نے مملوکوں کے ساتھ مل کر سلطان سلیم کے خلاف محاذ بنانے کی کوشش کی۔ چنانچہ سلطان سلیم عثمانی نے مصر پر حملہ کیا اور مملوکوں کی حکومت کا حجاز، مصر، شام اور فلسطین سے خاتمہ کر دیا۔ ۹۲۳ھ بمطابق ۱۵۱۷ء میں مملوکوں کے آخری حکمران سلطان قانصوہ غوری کے بعد شام و فلسطین کے علاقے پر عثمانی سلطان یاووز سلیم کی حکومت قائم ہوئی۔ چنانچہ اس کے بعد ان سارے علاقوں پر کئی صدیوں تک خلافت عثمانیہ کا کنٹرول رہا۔

فلسطین برطانوی استعمار کے شکنجے میں

۳۰) پہلی جنگ عظیم میں سلطنتِ عثمانیہ نے جرمنی کی حلیف بن کر جنگ میں شکست کھائی۔ اس دوران انگریزوں نے سلطنتِ عثمانیہ کے خلاف آزاد قومیت کے نام سے عربوں اور دیگر اقوام کی جاری تحریکوں کی حمایت بھی جاری رکھی۔ چنانچہ انگریزوں نے جنگی شکست اور علیحدگی پسند سازشوں کے تحت سلطنتِ عثمانیہ کو ٹکڑوں میں تقسیم کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ اس شکست و ریخت کے نتیجے میں، ۱۳۳۶ھ بمطابق ۱۹۱۷ء کو، بیت المقدس اور فلسطین پر انگریزوں نے قبضہ کر لیا۔ بلادِ شام پر انگریزوں کے اس قبضے کا تیس سالہ دور (۱۹۱۷ء تا ۱۹۴۷) عہدِ انتداب کہلاتا ہے۔ یہودی ایک عرصے سے فلسطین میں یہودی آباد کاری اور یہودی ریاست کے قیام کا خواب دیکھ رہے تھے۔ اس سلسلے میں وہ کئی بار سلطان عبد الحمید سے اجازت لینے کی ناکام کوشش کر چکے تھے۔ اب جب فلسطین برطانوی حکومت کے قبضے میں چلا گیا تو یہودی، برطانوی

حکومت کے ساتھ ساز باز کے ذریعے اپنے منصوبوں کی تکمیل میں سرگرم ہو گئے۔ دنیا کے مختلف کونوں کھدروں سے یہود کو لا کر فلسطین میں بسانا شروع کیا۔ اس کے لیے وہ دھونس اور دھاندلی سے مسلمانوں کی زمینوں پر قبضے کے ساتھ، مسلمانوں کو غیر مسلح اور یہودیوں کو مسلح کرتے رہے۔ فلسطینی مسلمان اس دوران جہادی اور سیاسی تحریکات کے ذریعے آزادی کے حصول میں کوشاں رہے لیکن بوجوہ کامیاب نہ ہو سکے اور یہود و نصاریٰ کا گٹھ جوڑ عالمی اداروں کی سرپرستی میں یہودی ریاست کے لیے پیش رفت کرتا رہا۔

عالمی قوتوں کی سرپرستی میں ناجائز ریاست اسرائیل کا قیام

۳۱) برطانوی حکومت نے ۱۹۴۷ء میں ایک سازش کے تحت فلسطین سے انخلا کا اعلان کر کے ایک یہودی ریاست کے لیے راستہ ہموار کیا۔ چنانچہ نومبر ۱۹۴۷ء میں اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی نے فلسطین عربوں اور یہودیوں میں تقسیم کر دیا۔ اس تقسیم میں امریکہ اور فرانس نے بھی صیہونی ریاست کے قیام کے لیے برطانیہ کی بھرپور مدد کی۔ چنانچہ ۱۳۶۷ھ بمطابق ۱۹۴۸ء میں یہودیوں نے اسرائیل کے قیام کا اعلان کر دیا۔ فلسطینی عوام نے آزادی کی جنگ چھیڑی مگر عالمی قوتوں کی مدد سے اسرائیل نے فلسطین کے تقریباً اٹھتر فیصد رقبے پر قبضہ جمایا جبکہ باقی علاقہ جس میں مشرقی یروشلم اور غربِ اردن کے علاقے شامل تھے، اردن کے قبضے میں آ گئے۔ فلسطین کی سرزمین کی آزادی کے لیے ۱۹۶۷ء میں پھر عرب اسرائیل جنگ ہوئی جس کے نتیجے میں فلسطین کے بقیہ حصوں پر بھی اسرائیل نے قبضہ جما لیا۔

پھر ۱۹۹۳ء میں اوسلو معاہدے کے تحت اسرائیلی وزیرِ اعظم یتزاک رابن (اسحاق رابن) اور فلسطین لبریشن آرگنائزیشن (پی ایل او) کے لیڈر یاسر عرفات نے دو ریاستی حل پر اتفاق کیا۔ یعنی پی ایل او نے اسرائیلی اور اسرائیل نے فلسطینی ریاست کو تسلیم کر لیا۔ حالانکہ دو ریاستی فارمولا مسلمانوں کے روایتی موقف کے خلاف تھا۔ اب فلسطین دو حصوں میں تقسیم ہے، ایک بڑے حصے پر ناجائز ریاست اسرائیل قائم ہے جبکہ دوسرے حصے پر جو مغربی کنارے اور غزہ پر مشتمل ہے فلسطینی عوام کی حکومت ہے۔ مغربی کنارے پر فتح پارٹی کی نام نہاد حکومت ہے، یہاں فلسطینیوں کو محدود اختیار کے ساتھ حکومت کرنے کا

اختیار دیا گیا ہے، محمود عباس یہاں کے صدر ہیں۔ یہ حکومت فلسطین اتھارٹی کہلاتی ہے۔ سیکیورٹی کے بہانے یہاں پر اسرائیلی افواج قبضہ جمائے بیٹھی ہیں اور غزہ پر ۲۰۰۷ء سے فلسطینی مزاحمتی تحریک حماس کا کنٹرول ہے۔ موجودہ حماس اسرائیل جنگ کے نتیجے میں غزہ پر بھی اسرائیل کی جارحیت جاری ہے۔

بہر حال، اگر ہم فلسطین کی معلوم تاریخ پر نظر ڈالیں تو اس کی مدت تقریبًا ساڑھے چار ہزار سال بنتی ہے، اس مدت میں اس سرزمین پر مسلمانوں نے بارہ سو چونتیس سال، مسیحیوں نے ساڑھے پانچ سو سال اور یہودیوں نے تقریبًا سات سو سال حکومت کی ہے، یہودیوں کی حکومت اکثر ادوار میں دوسری حکومتوں کی باج گزار ریاست کے طور پر قائم رہی، البتہ کچھ عرصے کے لیے مستقل بھی رہی۔ ان تین حکومتوں کے علاوہ ساڑھے چار ہزار سال میں فلسطین کی سرزمین پر دوسری قوموں نے بھی حکومتیں قائم کیں۔

*****

کتابیات:

الكامل في التاريخ: ابن الأثير الجزري (متوفیٰ:٦٣٠ھ)

معجم البلدان، شهاب الدين أبو عبد الله ياقوت الحموي (متوفیٰ:٦٢٦ھ)

آثار البلاد و أخبار العباد، زكريا بن محمد بن محمود القزويني (متوفیٰ:٦٨٢ھ)

خطط الشام، محمد بن عبد الرزاق كُرْد علي (متوفیٰ:١٣٧٢ھ)

قصص القرآن، مولانا محمد حفظ الرحمن سيوهاروي (متوفیٰ:١٣٨٢ھ)

القدس و المسجد الأقصىٰ، دكتور محمد علي البار

القضية الفلسطينية، دكتور محسن محمود صالح

مولانا عبد الغفور صدیقی
استاذ فقہ اکیڈمی

آزادیِ فلسطین کی جدوجہد

برطانوی استعمار سے قیامِ ریاست تک

۱۱، دسمبر ۱۹۱۷ء کو پہلی عالمی جنگ کے دوران برطانوی فوجیں جنرل ایلن بی کی قیادت میں بیت المقدس پر قابض ہوئیں۔ جبکہ اس سے پہلے مئی ۱۹۱۶ء میں برطانیہ اور فرانس نے "معاہدہ سایکس پیکو" کے ذریعے ممکنہ فتح کی صورت میں مشرقِ وسطیٰ کے عثمانی علاقوں کی تقسیم کا فارمولہ طے کر لیا تھا جس کے تحت فلسطین برطانوی مینڈیٹ کا حصہ قرار پایا تھا۔ اس کے بعد ۲، نومبر ۱۹۱۷ء کو برطانوی وزیرِ خارجہ بالفور نے یہودیوں کو فلسطین میں یہودی ریاست کے قیام کی تحریری یقین دہانی کروادی تھی۔ چنانچہ فلسطین پر برطانوی قبضے کے ساتھ ہی فلسطین میں یہودی آمد اور یہاں زمین ہتھیانے کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ دراصل بین الاقوامی منصوبہ سازوں نے دیگر عرب ممالک کی طرح فلسطین میں بھی سلطنتِ عثمانیہ کے خلاف عوام میں قوم پرستی کے جذبات کو خوب ابھارا۔ "فلسطین فلسطینیوں کے لیے" اور وحدت، ترقی و مساوات کے نعرے اس دور میں زبان زدِ عام رہے۔ اور ساتھ ساتھ برطانیہ نے دیگر عرب ممالک کی طرح فلسطینیوں سے بھی بہت سے خوش نما وعدے کیے تھے۔ انھوں نے یہ مشہور کر دیا تھا کہ امیر فیصل نمائندہ بھیجیں گے اور شہر ان کے حوالے کر دیا جائے گا۔ اس لیے یہاں برطانوی قبضے اور تسلط کو کسی حد تک مقامی حمایت بھی حاصل تھی۔

فلسطینیوں کی آزاد ریاست کے لیے ابتدائی کوششیں

برطانوی قبضے کے بعد، بدلتے حقائق کے تناظر میں فلسطینیوں پر جب انگریزوں کی عیاری و مکاری واضح

ہونے لگی تو انھوں نے اپنی آزاد ریاست کے لیے جدوجہد کا آغاز کیا۔ مفتی کامل حسینی، امین حسینی، شیخ موسیٰ کاظم، عارف دجانی اور دیگر مذہبی وسیاسی رہنماؤں نے ایک انجمن تشکیل دی جس کے پلیٹ فارم سے برطانوی حکومت کو فلسطین سے متعلق اس کے وعدے یاد دلائے جاتے رہے۔

فلسطین کانفرنسیں اور وفود

بیت المقدس میں ۱۹۲۸ء تک مسئلۂ فلسطین سے متعلق سات کانفرنسوں کا انعقاد ہوا جن میں یہودی آبادکاری روکنے اور آزاد فلسطینی ریاست کے قیام کے مطالبے ہوئے۔ فلسطینیوں نے کئی احتجاجی مظاہرے اور ہڑتالیں بھی کیں۔ ساتھ ساتھ حجاز اور دیگر اسلامی شہروں میں مسئلۂ فلسطین کے متعلق اسلامی نقطۂ نظر کی وضاحت کے لیے وفود بھی روانہ کیے گئے۔ ۱۹۲۰ء تک یہ مظاہرے پرامن رہے۔ ۱۹۲۰ء میں پرامن مظاہرین پر انگریزی و یہودی گروہ نے حملوں کا آغاز کر دیا۔ القدس میں مظاہرین پر پہلے حملے میں دو درجن کے قریب مسلمان شہید اور تقریباً تین سو مسلمان زخمی ہوئے۔ اس کے نتیجے میں ۱۹۲۱ء میں فلسطین میں پہلی بغاوت ہوئی۔ یہ بغاوت یافا سے پھوٹی اور جلد رملہ، لُد اور دیگر شہروں تک پھیل گئی۔ یہودیوں اور انگریزوں پر تابڑتوڑ حملے ہوئے۔ یہ حملے ایک ہفتے تک جاری رہے، اس دوران چار سو کے قریب یہودی اور برطانوی مارے گئے۔ اس بغاوت کو بہت سختی سے کچلا گیا۔ کئی مسلمان شہید اور بہت سے پابندِ سلاسل ہوئے۔

انقلابِ بُرّاق

۱۹۲۹ء میں دیوارِ براق کے مقدس مقام پر یہودی قبضے کی کوشش پر مسلمانوں کا ایک بڑا اجتماع یہودیوں پر حملہ آور ہوا، بہت شدید جھڑپیں ہوئیں۔ یہ جنگ قدس سے باہر دوسرے مقامات تک پھیل گئی، درجنوں یہودی ہلاک ہوئے۔ یہودیوں کو مسلمانوں کے غیظ وغضب سے بچانے کے لیے برطانوی فوج نے مداخلت کرتے ہوئے اسلحے اور طیاروں کا استعمال کیا۔ سو کے قریب مسلمان شہید اور پانچ سو سے زیادہ زخمی ہوئے۔ اس واقعے کو انقلابِ براق کا نام دیا گیا۔ برطانوی عدالت نے اس بغاوت پر بہت سے عرب

نوجوان رہنماؤں کو پھانسی دی جن میں مشہور نوجوان رہنما محمود جمجوم، فواد حجازی اور عطاء الزید بھی شامل تھے۔ تین رہنماؤں کو جلاوطن کیا گیا اور سینکڑوں لوگ جیل میں سالوں تشدد کا نشانہ بنے۔ براق واقعے کے بعد شمالی فلسطین میں جماعة الكف الأخضر کے نام سے پہلی مسلح جہادی تنظیم قائم ہوئی۔

۱۹۳۱ء میں عمومی اسلامی کانفرنس کا انعقاد ہوا۔ یہ عظیم کانفرنس بیت المقدس میں منعقد ہوئی، اس میں اسلامی ممالک سے ایک سو پینتالیس مندوبین شریک ہوئے۔ اس کانفرنس میں ہندوستان سے علامہ محمد اقبال اور مولانا شوکت علی بھی شریک تھے۔ اس کانفرنس میں پچیس ارکان پر مشتمل مجلسِ عاملہ فلسطین قائم کی گئی۔ اسی طرح مسلمانوں کے سائنسی علوم وفنون میں ترقی کے لیے علی دباغ کی قیادت میں شبان المسلمین نامی تنظیم قائم کی گئی۔ ۱۹۳۱ء میں نابلس کانفرنس منعقد ہوئی جس میں باقاعدہ اعلانِ جہاد کیا گیا۔ یہ کانفرنس مسلمان نوجوانوں کو جنگی تربیت دینے اور عسکری مراکز قائم کرنے کے لیے بلائی گئی تھی۔ جہاد کے لیے چندہ جمع کرنے کی خاطر صندوق الاُمۃ قائم کیا گیا۔ یہودی ہجرت روکنے کے لیے حفاظتی دستوں کا قیام اور یہودی مارکیٹ کے بائیکاٹ جیسی انقلابی تجاویز منظور ہوئیں۔ اسی سال مفتی امین الحسینی نے الجہاد القدس نامی مسلح تنظیم بھی قائم کردی۔ اسی سال بڑی سیاسی جماعت الحزب العربی الفلسطینی قائم ہوئی جس کے صدر جمال حسینی تھے۔ ۱۹۳۳ء میں شیخ موسیٰ کاظم کی قیادت میں القدس میں مظاہرہ ہوا۔ اس پرامن مظاہرے پر انگریزوں نے گولی چلائی جس میں پینتیس مسلمان شہید اور سو سے زیادہ زخمی ہوئے۔ اسی طرح یافا میں مظاہرین پر فائرنگ ہوئی اور ساٹھ مسلمان شہید اور سو زخمی ہوئے۔

شیخ عزالدین القسام رحمۃ اللہ علیہ کی جہادی تحریک

۱۹۳۵ء میں فلسطین کی سب سے مؤثر، منظم اور طاقتور جہادی تحریک شروع ہوئی جسے شیخ عزالدین قسام نے شروع کیا۔ امام عزّالدین قسام رحمۃ اللہ علیہ بلند پایا عالمِ دین اور عظیم انقلابی رہنما تھے۔ فلسطین آنے سے قبل آپ شام میں فرانسیسی فوج اور لیبیا میں اٹلی کی فوج کے خلاف بھی برسرِپیکار رہے تھے۔ شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے فلسطین میں یہودی اور انگریزی سازشوں کا پردہ چاک کیا۔ مختلف علاقوں میں پیغام رسانی کے ذریعے دعوتِ جہاد دی

اور لوگوں میں انقلابی روح پھونکی۔ آپ اور آپ کے تربیت یافتہ کارکنان نے پورے فلسطین میں جذبۂ جہاد کو پروان چڑھایا۔ آپ کا منصوبہ یہ تھا کہ تربیت یافتہ مجاہدین تیار کر کے حیفا پر حملہ کیا جائے اور وطنی حکومت قائم کی جائے۔ اس مقصد کے لیے آپ نے جبلِ جنین میں ایک تربیتی مرکز قائم کیا۔ انگریز پہلے بھی آپ سے شدید خوف زدہ تھے۔ اس صورتِ حال کے پیشِ نظر انھوں نے آپ کی تحریک کو ختم کرنے کے لیے فلسطین میں پھیلی افواج کو حیفا بلا لیا اور آپ کی تحریک کے خلاف بھرپور فوجی آپریشن کا آغاز ہو گیا۔ زبردست مقابلے کے بعد برطانوی افواج نے شیخ اور ان کے مجاہدین کا محاصرہ کر لیا۔ محاصرے کے بعد آپ سے ہتھیار ڈالنے کا مطالبہ کیا گیا اور معافی دینے کی یقین دہانی کروائی گئی لیکن آپ نے ظالم افواج کے ہاتھوں قید ہونے کو گوارا نہ کیا اور دیوانہ وار لڑتے ہوئے جامِ شہادت نوش کر گئے۔ شیخ کا جسدِ خاکی جب حیفا لایا گیا تو عوام کا سمندر امڈ آیا۔ بہت بڑے عوامی جلوس میں آپ کو حیفا سے یاجور لایا گیا، اس دوران عوام نے کئی پولیس اسٹیشنوں پر دھاوا بولا۔ فلسطین کے دور دراز علاقوں کی مساجد میں بھی آپ کی غائبانہ نمازِ جنازہ ادا کی گئی۔ چالیس روز تک تربیتی اجتماع ہوتے رہے اور عوام نے آپ کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے آپ کے ادھورے خواب پورے کرنے کا عزم کیا۔ شیخ عزالدین قسام کا فلسطین میں قیام بہت مختصر رہا لیکن اس دوران آپ نے انقلاب کی جو مشعل روشن کی وہ بعد کے تمام ادوار میں رہنما ثابت ہوئی۔ شیخ عزالدین قسام کی تحریک سے عوامی رجحان میں واضح تبدیلی رونما ہوئی۔ انگریز اور یہودیوں کے خلاف شدید نفرت اور غیظ و غضب کے دور کا آغاز ہوا۔ پورے فلسطین میں یہودی املاک اور انگریزی تنصیبات پر حملے شروع ہو گئے۔ ۱۹۳۶ سے ۱۹۳۷ء کے درمیان یہودیوں اور انگریزوں پر چھے ہزار سے زیادہ حملے ہوئے۔ اسی سال قدس کانفرنس میں سول نافرمانی تحریک کا بھی اعلان ہوا۔ اسی سال پیل کمیشن کے تحت فلسطین کی تقسیم کا آغاز ہوا لیکن اس سے حالات مزید کشیدہ ہو گئے۔ فرحان سعدی، فخری عبدالہادی، شیخ عبدالرحیم، عبدالقادر حسینی اور شیخ عطیہ نے مختلف محاذوں پر قیادت کی۔

گول میز کانفرنس اور دوسری عالمی جنگ کا آغاز

فلسطین میں انگریزوں اور یہودیوں کے خلاف مسلمانوں کی مزاحمت اتنی بڑھ گئی کہ برطانیہ نے مجبور

ہو کر لندن میں اس مسئلے کے حل کے لیے ۱۹۳۹ء میں ایک کانفرنس بلائی لیکن اسی دوران دوسری عالمی جنگ کا آغاز ہو گیا۔ یہ جنگ یہودیوں کے لیے غنیمت ثابت ہوئی کیونکہ فلسطین میں یہود کے خلاف مسلمانوں کا غیظ و غضب اس حد تک بڑھ چکا تھا کہ یہود اس کی تاب لانے سے عاجز آ چکے تھے۔ اس عالمی جنگ میں یہودیوں نے انتہائی اہم اقدامات کیے جو آئندہ اسرائیلی ریاست کے قیام کے لیے بنیاد ثابت ہوئے۔ مثلاً یہود نے برطانیہ کی حمایت کرتے ہوئے اس کے لیے اپنے خزانوں کا منہ کھول دیا، اس کے ساتھ افرادی قوت اور جاسوسی خدمات پیش کر کے وزیرِاعظم چرچل سے تیس لاکھ یہودیوں پر مشتمل اسرائیلی ریاست کے قیام کا وعدہ لیا، یہودی افواج کی تشکیل و ترتیب کی منظوری لی گئی۔ اس دوران دنیا کے مختلف ممالک کے فوجی یونٹوں کے ساتھ یہودی ملٹری یونٹ بھی قائم کیا گیا اور پہلی بار یہودی جھنڈا لہرایا گیا۔ یہ یہود کی اہم تاریخی کامیابی تھی۔

۱۹۳۶ء سے ۱۹۳۹ء کے دوران فلسطین میں ایمرجنسی نافذ کر دی گئی۔ اس دوران یہودیوں نے برطانیہ اور مشرقی یورپ کے عسکری ماہرین کی مدد سے مسلح تنظیمیں قائم کیں جن میں یہ چار انتہائی اہم ہیں: ہاگاناہ: یہ ستر ہزار افراد پر مشتمل فوج تھی جو اعلیٰ فوجی تربیت اور جدید اسلحے سے لیس تھی۔ شیٹرن گروپ: یہ تین سو کمانڈوز پر مشتمل اسپیشل آپریشن فورس تھی۔ ارگن فورس: یہ اہم اہداف کے حصول کے لیے چھے ہزار خصوصی فوجیوں پر مشتمل گروپ تھا۔ پولیس فورس: یہ دس ہزار افراد پر مشتمل پولیس فورس تھی جو فوج ہی کی طرح تربیت یافتہ تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ فلسطین میں اسلحہ فیکٹریاں قائم کی گئیں۔ یورپ اور دیگر ممالک سے اسلحہ اور دیگر ضروری سامان کی فلسطین میں رسائی یقینی بنائی گئی۔

یہود کا فلسطین میں کھلی جنگ اور قبضے کا اعلان

۱۹۴۲ء میں نیویارک یہودی کانفرنس میں یہودیوں کی طرف سے فلسطین میں کھلی جنگ اور مکمل قبضے کا اعلان کیا گیا۔ دوسری عالمی جنگ میں شرکت کر کے عالمی فیصلہ سازی میں نمایاں مقام حاصل کرنے کے بعد امریکہ بھی یہودیت کے لیے پوری طرح مہربان ہوا۔ ہولوکاسٹ کے پرچار کے ذریعے یہودیوں نے مظلومیت کا لبادہ اوڑھ کر عیسائی ممالک کی خوب ہمدردیاں سمیٹیں۔ ہر طرف سے یہودیت کے لیے عسکری

تعاون کے دروازے کھل گئے۔ یہودی فلسطین میں گروہ در گروہ داخل ہونے لگے۔ اب فلسطین کی سرزمین فلسطینیوں پر تنگ کرنے کا ہولناک عمل شروع ہوا، مسلمان بستیوں میں دھماکے ہونے لگے۔ فلسطینیوں سے زبردستی علاقے خالی کروا کر ان پر قبضہ ہونے لگا، ہر طرف قتل غارت گری شروع ہوگئی۔ مسلمانوں کے تجارتی مراکز بھی دھماکوں سے لرز اٹھے، سازش کے تحت چند برطانوی تنصیبات کو بھی نشانہ بنایا گیا اور پولیس ہیڈکوارٹرز پر حملے ہوئے۔ ۱۹۴۴ء میں حیفا، تل ابیب اور قدس شہر کے تمام امیگریشن دفاتر کو بموں سے اڑا دیا گیا، زمینوں کی رجسٹریشن کے دفاتر بھی تباہ کر دیے گئے۔

کنگ ڈیوڈ ہوٹل پر یہودی حملہ

۲۲ جولائی ۱۹۴۶ء کو یہودی دہشت گرد تنظیم ارگن نے القدس میں قائم کنگ ڈیوڈ ہوٹل کے بڑے حصے کو دھماکے سے تباہ کر دیا۔ یہ القدس میں سب سے خوفناک دھماکہ تھا۔ اس تنظیم کے ارکان ہوٹل کے عرب ملازمین کے روپ میں ہوٹل میں داخل ہوئے، جو اپنے ساتھ دودھ کے خالی ڈبوں میں ۳۵۰ کلوگرام دیسی ساختہ بارودی مواد لائے تھے جس کو انھوں نے ہوٹل کے ایک گودام میں نصب کیا۔ اس دھماکے سے ہوٹل کا جنوبی حصہ مکمل تباہ ہو گیا اور سو کے قریب افراد مارے گئے جن میں اٹھائیس برطانوی، اکتالیس عرب، سترہ یہودی اور پانچ غیر ملکی شامل تھے۔ جبکہ ساٹھ سے زیادہ افراد معذور اور زخمی ہوئے۔ اس دھماکے سے پورا قدس شہر دہشت زدہ ہو گیا۔

بلاد الشیخ کا قتلِ عام: ۳۱، دسمبر ۱۹۴۷ء کو حیفا کے قریب بلاد الشیخ میں صہیونیوں نے ایک اجتماعی قتلِ عام میں پچاس فلسطینی شہید کر دیے۔

الغرض ۱۹۴۲ تا ۱۹۴۸ء فلسطین میں یہودیوں کی تاریخی دہشت گردی جاری رہی۔ ۱۹۴۴ء میں قاہرہ میں عرب لیگ کانفرنس میں فلسطین کے حق میں قرارداد منظور ہوئی لیکن برطانیہ نے اس کو حد سے تجاوز قرار دے کر مسترد کر دیا۔ ۱۹۴۶ء میں اینگلو امریکہ تحقیقاتی کمیشن قائم ہوا۔ اس کمیشن نے ایک لاکھ یہودیوں کی فلسطین ہجرت اور ان کے لیے اراضی کے حصول کی سفارش کی جس پر تمام عرب اور فلسطینیوں نے شدید

ردِ عمل ظاہر کیا، شیخ حسن البنا اور قائدِ اعظم محمد علی جناح نے بھی اس کو سنگین جرم قرار دیا۔

مسئلۂ فلسطین اقوامِ متحدہ میں

۱۹۴۶ء میں آخری لندن کانفرنس ہوئی جس میں تمام عرب وزراے خارجہ شریک ہوئے لیکن فلسطین کا کوئی نمائندہ نہیں تھا۔ اس کانفرنس میں برطانیہ نے "موریسن منصوبے" کے تحت فلسطین کو چار حصوں میں تقسیم کرنے کی بات کی جس کو عرب لیگ سمیت سب نے رد کیا۔ امریکہ نے تمام منصوبے رد کرکے اینگلو امریکہ کمیشن کی سفارشات من وعن نافذ کرنے کا مطالبہ کیا اور امریکی صدر ہیری ٹرومین نے برطانیہ کو مسئلۂ فلسطین سے ہاتھ کھینچنے پر مجبور کیا۔ بالآخر برطانیہ نے مسئلۂ فلسطین اقوامِ متحدہ میں پیش کردیا۔ اپریل ۱۹۴۷ء میں اقوامِ متحدہ نے گیارہ ممالک کے نمائندوں پر مشتمل کمیشن قائم کیا۔ اس کمیشن نے اکثریت کے فارمولے کے تحت فلسطین کو تین حصوں میں تقسیم کردیا۔ جسے اقوامِ متحدہ سے قرارداد نمبر ایک سو اکیاسی کے تحت منظوری حاصل ہوگئی۔ اس کمیشن کے تحت تقسیم کا نقشہ یہ تھا:

عرب ریاست: یہ مصر کی سرحد کے ساتھ ساحلی علاقے، نابلس کے پہاڑی علاقے، مغربی جلیل، اسدود، قدس کے پہاڑ اور منطقۂ خلیل شامل تھا۔ اس کا رقبہ چار ہزار چار سو چھہتر مربع میل تھا۔ یہاں یہودیوں کی تعداد صرف دس ہزار اور عربوں کی تعداد ساڑھے سات لاکھ سے متجاوز تھی۔

یہودی مملکت: اس میں مشرقی جلیل، ابنِ عامر کے زرخیز علاقے، بڑا ساحلی علاقہ اور نقب شامل تھا۔ اس کا رقبہ پانچ ہزار آٹھ سو ترانوے مربع میل تھا۔ اس علاقے میں یہودی آبادی چار لاکھ اٹھانوے ہزار اور عرب آبادی چار لاکھ ستانوے ہزار تھی، یعنی یہودی صرف ایک ہزار زیادہ تھے۔

بین الاقوامی علاقہ: اس میں قدس، بیتِ لحم اور قدس کے اندر باہر کے مذہبی مقامات تھے۔ یہ کل رقبے کا صفر اعشاریہ پینسٹھ (۰٫۶۵) فی صد تھا۔ یعنی اس منصوبے کے تحت کل فلسطین کا ستاون اعشاریہ پینتیس (۵۷٫۳۵) فی صد علاقہ یہودیوں کے لیے مختص تھا۔ بیالیس فی صد علاقہ مسلمانوں کے لیے مختص تھا اور ۰٫۶۵ فی صد اقوامِ متحدہ کے زیرِ انتظام۔ عرب لیگ نے اس منصوبے کو رد کرتے ہوئے اپنے سابقہ اجلاسوں

میں پیش کی گئیں خفیہ تجاویز پر عمل شروع کر دیا، جن کے تحت شام میں عسکری کیمپوں کا قیام، رضا کاروں کی بھرتی، عرب حکومتوں سے اعانتوں کا حصول، فلسطینی مجاہدین کو اسلحے کی فراہمی اور عرب فوجوں کو براہِ راست حملے کی تجویز جیسے اقدامات شامل تھے۔ دراصل اپریل ۱۹۴۷ء میں جب برطانیہ مسئلۂ فلسطین اقوامِ متحدہ میں لے گیا۔ اہلِ فلسطین نے اسی وقت جہاد کا اعلان کر دیا تھا۔ دیگر عرب شہروں سے بھی مجاہدین فلسطینیوں سے آملے تھے۔ اب مسلمان اپنی سرزمین کے دفاع کے لیے کمربستہ ہو گئے۔

جہادِ آزادی کے مشہور معرکے

معرکۂ ظہرالحجہ: صرف چند بندوقوں کے ساتھ یہاں فلسطینی مجاہدین نے دس گنا بڑے لشکر کا مقابلہ کر کے اس مقام پر قبضہ کر لیا۔ چالیس سے زیادہ یہودی مارے گئے۔

معرکۂ کفرکنا: اس معرکے میں تو مجاہدین یہودیوں کو بھگاتے ہوئے کرم الزیتون تک لے گئے، یہاں بھی درجنوں یہودی واصل جہنم ہوئے۔

معرکۂ عینِ باہل (جنوری ۱۹۴۸ء) میں ایک درجن سے زیادہ یہودی مارے گئے۔

معرکۂ دھیشۃ: اس مقام پر جدید اسلحے سے لیس ایک بڑے فوجی دستے کو مسلمانوں نے گھیر لیا۔ انگریزی مدد کے باوجود مسلمان غالب آئے۔ تیس یہودی قتل ہوئے اور درجنوں نے مسلمانوں کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔

معرکۂ قسطل: جب یہودی افواج نے اپریل ۱۹۴۸ء میں قسطل شہر پر حملہ کیا تو مجاہدین نے ثابت قدمی کے ساتھ مقابلہ کیا اور آگے بڑھ کر یہودی بستیوں کا محاصرہ کر لیا۔ محاصرے کے دوران مجاہدین کے پاس اسلحے کا ذخیرہ ختم ہو گیا، عبدالقادر حسینی نے مدد کے لیے دیگر علاقوں میں کئی پیغام بھیجے لیکن کوئی مدد نہ ملی۔ آخر یہ شہر مجاہدین کے ہاتھ سے نکل گیا۔ یہاں عبدالقادر حسینی درجنوں مجاہدین کے ساتھ جامِ شہادت نوش کر گئے۔

حسن سلامہ کی قیادت میں مجاہدین نے تل ابیب پر بھی حملے کیے۔ رأس العین، رملہ اور لُد میں بھی شدید جنگ ہوئی جن میں حسن سلامہ اپنے سینکڑوں مجاہدین کے ساتھ رأس العین میں لڑتے ہوئے شہید ہو گئے۔

یافا کا معرکہ: اسی مہینے یافا میں بھی یہودی افواج نے چڑھائی کی اور حسبِ معمول یہاں بھی مجاہدین نے سر دھڑ

کی بازی لگائی لیکن اسلحے کی قلت آڑے آگئی اور یہ شہر بھی مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکل گیا۔اس معرکے میں آٹھ ہزار سے زیادہ مجاہدین نے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا،اس میں الاخوان المسلمون کے بھی سینکڑوں مجاہدین شہید ہوئے۔اس کے علاوہ حیفا اور عکا میں بھی زبردست مقابلہ ہوا۔ مجاہدین خون کے آخری قطرے تک لڑے لیکن اسی مہینے یہ دو شہر بھی مکمل یہودی قبضے میں چلے گئے۔اس کے بعد ایک کے بعد ایک شہر مجاہدین کے ہاتھ سے نکلتا رہا۔

معرکۂ کفار عصیون: ۱۲، مئی ۱۹۴۸ء میں الخلیل اور بیتِ لحم کے درمیان اس علاقے میں فلسطینیوں نے اردنی فوج کی مدد سے صہیونیوں کو شکست دے کر پورے علاقے سے ان کا صفایا کردیا۔ ۱۳۰ سے زیادہ یہودی مارے گئے۔

مسلمانوں کے جنگی وسائل

عرب لیگ نے اپنی منصوبہ بندی کے مطابق فلسطینیوں کو جو ہتھیار فراہم کیے وہ صرف چار ہزار بندوقیں تھیں۔ یہ سب پرانی تھیں اور ان میں سے بھی کئی ناکارہ نکلیں۔اور جو کارتوس فراہم ہوئے ان کا بھی یہی حال تھا کہ دورانِ معرکہ گولیاں ناکارہ ہوجاتیں۔اس امداد کے علاوہ فلسطینیوں کے پاس توڑے دار بندوقیں تھیں اور مختلف معرکوں میں انگریزوں اور یہودیوں سے چھینا ہوا کچھ اسلحہ تھا۔ مجاہدین کے مالی حالات بھی دگرگوں تھے۔کئی محاذوں پر تو حالت یہ تھی کہ خوراک کی رسائی بھی نہیں تھی۔ مسلمان اپنے گھروں سے کھانا پکا کر مجاہدین کو دیتے تھے۔ان معرکوں میں مجاہدین کے بھوک پیاس سے نڈھال ہونے کے کئی واقعات ذکر ہوئے ہیں۔نیز عرب لیگ کا چندہ سات لاکھ مصری کرنسی سے آگے نہیں بڑھا اور ستم یہ کہ یہ رقم بھی پوری طرح فلسطینیوں تک نہ پہنچ سکی۔اس کے باوجود فلسطینی مجاہدین کی پامردی واستقامت کے سامنے یہودیوں کو اپنی شکست کے آثار نظر آنے لگ گئے تھے،چنانچہ ایک موقعے پر تو یہودیوں کے واویلا مچانے پر امریکہ بھی پریشان ہوکر پورے ملک پر اقوامِ متحدہ کی عمل داری کی تجویز پر آرہا تھا۔حالات کی تبدیلی کی بنیادی وجہ فلسطینیوں کی بے سروسامانی تھی۔امریکہ، برطانیہ اور مشرقی یورپ سے اسلحہ اور جدید جنگی سازوسامان سے بھری کشتیاں تل ابیب کی بندرگاہ پر لنگر انداز ہوتی رہیں۔روس، پولینڈ اور امریکی جنگی ماہرین یہودیوں کو برابر تربیت دیتے

رہے۔ لیکن عرب کی طرف سے فلسطین کو مالی امداد ملی اور نہ اسلحہ فراہم ہوا۔ اس کے باوجود جہاد جاری رہا۔

۱۹۴۸ء کی جنگ النکبۃ

نومبر ۱۹۴۷ء کو اقوامِ متحدہ سے یہودی ریاست کی منظوری کے ساتھ ہی یہودیوں نے امریکہ اور برطانیہ کی سرپرستی میں بڑے پیمانے پر فلسطینی مسلمانوں کا قتلِ عام[1] شروع کردیا، نسل کُشی کے انتہائی منظم واقعات شروع ہوگئے اور مسلمانوں کی پوری پوری بستیوں کو برباد کیا جانے لگا۔

دیریاسین کا قتلِ عام: اس علاقے کے مکین ایک معاہدے کے تحت جنگ سے دور رہے تھے۔ یہ لوگ یہودیوں کے خلاف جنگی کارروائیوں میں شریک نہیں ہوئے اس کے باوجود یہاں کے نہتے لوگوں کا قتلِ عام ہوا، یہاں پانچ سو لوگوں کو قتل کیا گیا۔ جن میں اکثر خواتین بچے اور بوڑھے تھے، ان کی لاشیں مثلہ کرکے کنویں میں ڈال دی گئیں۔

طنطورہ کا قتلِ عام: ۲۲، مئی ۱۹۴۸ء: جنوبی حیفا میں طنطورۃ کے علاقے میں یہودیوں کے ہاتھوں اجتماعی قتلِ عام میں دو سو فلسطینی شہید ہوئے۔

بستی ناصر الدین کا قتلِ عام: مسلمانوں کی اس بستی میں بھی قتلِ عام ہوا۔ ڈیڑھ سو سے زیادہ مرد و خواتین اور بچے بے دردی سے شہید کردیے گئے۔ لُد اور رملہ میں مسلمان بچوں کو بے دردی سے ذبح کیا گیا، نسل کُشی کی بھیانک مہم پورے ملک میں زور و شور سے جاری رہی۔ مسلمان خواتین کی آبروریزی اور نوجوانوں کی مسخ شدہ لاشیں ملنے کے واقعات معمولی بات تھی۔ جنگ سے دور رہنے والی بستیوں کا جب یہ حال ہوا تو جو لوگ جنگ میں شریک تھے ان بستیوں کا کیا انجام ہوا ہوگا اندازہ کرلیجیے۔

۱۹۴۸ء میں برطانیہ نے فلسطین سے دست برداری اور یہودی ریاست کے قیام کا اعلان کیا اور اپنی فوجوں کو واپسی کا حکم دیا۔ اس کے ایک دن بعد ۱۴، مئی کو یہودی رہنما ڈیوڈ بن گوریان نے اسرائیلی ریاست

---

[1] قتلِ عام ایک جنگی اصطلاح ہے جس سے مراد عام شہریوں کا قتل ہے جو جنگ میں شریک نہیں ہوتے۔ مقتولین تھوڑے ہوں یا زیادہ، عام شہریوں کا قتل، قتلِ عام کہلاتا ہے۔

کے قیام کا اعلان کردیا۔اس دوران سات لاکھ سے زیادہ مسلمانوں کو جبر وتشدد سے اپنے گھروں اور اپنی زمینوں سے نکال کر ہمیشہ کے لیے بے دخل کردیا گیا، ان ہی لاکھوں معصوم و بے گناہ جلاوطنوں کی سرزمین پر نئی ریاست قائم ہوئی۔

عرب اتحاد کا فلسطین پر حملہ

اسرائیلی ریاست کے قیام کے اعلان کے فوراً بعد عرب لیگ کی فوجوں نے طے شدہ پروگرام کے تحت مقبوضہ فلسطین پر حملہ کردیا۔عرب اتحاد کا یہ لشکر لبنان، شام، عراق، اردن اور مصر کی افواج پر مشتمل تھا۔ سعودی فوج کا ایک چھوٹا سا دستہ مصری فوج کے ماتحت ہوکر شامل تھا۔عرب افواج کو جنگ کے ابتدائی ایام میں زبردست فتوحات ملیں۔میدانِ جنگ کا نقشہ یہ تھا: مصری فوج غزہ، بئرِ سبع اور نقب میں یہودی بستیوں کی طرف بڑھی، اسی فوج کے ایک حصے نے خلیل اور دوسرے نے یافا کی طرف پیش قدمی کی۔مصری فوج کے ایک حصے نے رضاکاروں کے ساتھ القدس کے محاصرے میں بھی حصہ لیا۔عراقی فوج نے جنین پر قبضہ کیا۔یرموک کی بعض یہودی بستیاں بھی اس کے قبضے میں آگئیں۔عراقی فوج کے ایک دستے نے نابلس اور طولکرم کی طرف بھی پیش قدمی کی۔شامی فوج نے سمخ پر قبضہ کیا اور بناتِ یعقوب پل سے گزرتی ہوئی طبریہ تک پہنچ گئی۔اردنی فوج نے اریحا اور قدیم قدس پر قبضہ کیا۔رملہ اور لُد بھی اس کے حملوں کی زد میں رہے۔مئی کے آخر تک ہر طرح سے اس جنگ میں عربوں کا پلڑا بھاری رہا۔یہودی بستیاں ان کے حملوں کی زد میں رہیں۔تل ابیب کی ناکہ بندی کردی گئی۔اس سنگین صورتِ حال پر یہودیوں کے پشت پناہ متحرک ہوگئے۔برطانیہ اور امریکہ نے سلامتی کونسل پر دباؤ ڈال کر جنگ روکنے اور پرامن حل کی تلاش کے لیے قرارداد منظور کی۔عجیب بات یہ کہ عرب لیگ کی سیاسی کمیٹی نے بھی اس کو فوری قبول کرلیا۔اس طرح ۱۱، جون ۱۹۴۸ء کو چار ہفتوں کی جنگ بندی عمل میں آئی۔یہ جنگ بندی دراصل اسرائیل کو سنبھل کر دوبارہ منظم ہونے کے لیے ایک ماہ کی مہلت تھی۔چنانچہ یہی ہوا کہ سب سے پہلے اسرائیل نے حیفا کی برطانیہ کی طرف سے خالی کردہ بندرگاہ پر قبضہ کیا، اس طرح اسرائیل نے یورپ اور دیگر ممالک سے اسلحہ

اور فوجی سازوں سامان حاصل کیا۔ اس میں جدید فوجی طیارے بھی شامل تھے، یورپی ممالک کے ٹریننگ کیمپوں سے تازہ دم یہودی فوج بھی اسرائیل آگئی۔ اس دوران قدس کا وہ محاصرہ بھی ختم ہوگیا جہاں ایک لاکھ یہودی اس طرح محصور تھے کہ وہ عن قریب ہتھیار ڈال کر اپنے آپ کو مسلمانوں کے حوالے کرنے والے تھے۔ جنگ بندی کے دوران عرب افواج کے لیے سامان کی ترسیل کا عمل کمزور پڑگیا۔ چار ہفتے کی جنگ بندی کے بعد ۹، جولائی کو دوبارہ جنگ کا آغاز ہوا تو حالات یکسر مختلف تھے۔ اب عرب افواج کے سامنے نئے وسائل سے لیس تازہ دم اسرائیلی فوج تھی جس نے انتہائی جارحانہ انداز میں جنگ کا آغاز کیا، عرب ٹھکانوں پر بھاری توپ خانوں سے شدید شیلنگ ہونے لگی۔ اسرائیلی فضائیہ نے ہر طرف بمباری شروع کردی۔ مزید دباؤ بڑھانے کے لیے اسرائیلی فضائیہ نے فلسطین سے باہر عرب شہروں قاہرہ، دمشق اور عمّان پر بھی بمباری کردی، اس جارحیت سے عرب افواج سکتے میں آگئیں۔ اسی دوران ایک حیرت انگیز معاملہ یہ ہوا کہ بعض عرب افواج کو اپنی کمان کی جانب سے علاقے خالی کرنے کا حکم دیا گیا جیسے اردنی فوج کو رملہ اور لُد، عراقی فوج کو رأس العین اور مرج ابنِ عامر اور رضاکاروں پر مشتمل مجاہدین کی جماعت جیشِ انقاذ (عرب لبریشن آرمی) کو مغربی جلیل خالی کرنے کا حکم ہوا۔ ۱۵، جولائی ۱۹۴۸ء کو چھے روز جنگ کے بعد اقوامِ متحدہ کی سلامتی کونسل میں جنگ بندی کی قرداد پیش ہوئی۔ جس کو اسرائیل نے اپنے ریاستی استحکام کے لیے فوری قبول کرلیا۔ اس دوران اسرائیل نے شمالی فلسطین میں مزید علاقوں پر قبضہ کرلیا۔

دوائمہ کا قتلِ عام

دوائمہ ایک فلسطینی گاؤں ہے جو الخلیل شہر سے چوبیس کلو میٹر غزہ کی سمت واقع ہے۔ یہاں ۱۹۴۸ء میں فلسطینی مسلمانوں کا ہولناک قتلِ عام ہوا جو فلسطینی تاریخ کے قتلِ عام کے بڑے واقعات میں سے ایک ہے۔ اس قتلِ عام کی تفصیلات کو طویل عرصے تک خفیہ رکھا گیا۔ دوائمہ اور آس پاس کے لوگ یہودیوں کے خلاف جہاد میں شامل رہے۔ ۱۹۴۸ء کی جنگ میں اِن علاقوں میں مصری فوج داخل ہوئی تھی۔ جب عرب اسرائیل جنگ بندی ہوئی اور مصری فوج پر بھی پوری طرح قابو پاکر اسے محصور کر دیا گیا تو اسرائیلی فوج نے

الخلیل سے غزہ تک کے علاقوں میں مقامی بستیوں کے خلاف فوجی آپریشن کا آغاز کر دیا۔ لوگوں کو شدید مظالم کا نشانہ بنا کر ان سے علاقے خالی کروائے جانے لگے۔ بیتِ جبرین، القبیبہ اور دیگر کئی علاقوں سے بھی لوگ یہودی مظالم سے بھاگ کر دوائمہ میں آ گئے۔ اسرائیلی افواج جب دوسرے علاقوں سے فارغ ہوئیں تو اب دوائمہ پر بھی قتلِ عام کے سیاہ بادل منڈلانے لگے۔ ان حالات میں دوائمہ کے لوگوں نے چند بندوقوں، ڈنڈوں، پتھروں اور کلہاڑیوں سے مسلّح دو سو افراد پر مشتمل حفاظتی جماعت اس علاقے کی حفاظت کے لیے تعینات کی۔ اور اسرائیلی پیش قدمی روکنے کے لیے گاؤں سے باہر پتھروں کے ڈھیر لگا کر ان پر نوجوان تعینات کر دیے۔ ۲۹، اکتوبر ۱۹۴۸ء کو دوائمہ کے لوگ جمعے کی نماز سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ دس ہزار اسرائیلی فوجیوں نے ٹینکوں اور بھاری توپ خانے سے اس علاقے پر حملہ کر دیا۔ پورے علاقے پر شدید گولہ باری کے بعد گاؤں کا محاصرہ کر لیا گیا۔ خصوصی دستے گاؤں کے اندر داخل ہوئے۔ ستر سے زیادہ گاؤں کے بزرگ افراد نے گاؤں کی مسجد میں پناہ لی جن کو وہیں مسجد کے اندر شہید کر دیا گیا۔ ڈنڈوں سے بچوں کی کھوپڑیاں توڑ دی گئیں۔ خواتین کی گود سے بچے چھین کر زمین پر پٹخ دیے گئے۔ کئی بوڑھی خواتین، معذور افراد اور بچے الزاغ نامی غار میں جا چھپے جن کو اسی غار کے اندر قتل کر دیا گیا۔ ان کی تعداد نوے کے قریب تھی۔ گھروں کو بموں سے اڑا دیا گیا جس سے لوگ ملبے تلے دب کر شہید ہوئے۔ تین دن تک قتلِ عام جاری رہا جس کے بعد اسرائیلیوں نے لاشوں کو کنوؤں اور غاروں میں ڈال کر ان کے منہ بند کر دیے اور کچھ لاشوں کو آگ لگا دی گئی۔ اُس وقت اس قتلِ عام کی تفصیل چھپائی گئی تھی اور صرف یہ اطلاعات تھیں کہ پچاس سے ساٹھ لوگ شہید ہوئے جو مزاحمت کار تھے۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی لرزہ خیز داستانیں منظرِ عام پر آتی گئیں۔ بالخصوص دوائمہ کے ان افرد کے ذریعے جو بچ کر محفوظ مقامات پر پہنچے۔ ۱۹۸۷ء میں اسرائیلی مؤرخ بینی مورس نے اپنی کتاب میں اس بابت ایک یہودی فوجی کا خط نقل کیا جس کے بعد تحقیقات سے پتا چلا کہ اس قتلِ عام میں ایک ہزار سے زیادہ فلسطینی شہید ہوئے۔ ۱۹۴۸ء میں یہ علاقہ مکمل تباہ کر دیا گیا اور ۱۹۵۵ء میں اس کے کھنڈرات پر امازیہ نامی یہودی بستی قائم ہوئی۔ یہ وہ قتلِ عام ہے جس کا ۱۹۴۸ء کے اجتماعی قتلِ عام کی عمومی فہرست میں ذکر نہیں لیکن بعد کی تحقیقات نے اس قتلِ عام کو بھیانک ترین قرار

دیا۔ ۱۹۴۸ء میں اجتماعی قتلِ عام کے پچاس سے زیادہ واقعات ہوئے جن میں ہزاروں فلسطینی شہید ہوئے۔

ایلابون کا قتلِ عام: ۳۰، اکتوبر ۱۹۴۸ء: طبریہ کے قریب ایلابون گاؤں میں پچاس فلسطینی شہید کیے گئے جن میں اکثریت خواتین، بوڑھوں اور بچوں کی تھی۔

دائمی صلح

نومبر ۱۹۴۸ء میں اقوامِ متحدہ نے ایک قرار داد منظور کی جس میں اسرائیل اور عرب ممالک سے مستقل امن کے قیام کے لیے باہم مذاکرات منعقد کرنے کا کہا گیا۔ چنانچہ اقوامِ متحدہ کے نمائندے ڈاکٹر بنش کی موجودگی میں عرب اور اسرائیل کے درمیان یونانی جزیرے روڈس میں مذاکرات ہوئے۔ یہ مذاکرات بنیادی طور پر تین اہم نِکات پر مرکوز رہے: (۱) عرب افواج کا انخلا (۲) سرحدی حد بندی (۳) مستقل جنگ بندی۔ آخر تمام متعلقہ عرب ممالک نے الگ الگ مذاکرات کے بعد اسرائیل سے دائمی صلح کا معاہدہ کر لیا۔

(۱) مصر: مصر نے جنوری ۱۹۴۹ء میں یہ معاہدہ کیا جس کے تحت فالوجہ سمیت تمام علاقوں سے مصری افواج کے انخلا کا طریقہ طے کیا گیا۔ واضح رہے کہ دوسری جنگ بندی سے پہلے اور بعد مصری افواج شدید دباؤ میں آ گئی تھیں اور بہت سے علاقوں میں محصور ہو گئی تھیں۔ اس کے علاوہ مصر اور اسرائیل کے درمیان سرحد کی تعیین بھی کی گئی۔ ان مذاکرات کے دوران ہی اسرائیل خلیجِ عقبہ کے ساتھ نقب کے ساحلی علاقے پر بھی قبضہ کر چکا تھا۔ اس لیے ایلات کی بندرگاہ سمیت یہ پورا علاقہ اسرائیلی ریاست کا حصہ قرار پایا۔ غزہ کی پٹی پر مصری عمل داری تسلیم کر لی گئی۔

(۲) لبنان: لبنان نے ۲۳، مارچ ۱۹۴۹ء کو اسرائیل سے معاہدہ کیا۔ اس معاہدے میں لبنان کو وہ تیرہ دیہات واپس کر دیے گئے جن پر اسرائیلی فوج نے دورانِ جنگ قبضہ کر لیا تھا۔

(۳) اردن: اردن نے ۳، اپریل ۱۹۴۹ء کو اسرائیل کے ساتھ دائمی امن معاہدے پر دستخط کیے۔ اس معاہدے میں اسرائیل نے اردن کو اپنی اکثر جگہوں پر برقرار رکھا، ساتھ ہی ان علاقوں پر قبضے کی اجازت دی جو پہلے عراقی فوج کے قبضے میں آ گئے تھے۔ اس طرح نابلس اور جنین سمیت مغربی کنارہ اور مشرقی یروشلم

اردنی عمل داری میں آ گئے۔ جبکہ باقی علاقوں سے اردنی افواج کا انخلا ہو گیا۔ اور ساتھ اردن اور اسرائیل کے درمیان سرحد کی وضاحت بھی کر دی گئی۔

(۴) شام: شامی صدر نے اس معاہدے پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا۔ اس لیے وہاں فوجی بغاوت کے ذریعے صدر شُکری القوتلی کو معزول کر دیا گیا اور نئے فوجی سربراہ جنرل حسینی زعیم نے بھی اس معاہدے کو قبول کر لیا۔ اس معاہدے کی رو سے شام نے طبریہ کے مسلم آبادی والے علاقے اسرائیل کے لیے خالی کر دیے۔ اور اسرائیل نے گولان کی پہاڑیوں پر شامی عمل داری تسلیم کر لی۔ باقی فلسطین کا تمام علاقہ اسرائیلی ریاست کہلایا۔ فلسطین کے نام سے فلسطینیوں کی اپنی ریاست کا کہیں نام ونشان نہ تھا۔ اور اس پاک سرزمین کی اسی فیصد آبادی اپنے گھروں سے بے گھر اور اپنے علاقوں سے بے دخل کی جا چکی تھی۔

*****

کتابیات:

حركة المقاومة الإسلامية، علي الجربادي، مجلة الدراسات الفلسطينية،۱۹۹۳ء

الانتفاضةوالمقاومةوالعمليات الاستشهادية،ماجد كيالي، مجلة الدراسات الفلسطينية،۲۰۲۰ء

المقاومة الفلسطينية بين غزة و لُبنان و الانتفاضة: محمد خالد الأزعر، مركز دراسات الوحدة العربية، بيروت

المقاومة الفلسطينية،مؤسسة الدراسات الفلسطينية

قائمة العمليات العسكرية،مؤسسة الدراسات الفلسطينية

قائمة أهم الأحداث الفلسطينية، مؤسسة الدراسات الفلسطينية

كـي لا ننسـى قُـرى فلسـطين التـي دمَّرتهـا إسـرائيل١٩٤٨ء،وليـد الخالـد، مؤسسة الدراسات الفلسطينية

بلادنا فلسطين،مصطفى مراد الدّباغ، مؤسسة الدراسات الفلسطينية

المجازر الإسرائيلية بحق الشعب الفلسطينية،محسن صالح، مريم غشباني،بيروت

تاريخ العرب الحديث،أحمد عزت عبد الكريم،دار النهضة العربية

الكفـاح المسـلم و البحـث عـن دولـة الحركـة الوطنيـة الفلسـطينية، يزيـد صائغ، مؤسسة الدراسات الفلسطينية

حرب العصابات في فلسطين، صبحي ياسين، دار الكتاب العربي، مصر

الطريق إلى القدس، محسن صالح، مكتبة الزيتونة، بيروت

تاريخ فلسطين، تيسير جباره، دار الشروق، عمان، أردن

شہرِ قدس تہذیبی چیلنج کے نشانے پر، مترجم: عبدالحمید اطہر ندوی، ادارہ احیاے علم، لکھنؤ

جہادِ آزادی کی نئی منزل فلسطین، شمیم فیضی، کمیونسٹ پارٹی پبلی کیشنز

المیۂ فلسطین، محمود جاوید، کتب خانہ جمہوریہ، کراچی

مسئلۂ فلسطین، ایڈورڈ سعید، مترجم شاہد حمید

الشرق الأوسط مجلة٢٠١٠ء

وفا نیوز ایجنسی فلسطین

الجزيرة عربي

بي بي سي عربي

بی بی سی اردو

https://www.palestine-studies.org/ar

ڈاکٹر جاوید اقبال
معروف دانش ور، فرزندِ علامہ اقبال

علامہ اقبال کا سفرِ فلسطین

اقبال اور غلام رسول مہر کی ٹرین بہنا، رز قازق اور اسماعیلیہ میں ٹھہرتی ہوئی تین گھنٹوں کے بعد قنطرہ پہنچی۔ اسماعیلیہ کے اسٹیشن پر پنجابی مسلمانوں کا ایک گروہ اقبال کے خیر مقدم کے لیے موجود تھا۔ جب گاڑی چلی تو انھوں نے زندہ باد کے نعروں سے اقبال کو رخصت کیا۔ قنطرہ کے مقام پر ٹرین بدلنا پڑی۔ یہاں سے گاڑی خان یونس، غزہ اور مجدل کے ریگستانی علاقے سے گزر کر لد پہنچی۔ لد میں انھوں نے پھر ٹرین بدلی اور اب گاڑی بحرِ روم کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے پہاڑی علاقہ کی طرف مڑگئی۔ ۲، دسمبر ۱۹۳۱ء کو صبح ساڑھے نو بجے اقبال بیت المقدس (یروشلم) پہنچے۔ بارش جاری تھی۔ اسٹیشن پر ان کے استقبال کے لیے مفتی سید امین الحسینی، مولانا شوکت علی اور مؤتمر اسلامی کے منتظمین موجود تھے۔ مؤتمر اسلامی کے اجلاس حرمِ مقدس کے متّصل روضتہ المعارف کی عمارت میں منعقد ہو رہے تھے۔ اس لیے مندوبین کو اس کے قریب مختلف ہوٹلوں میں ٹھہرایا گیا۔ بعض حضرات پیلس ہوٹل (فندق بلاس) میں مقیم ہوئے۔ بعض جن میں مولانا شوکت علی، مولانا شفیع داؤدی اور رؤف پاشا شامل تھے، روضتہ المعارف ہی میں ٹھہرے۔ اقبال اور غلام رسول مہر کا قیام گرینڈ ہوٹل (فندق مرقص) میں تھا۔ ۶، دسمبر ۱۹۳۱ء تک بیش تر مندوب بیت المقدس پہنچ گئے تھے۔ یہ مؤتمر مفتی سید امین الحسینی اور ان کے رفقا کی طرف سے اتحادِ اسلامی کے نصب العین کی تحصیل کی خاطر منعقد کی گئی تھی اور اس کی دعوت کسی اسلامی حکومت نے نہ دی تھی۔ اس مؤتمر میں بیش تر اسلامی ممالک اور تقریبا ہر اہم اسلامی خطے کے نمائندوں نے شرکت کی۔ مراکش، ریف، الجزائر، تیونس، نائجیریا، سوڈان، مصر، طرابلس، شام، عراق، شرق اردن، فلسطین، حجاز، یمن، حضرموت، ایران، ترکی، چینی ترکستان، روسی ترکستان، بخارا، قفقاز، ایرال، اورال، یوگوسلاویہ، ہندوستان، سیلون اور جاوا کے مسلم نمائندے شرکت کے

لیے جمع ہوئے تھے۔ ان میں اربابِ علم، اہلِ سیاست اور بزرگانِ دین بھی تھے اور مجاہدینِ حریت بھی۔

مؤتمر کا تعارفی اجلاس ۶، دسمبر ۱۹۳۱ء کو شام چار بجے روضتہ المعارف کے وسیع و عریض ہال میں ہوا۔ اس وقت خوب بارش ہو رہی تھی۔ اجلاس کی کارروائی ایک گھنٹے تک جاری رہی۔ جس میں مندوبین کو ایک دوسرے سے متعارف کرایا گیا۔ کارروائی کے اختتام پر دیگر مندوبین کے ساتھ اقبال بھی رضا کاروں کی معیت میں مسجدِ اقصیٰ کی طرف روانہ ہوئے۔ رضا کار مل کر عربی زبان میں قومی نغمے گاتے جا رہے تھے۔ رستے میں مولانا محمد علی جوہر کی قبر پر اقبال رک گئے۔ فاتحہ پڑھی اور پھر مسجدِ اقصیٰ پہنچے۔ مغرب کی نماز وہیں ادا کی۔ نماز کے بعد مسجدِ اقصیٰ میں محفلِ اِسرا منعقد ہوئی جس میں قرآنِ کریم کی تلاوت اور نعت خوانی کی گئی، چند اصحاب نے آیاتِ اسرا کی تفسیر بیان کی۔ محفل کے اختتام تک نمازِ عشا کا وقت ہو گیا تھا اور مسجد اس وقت پوری طرح بھر چکی تھی۔ سب نے نمازِ عشا پڑھی۔ فراغت کے بعد مفتی سید امین الحسینی نے اپنا افتتاحی خطبہ پڑھتے ہوئے فرمایا: اس مؤتمر کے انعقاد کا مقصد ہے کہ ہم کسی امت یا دین پر دراز دستی کرنا چاہتے ہیں نہ ہی ہم کسی سے مخاصمت پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ بلکہ ہمارا مقصد تو یہ ہے کہ مسلمان یک جان اور یک آہنگ ہو کر اپنے مصالح کے لیے جدوجہد کریں۔ بعد ازاں انھوں نے مؤتمر کے مقاصد کی تفصیل یوں بیان کی: مسلمانوں کے اتحاد و تعاون کے لیے جد و جہد، صحیح اسلامی اخوت کی نشو و نَما، مسلمانوں کو اجتماعی اسلامی فرائض کی طرف متوجہ کرنا اور دینِ اسلام کو عوارض سے بچانا، عقائد کو الحاد سے محفوظ رکھنا اور اسلامی تمدن کی اشاعت کرنا۔

ان کے بعد اقبال سمیت بعض مندوبین نے مختصر تقاریر کیں اور داعیانِ مؤتمر کی مساعی کا شکریہ ادا کیا۔ آخر میں مصر کے ڈاکٹر عبدالحمید سعید بے نے برکتِ مقام کے پیشِ نظر اراکین سے التماس کی کہ سب کھڑے ہو کر اللہ تعالیٰ سے عہد کریں کہ وہ مقاماتِ مقدسہ کی حفاظت کے لیے اپنی جانیں تک قربان کر دیں گے۔ اس پر سب نے کھڑے ہو کر عہد کیا اور اللہ اکبر کے فلک شگاف نعروں کے ساتھ یہ تقریب رات کے دس بجے اختتام پذیر ہوئی۔

۷، دسمبر ۱۹۳۱ء کو مؤتمر کا اجلاس شروع ہوا۔ عارضی صدر اور سیکرٹریوں کے انتخاب کے لیے اہلِ عرب کے اصول پر عمل کیا گیا۔ یعنی مجمع میں سب سے معمر شخص صدر منتخب ہوئے۔ اور سب سے کم عمر دو

مندوب، سیکرٹریوں کے طور پر چنے گئے۔ مفتی سید امین الحسینی کو مستقل صدر کی حیثیت سے اتفاقِ رائے سے منتخب کیا گیا۔ اقبال، محمد علی پاشا (مصر) سید ضیاء الدین طباطبائی (ایران) اور سید محمد زبارہ (یمن) نائب صدر منتخب ہوئے۔ پھر سیکرٹریوں کا انتخاب عمل میں آیا۔ انتخابات سے فراغت کے بعد دنیائے اسلام سے مبارک باد کے تار اور پیغامات پڑھ کر سنائے گئے۔ بعد ازاں مولانا شوکت علی کی تجویز پر عمل کرتے ہوئے سات کمیٹیوں کا تقرر ہوا جنھیں خصوصی مسائل کے بارے میں رپورٹیں اور قراردادیں ترتیب دینے کی ہدایات کی گئیں۔ وہ کمیٹیاں یہ تھیں: حجاز ریلوے کمیٹی، مسجدِ اقصیٰ کمیٹی، نشر واشاعت کمیٹی، تبلیغِ دین کمیٹی، اماکنُ المقدّسہ کمیٹی، قانونِ اساسی کمیٹی اور مالی کمیٹی۔

اقبال نے مؤتمر کے اجلاسوں میں ۷، دسمبر ۱۹۳۱ء سے لے کر ۱۴، دسمبر ۱۹۳۱ء تک شرکت کی اور اس دوران میں پانچ کمیٹیوں کی رپورٹوں یا پیش کردہ قراردادوں پر اپنی رائے کا اظہار کیا۔ مثلاً حجاز ریلوے کمیٹی کی سفارش تھی کہ حجاز ریلوے وقفِ اسلامی ہے اور اسے مختلف غیر اسلامی حکومتوں کے قبضے سے نکال کر ایک بین الاقوامی مسلم مجلسِ انتظامیہ کی تحویل میں لانے کے لیے اقدامات کرنے چاہییں۔ مسجدِ اقصیٰ کمیٹی کی سفارش تھی کہ بیت المقدس میں تعلیم کے لیے ایک ایسی یونیورسٹی قائم کی جائے جو تمام عالمِ اسلام کے مسلم طلبہ کو غیر ملکی یونیورسٹیوں سے بے نیاز کر دے۔ اقبال کو اس یونیورسٹی کے قیام سے اختلاف تھا۔ وہ کسی ایسی قدیم طرز کی یونیورٹی کے قیام کے خلاف تھے جس میں صرف علومِ دینیہ کی تعلیم دی جائے۔ ان کی رائے میں ایسی یونیورسٹی میں جدید و قدیم دونوں قسم کے علوم کی دورِ جدید کے تقاضوں کے مطابق تعلیم دینا ضروری تھا۔ دوم، ان کے خیال میں تجویز ناقابلِ عمل تھی کیونکہ یہ توقع نہ رکھی جاسکتی تھی کہ عالمِ اسلام کے تمام مسلم طلبہ تعلیم کی خاطر صرف اس یونیورسٹی کی طرف رجوع کریں گے۔ سو ان کی نظر میں تعلیمی اعتبار سے بیت المقدس کو وہ اہمیت حاصل نہ تھی جو مدینہ منورہ، قاہرہ، تہران اور دمشق کو حاصل تھی۔ نیز بیت المقدس میں صیہونی خطرہ بھی تھا جو شہر کے امن وسکون کو ختم کر سکتا تھا۔

مالی کمیٹی کی سفارشات زیادہ تر روپیہ اکٹھا کرنے کے لیے وسائل کے متعلق تھیں۔ نشر و اشاعت کمیٹی کی تجاویز عربی اور دیگر زبانوں میں رسائل کے اجراء، اخبارات میں مضامین کی اشاعت، کتب کی تالیف اور

لیکچروں کے اہتمام وغیرہ کے متعلق تھیں۔ اماکن المقدسہ کمیٹی کی تجاویز یہ تھیں: تمام عالمِ اسلام میں یہودیوں کے مال کا بائیکاٹ کرنا۔ فلسطینی مسلمانوں کو صیہونی قرضوں سے نجات دلانے کے لیے فلسطین میں زرعی بینک کا قیام عمل میں لانا۔ عالمِ اسلام کو صیہونی خطرے کی شدت سے آگاہ کرنا۔ فلسطین میں یہودیوں کی آمد اور دیوارِ گریہ کمیشن کی سفارشات کی مخالفت کرنا وغیرہ۔

ان کمیٹیوں کی رپورٹوں اور قراردادوں کے علاوہ اسلام کے دیگر مسائل پر بھی بحثیں ہوئیں اور ان کے حل کی تدبیر پر غور کیا گیا۔ اس زمانے میں دنیاے اسلام کے بیش تر ملکوں پر یورپی نوآبادیاتی طاقتوں یا سوویت روس کا تسلط تھا۔ اس لیے مراکش، الجزائر اور تیونس کے مندوبین نے تو فرانسیسی حکام کی چیرہ دستیوں کی تفصیل بیان کی اور روسی ترکستان کے نمائندگان نے اشتراکی روس کے ظلم وستم کی داستانیں سنائیں۔

بیت المقدس میں اپنے قیام کے دوران میں اقبال نے مسلم یتیموں اور مزدوروں کی درس گاہ دارالایتام اور اس کے مختلف شعبوں کا معائنہ کیا اور فلسطینی بوائے اسکاؤٹوں کے عربی قومی گیت سنے۔ ایک شب مسلم طلبہ نے فتحِ اندلس کے موضوع پر ڈرامہ پیش کیا۔ جسے دیکھ کر اقبال بہت خوش ہوئے۔ حاضرین نے اصرار کیا کہ اقبال بھی اپنے اشعار سنائیں۔ سو موقعے کی مناسبت سے انھوں نے طارق فاتحِ اندلس سے متعلق اپنے چند فارسی اشعار سنائے جن کا عربی ترجمہ ایک عراقی مجتہد نے کیا۔

بیت المقدس میں عربوں اور یہودیوں کے تعلقات نہایت کشیدہ تھے۔ حکومتِ برطانیہ صیہونیوں کی امداد کر رہی تھی اور ان کی بے پناہ دولت کے سبب مقامی فلسطینی غریب مسلمان ان کا مقابلہ نہ کر سکتے تھے۔ ساحلی مقامات اور دیگر مراکز پر قبضے کے بعد فلسطین کی تجارت وزراعت پر یہودی بڑی سرعت کے ساتھ حاوی ہوتے چلے جا رہے تھے۔ یہودیوں نے مؤتمر کی بھی مخالفت کی لیکن مفتی سید امین الحسینی کی ہمت سے مؤتمر نہ صرف منعقد ہوئی بلکہ کامیاب بھی رہی۔

اقبال نے بیت المقدس میں مختلف مقاماتِ مقدسہ کی زیارت میں کچھ وقت گزارا۔ جبلِ زیتون جہاں ایک روایت کے مطابق حضرت عیسی علیہ السلام نے وعظ کیا تھا، حضرت مریم علیہا السلام کا روضہ، بستانِ جسمانیہ جہاں حضرت عیسی علیہ السلام کو گرفتار کر دیا گیا، حضرت زکریا اور حضرت داؤد علیہما السلام کے فرزند کی قبریں، بیت المقدس شہر کے

دروازے اور دیگر مقامات کی زیارت کی۔ اقبال نے ۱۴، دسمبر ۱۹۳۱ء تک مؤتمر کے اجلاسوں میں شرکت کی۔ قانونِ اساسی کمیٹی اور تبلیغِ دین کمیٹی کے اجلاسوں میں شریک نہ ہوسکے، کیونکہ وہ ان کی روانگی کے بعد منعقد ہوئے۔ ۱۴، دسمبر ۱۹۳۱ء کی شام کو انھوں نے مؤتمر کے مندوبین سے الوداعی خطاب کیا۔ خطبہ انگریزی میں تھا لیکن اس کا عربی ترجمہ ساتھ ساتھ عبدالرحمٰن عزام کرتے گئے۔ اقبال نے فرمایا: "افسوس کہ میں مؤتمر کے اختتام تک نہیں ٹھہر سکتا اور مجھے اس کا بھی افسوس ہے کہ عربی زبان پر پوری قدرت نہ ہونے کے سبب مباحث میں بھی زیادہ حصہ نہ لے سکا۔ میری آرزو ہے کہ ایک مرتبہ پھر مقاماتِ مقدسۂ اسلامیہ فلسطین کی زیارت کروں جو انبیا کی سرزمین ہے۔ میں آپ لوگوں کو اس روحِ اخوت و مودت پر مبارک باد پیش کرتا ہوں جس کا مظاہرہ مسلسل ہوتا رہا۔ ہم پر واجب ہے کہ اپنے نوجوانوں کو سلامتی کی راہ پر چلائیں۔ اسلام کو اس وقت دو طرف سے خطرہ ہے: ایک الحادِ مادی کی طرف سے اور دوسرا وطنی قومیت کی طرف سے۔ ہمارا فرض ہے کہ ان دونوں خطروں کا مقابلہ کریں اور میرا یقین ہے کہ اسلام کی روح ان دونوں خطروں کو شکست دے سکتی ہے۔ وطنی قومیت یا وطنیت بجائے خود بُری چیز نہیں لیکن اگر اس میں خاص اعتدال محفوظ نہ رکھا جائے اور افراط و تفریط ہوجائے تو اس میں بھی دہریت اور مادہ پرستی کے پیدا ہونے کے امکانات موجود ہیں۔ میں آپ کو نصیحت کرتا ہوں کہ آپ دل سے مسلمان بنیں۔ مجھے اسلام کے دشمنوں سے نہیں، بلکہ خود مسلمانوں سے اندیشہ ہے۔ آنحضرت ﷺ کی ایک نہایت پیاری حدیث یاد آئی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: أنا حظكم من الأنبياء و أنتم حظي من الأمم (میں انبیا میں تمھارا فخر ہوں اور تم امتوں میں میرا فخر ہو)۔ میں جب کبھی سوچتا ہوں تو شرم و ندامت سے میری گردن جھک جاتی ہے کہ کیا ہم مسلمان آج اس قابل ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ہم پر فخر کریں، ہاں، جب ہم اس نور کو اپنے دلوں میں زندہ کرلیں گے جو رسول اللہ ﷺ نے ہم میں داخل کیا تھا تو اس وقت اس قابل ہوسکیں گے کہ حضور ﷺ ہم پر فخر کریں۔ مؤتمر کی ذمے داریاں بہت بڑی ہیں۔ اس کے سامنے اہم کام ہیں۔ خاص طور پر حجاز ریلوے کی واپسی اور جامعہ اسلامیہ کا قیام۔ لیکن اگر ہم اسلام و اخوت کی سچی روح سے معمور ہوکر کام کریں گے تو اپنے مقاصد حاصل کرلیں گے۔ اپنے وطنوں کو واپس جاؤ تو روحِ اخوت کو ہر جگہ پھیلا دو اور اپنے نوجوانوں پر خاص توجہ دو۔ ہمارا مستقبل خاص انھی کی مساعی پر موقوف ہے۔ میں اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ عرب کے نوجوانوں میں میں نے وہ روح دیکھی

ہے اٹلی کے نوجوانوں کے سوا کہیں نہیں دیکھی۔ عربی نوجوان بلندیِ مرتبت کی روحِ صادق سے معمور ہیں۔ میرا عقیدہ ہے کہ اسلام کا مستقبل عرب کے مستقبل کے ساتھ وابستہ ہے اور عرب کا مستقبل عرب کے اتحاد پر موقوف ہے۔ جب عرب متحد ہو جائیں گے تو اسلام کامیاب ہو جائے گا۔ ہم سب پر واجب ہے کہ اس باب میں ساری قوتیں صرف کریں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں کامیابی عطا کرے گا"۔

عرب کے اتحاد کے متعلق اقبال نے جاوید نامے میں مہدی سوڈانی کے منھ سے اپنے عقیدے کا اظہار پہلے ہی کر دیا تھا۔ گو اقبال کی یہ تصنیف زیرِ طباعت تھی:

گفت: اے روحِ عرب بیدار شو — چوں نیاگاں خالقِ اَعصار شو
اے فواد! اے فیصل! اے ابنِ سعود! — تا کجا بر خویش پیچیدن چو دود
زندہ کن در سینہ آں سوزے کہ رفت — در جہاں باز آور آں روزے کہ رفت
خاکِ بطحا خالدے دیگر بزاے — نغمۂ توحید را دیگر سراے
اے نخیلِ دشتِ تو بالندہ تر — بر نخیزد از تو فاروقے دگر
اے جہانِ مؤمنانِ مشک فام — از تو می آید مرا بوے دوام
زندگانی تا کجا بے ذوقِ سیر — تا کجا تقدیرِ تو در دستِ غیر
بر مقامِ خود نیائی تا بہ کے — استخوانم در تنِ نالد چو نے
از بلا ترسی؟ حدیثِ مصطفیٰ است — "مرد را روزِ بلا روزِ صفاست"

(اس نے کہا: اے روحِ عرب بیدار ہو جا، اپنے اجداد کی طرح زمانے کی خالق بن۔ اے حاکمِ مصر فواد! اے حاکمِ عراق فیصل! اے ابنِ سعود! کب تک دھویں کی طرح خود سے الجھے رہو گے۔ اپنے سینے میں سوزِ رفتہ کو زندہ کرو، گزرے ہوئے شب و روز دنیا میں واپس لاؤ۔ اے خاکِ بطحا! دوسرا خالد پیدا کر، پھر سے توحید کی سرائی کر۔ تیرے صحرا کے کھجور کے درخت اور بلند ہوں۔ کیا تیرے اندر سے کوئی دوسرا فاروق پیدا نہیں ہو سکتا۔ اے سیاہ فام مومنوں کی دنیا (افریقہ)، مجھے تجھ سے ہمیشہ قائم رہنے والی خوشبو آرہی ہے۔ تم (اہلِ مصر و سوڈان) کب تک جہد و عمل کے ذوق کے بغیر زندگی (بسر کرو گے) اور کب تک اپنی تقدیر غیروں کے ہاتھ

میں دبے رہو گے۔ تم کب تک اپنے مقام حاصل نہ کرو گے، تمھارے ان حالات سے میری ہڈیاں سمندر میں بانسری کی طرح نالہ کناں ہیں۔ مصیبتوں سے ڈرتے ہو؟ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی حدیث ہے، مرد کے لیے مصیبت کا دن روزِ صفا ہے۔)

لیکن فلسطین میں قیام کے دوران میں وہ فلسطینی عرب کے جوش و خروش سے یقیناً متاثر ہوئے، چنانچہ بعد میں انھوں نے فرمایا:

زمانہ اب بھی نہیں جس کے سوز سے فارغ — میں جانتا ہوں وہ آتش ترے وجود میں ہے
تری دوا نہ جنیوا میں ہے، نہ لندن میں — فرنگ کی رگِ جاں پنجۂ یہود میں ہے
سنا ہے میں نے، غلامی سے امتوں کی نجات — خودی کی پرورش و لذتِ نمود میں ہے

۱۵، دسمبر ۱۹۳۱ء کی صبح کو اقبال اور غلام رسول مہر بیت المقدس سے روانہ ہوئے۔ مفتی سید امین الحسینی، سید ضیاء الدین طباطبائی، سعید شامل اور دیگر اصحاب انھیں الوداع کہنے کے لیے اسٹیشن پر آئے۔ چھے بجے شام گاڑی قنطرہ پہنچی۔ وہاں سے ڈاکٹر سلیمان کی کار میں بیٹھ کر پورٹ سعید گئے۔ سفر کے دوران میں اقبال کی طبیعت ناساز ہوگئی، تاہم ڈاکٹر سلیمان کے علاج سے وہ اگلے روز ٹھیک ہوگئے۔ پورٹ سعید میں ۱۶، دسمبر ۱۹۳۱ء کی رات کا کھانا انھوں نے ڈاکٹر سلیمان اور ان کی جرمن بیگم کے ساتھ کھایا۔ ۱۷، دسمبر ۱۹۳۱ء کی شب صدیق محمد ناڑو کی دعوت میں شریک تھے اور وہیں اطلاع ملی کہ جہاز بندرگاہ پر لگ گیا ہے۔ سوا سی رات تقریباً بارہ بجے ''پلنسا'' نامی جہاز میں سوار ہوگئے۔ ۱۸، دسمبر ۱۹۳۹ء کو صبح چار بجے جہاز پورٹ سعید سے روانہ ہوا۔ اس جہاز میں مہاتما گاندھی ہندوستان جا رہے تھے۔ ان کے علاوہ دیگر معروف شخصیتیں بھی اس ہی جہاز میں سفر کر رہی تھیں۔ مثلاً حیدر آباد دکن کے شہزادہ اعظم جاہ، شہزادہ معظم جاہ اور ان دونوں کی بیگمات، شہزادی در شہوار اور شہزادی نیلوفر، ان کی والدہ معزول سلطانِ ترکی عبدالمجید خان کی بیگم اور بیگم اکبر حیدری وغیرہ۔ عدن کی بندرگاہ پر جہاز چند گھنٹوں کے لیے رکا اور اقبال گھنٹہ بھر سیر کے لیے اترے۔

۲۸، دسمبر ۱۹۳۱ء کی صبح کو جہاز بمبئ پہنچ گیا۔ اقبال کے استقبال کے لیے مولانا محمد عرفان اور خلافت کمیٹی کے بعض ارکان بندگاہ پر موجود تھے۔ دس بجے کے قریب اقبال خلافت ہاؤس پہنچے۔ عطیہ فیضی نے

اس مرتبہ بھی اُن کے اعزاز میں ایوانِ رفعت میں دعوت کا اہتمام کر رکھا تھا۔ اقبال نے دن بھر تو خلافت ہاؤس میں آرام کیا، لیکن شام کو آدھے گھنٹے کے لیے ایوانِ رفعت میں تشریف لے گئے۔ وہاں سے ریلوے اسٹیشن پہنچے۔ ریل ساڑھے سات بجے بمبئی سے روانہ ہوئی۔ چند احباب نے انھیں رخصت کیا۔ روانگی سے قبل اخبارات کے لیے صوبہ سرحد میں آئینی اصلاحات اور صوبائی خود مختاری کے حصول کے بارے میں ایک بیان دیا۔ ۲۹، دسمبر ۱۹۳۱ء کی شام کو گاڑی دہلی اسٹیشن پر پہنچی۔ یہاں حافظ محمد صدیق ملتانی رئیسِ دہلی نے کھانے کا انتظام کر رکھا تھا اور بڑی تعداد میں لوگ استقبال کے لیے موجود تھے۔ اسٹیشن پر اقبال کو سپاس نامہ پیش کیا گیا اور وہیں انھوں نے کھانا کھایا۔ ٹرین دہلی سے روانہ ہو کر رات چار بجے لدھیانے اسٹیشن پر رکی۔ یہاں بھی اقبال کے عقیدت مند پھولوں کے ہار لے کر پہنچے ہوئے تھے۔ اقبال اس وقت سو رہے تھے، اس لیے انھیں بیدار نہ کیا گیا۔ امرتسر کے اسٹیشن پر بھی یہی کیفیت دیکھنے میں آئی۔ ۳۰، دسمبر ۱۹۳۱ء کو صبح آٹھ بجے گاڑی لاہور پہنچی۔ اسٹیشن پر ہجوم اس قدر زیادہ تھا کہ سپاس نامہ پیش کرنے والے اسے پڑھ بھی نہ سکے۔ بے شمار لوگوں نے اقبال کو پھولوں کے ہاروں سے لاد دیا اور اسی حالت میں گھر پہنچے۔

یکم جنوری ۱۹۳۲ء کو روز نامہ ''سول اینڈ ملٹری گزٹ'' کے نمائندے نے ان سے گھر پر ملاقات کی اور سفرِ فلسطین کے متعلق سوالات پوچھے۔ اقبال نے کہا: ''سفرِ فلسطین میری زندگی کا نہایت دلچسپ واقعہ ثابت ہوا ہے۔ فلسطین کے زمانۂ قیام میں متعدّد اسلامی ممالک کے نمائندوں سے ملاقات ہوئی۔ شام کے نوجوان عربوں سے مل کر میں خاص طور پر متاثر ہوا۔ ان نوجوانانِ اسلام میں اس قسم کے خلوص و دیانت کی جھلک پائی جاتی تھی جیسی میں نے اطالیہ میں فاشسٹ نوجوانوں کے علاوہ کسی میں نہیں دیکھی۔ میں نے اسلام، عیسائیت اور صیہونیت کے بعض مشترکہ مقاماتِ مقدسہ کی زیارت کی۔ خصوصاً حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مقامِ ولادت سے میں بہت متاثر ہوا۔ مجھے یقین ہے کہ فلسطین کو یہودیوں کا وطن بنانے کی اسکیم بالآخر ناکام رہے گی۔ مؤتمر شاندار طریق سے کامیاب رہی۔ اس عظیم الشان اجتماع میں اکثر اسلامی ممالک کے نمائندے شریک ہوئے اور اسلامی اخوت اور ممالکِ اسلامی کی آزادی کے مسائل پر مندوبین نے بے حد جوش و خروش کا اظہار کیا۔ میں بہت سی سب کمیٹیوں کا رکن تھا جو بعض تجاویز پر بحث کرنے کے لیے مقرر کی گئی تھیں...... ایک سب کمیٹی میں

میں نے یروشلم میں قدیم جامعہ ازہر کی طرز پر ایک اسلامی یونیورسٹی کے قیام کی مخالفت کی اور اس بات پر زور دیا کہ مجوزہ یونیورسٹی بالکل جدید طرز پر قائم کی جائے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ غلط فہمی کیونکر پیدا ہوگئی کہ میں یروشلم میں کسی قسم کی یونیورسٹی کے قیام کا حامی نہیں ہوں۔ رائٹر نے ایک تار بھیج دیا تھا جس کا مفہوم یہی تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ میری یہ پُر زور خواہش ہے کہ عربی زبان بولنے والے لوگ صرف ایک ہی نہیں بلکہ کئی یونیورسٹیاں قائم کر کے علومِ جدیدہ کو زبانِ عربی میں تبدیل کرلیں"۔

* * * * *

ماخذ: زندہ رود، ڈاکٹر جاوید اقبال، سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۱۲ء، ص:۵۲۵

فیض احمد فیضؔ

فلسطینی شہدا جو پردیس میں کام آئے

میں جہاں پر بھی گیا ارضِ وطن
تری تذلیل کے داغوں کی جلن دل میں لیے
تری حرمت کے چراغوں کی لگن دل میں لیے
تری الفت تری یادوں کی کسک ساتھ گئی
ترے نارنج شگوفوں کی مہک ساتھ گئی
سارے ان دیکھے رفیقوں کا جِلو ساتھ رہا
کتنے ہاتھوں سے ہم آغوش مرا ہاتھ رہا
دور پردیس کی بے مہر گزر گاہوں میں
اجنبی شہر کی بے نام و نشاں راہوں میں
جس زمیں پر بھی کھلا میرے لہو کا پرچم
لہلہاتا ہے وہاں ارضِ فلسطیں کا علم
تیرے اعدا نے کیا ایک فلسطیں برباد
میرے زخموں نے کیے کتنے فلسطیں آباد

*****

صوفی جمیل الرحمٰن عباسی
ناظمِ شعبۂ تحقیق و تصنیف، فقہ اکیڈمی

فتحِ بیت المقدس

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی القدس میں داخلے کی ایمان افروز داستان

فلسطین میں فتوحات کے دوران ماہر رومی سیاست دان اور جرنیل ارطبون بیت المقدس میں مقیم تھا، حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے ساتھ اس کی خط کتابت جاری تھی۔ ارطبون نے اپنے مصاحبین کے سامنے اس بات کا اظہار کیا کہ عمرو بن العاص بیت المقدس فتح نہیں کر سکے گا۔ انھوں نے سوال کیا کہ آپ اتنے یقین کے ساتھ کیسے کہہ سکتے ہیں؟ تو اس نے جواب دیا کہ میرے علم کے مطابق اس شہر کا فاتح وہ ہے جس کے نام کے تین حروف ہیں۔ اس کے بعد اس نے کچھ اور صفات بھی بتائیں۔ جن سے حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے اندازہ لگا لیا کہ وہ شخصیت خلیفۃ المسلمین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ ہی ہیں۔ لہذا انھوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی جناب میں عرض کی کہ اگر آپ بیت المقدس تشریف لے آئیں تو بیت المقدس بغیر خون خرابے کے فتح ہو سکتا ہے۔ ساتھ ہی آپ نے بیت المقدس کی طرف پیش قدمی شروع کر دی۔ دوسری طرف حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ دمشق اور حِمص کی فتح سے فارغ ہونے کے بعد بیت المقدس کی طرف متوجہ ہوئے۔ انھوں نے بیت المقدس کے والی کو خط ارسال کیا جس میں انھیں اسلام، جزیہ اور قتال میں سے کسی ایک کے انتخاب کی دعوت دی گئی تھی۔ بعض روایتوں میں آتا ہے کہ انھوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خط لکھا کہ دمشق اور دوسرے علاقے فتح ہو چکے ہیں، اب کیا کیا جائے۔ اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے مشاورت کے بعد بیت المقدس فتح کرنے کی اجازت دی۔ بہر حال اس کے بعد حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ اپنی فوج کو لے کر بیت المقدس پہنچ آئے۔ انھوں نے ارد گرد کی مسلمان افواج کو بھی بیت المقدس میں بلا لیا اور

حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے ساتھ مل کر بیت المقدس کا محاصرہ کر لیا۔ جس صبح مسلمانوں نے بیت المقدس پر حملہ آور ہونا تھا۔ وہ رات مسلمانوں نے بیت المقدس کی خوشی میں جاگتے ہوئے گزاری۔ ہر گروہ چاہتا تھا کہ بیت المقدس اس کے ہاتھوں فتح ہو تاکہ وہ (سب سے پہلے) اور دوسرے مسلمان مسجد الاقصیٰ میں نماز پڑھ سکیں اور انبیاے کرام علیہم السلام کے آثار و مقامات کی زیارت سے بہرہ ور ہو سکیں۔ نمازِ فجر میں حضرت یزید بن ابی سفیان رضی اللہ عنہما نے سورۃ المائدہ کی جن آیات کی قراءت کی اس میں آیتِ مبارکہ ﴿يَا قَوْمِ ادْخُلُوا الْأَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِي كَتَبَ اللهُ لَكُمْ وَلا تَرْتَدُّوا﴾ بھی تھی۔ یہ بھی کہا گیا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمام امراے جیوش کی زبانوں پر قراءتِ نماز میں یہی آیات جاری ہوئیں۔ مسلمانوں کی راتوں کا حال یوں بیان کیا گیا: قَوْمٌ يُصَلّونَ وقومٌ يَقْرَأُونَ وقومٌ يَتَضَرَّعُوْنَ وقومٌ نَائِمُونَ "کچھ لوگ نماز پڑھتے رہتے، کچھ تلاوت کرتے رہتے، کچھ لوگ آہ وزاری میں مصروف رہتے جبکہ کچھ لوگ آرام کیا کرتے"۔ حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ نے مختلف کمانڈروں کے تحت افواج متعیّن کیں اور انھیں روانہ کرتے وقت یوں نصیحت فرمائی: فَارْفَعُوا أَصْواتَكُمْ بِالتَّهْليلِ وَالتَّكْبيرِ وَاسْأَلُوا اللهَ بِجاهِ نَبِيِّهِ وَمَنْ سَكَنَهَا مِنَ الْأَنْبِيَاءِ وَالصّالِحينَ أَن يَّسْهَلَ فَتْحَها عَلَى أَيْدِي الْمُسْلِمِينَ. "کلمۂ طیبہ اور اللہ اکبر کی صدائیں بلند کیے رکھو اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور بیت المقدس میں رہ چکنے والے انبیاے کرام علیہم السلام اور صالحین کے وسیلے سے اللہ تعالیٰ سے دعا کرو کہ وہ مسلمانوں کے لیے اس شہر کی فتح کو آسان کر دے"۔ خیر، مسلمان افواج نے بیت المقدس کو گھیرے میں لے لیا۔ یہ سردیوں کا موسم تھا اور مسلمان سخت مشقت میں تھے لیکن انھوں نے کمال صبر سے چار ماہ تک بیت المقدس کا سخت محاصرہ کیے رکھا۔ رومی جرنیل ارطبون چپکے سے مصر کی طرف نکل گیا۔ جب شہر کے لوگ تنگ آ گئے تو انھوں نے اپنے لاٹ پادری سے کہا: اے ہمارے باپ! ہم سوچتے تھے کہ یہ مسلمان محاصرہ نہ کر سکیں گے اور ہمیں قیصر کی طرف سے کمک ملے گی لیکن ہمارا بادشاہ اپنی فوج کے شکست کھانے کی وجہ سے ہماری مدد کو نہ آ سکا۔ آپ ہماری طرف سے ان مسلمانوں سے بات کریں۔ اگر صلح کی کوئی صورت بنتی ہے تو ٹھیک ورنہ ہم باہر نکل کر لڑائی کریں یا تو ہم مسلمانوں کو شکست

دے دیں یا ہمارا آخری آدمی بھی قتل ہو جائے۔ اہلِ شہر کی طرف سے پیغام بھیجا گیا کہ اپنے امیر کو نزدیک لائیں ہم اس سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ دیوار کے پاس آ گئے۔ پادری اپنے ساتھ دوسرے احبار و رہبان کو لے کر دیوار پر نمودار ہوا۔ ان لوگوں نے انجیلِ مقدس ہاتھوں میں بلند کی ہوئی تھی۔ پادری نے حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ سے پہلا سوال ہی یہ کیا: کیا تمھیں اس شہر کی عظمت و حرمت کا اندازہ نہیں کہ تم یہاں حملہ کر کے اللہ کا غضب مول لے رہے ہو؟ حضرت ابو عبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ نے جواب میں فرمایا: نَعَمْ إِنَّها شَرِيفَةٌ ومِنْها أَسْرَى بِنَبِيِّنا إِلَى السَّمَاءِ ودَنا مِنْ رَّبِّهِ كَقَابِ قَوْسَيْنِ أو أَدْنَى وإِنَّها مَعْدِنُ الأنبياءِ وقُبُورِهِمْ فيها ونَحْنُ أَحَقُّ مِنْكُمْ بِها ولا نَزالُ عليها أو يُمَلِّكُنا اللهُ إيّاها كَما مَلَّكَنا غَيْرَها "ہاں ہم جانتے ہیں کہ یہ عزت والا شہر ہے۔ اسی شہر سے ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا آسمان کی طرف سفرِ معراج شروع ہوا جس میں وہ اپنے رب کے نزدیک ہوئے قابَ قوسین کی حد تک یا اس سے بھی کم۔ یہ نبیوں کی سرزمین ہے اور ان کی قبریں یہیں پائی جاتی ہیں۔ البتہ بات یہ ہے کہ ہم تم سے زیادہ اس شہر کی تولیت کے حق دار ہیں۔ ہمارا واپسی کا کوئی ارادہ نہیں ہے یہاں تک کہ اللہ دوسرے شہروں کی طرح یہاں بھی ہمیں غلبہ دے دے"۔ پادری نے پوچھا: اچھا مزید کیا صورت ہو سکتی ہے؟ حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا پہلی بات تو یہ ہے کہ تم اسلام قبول کر لو۔ یہ نہیں تو دوسری بات یہ ہے کہ جزیہ ادا کر کے شہر ہمارے حوالے کر دو اور آخری صورت یہی ہے کہ ہم تم سے جنگ جاری رکھیں۔ پادری نے کہا کہ ہم اپنا دین تو چھوڑ نہیں سکتے۔ جزیہ ایک ذلت ہے ہم اسے برداشت نہیں کر سکتے۔ رہی بات تمھارے دوسرے شہروں کو فتح کرنے کی تو ان پر مسیح علیہ السلام کا غضب تھا۔ اس لیے وہ تمھاری غلامی میں دے دیے گئے۔ جبکہ ہمارا شہر مقدس ہے اور ہم جب 'خداوند مسیح' سے مدد کی درخواست کریں گے تو وہ ہماری مدد کریں گے۔ پادری نے مزید کہا کہ یقینی طور پر تم لوگ یہ شہر نہیں فتح کر سکتے کیونکہ اس کا فتح کرنے والا کوئی اور ہے۔ پھر اس نے شہر بیت المقدس کو فتح کرنے والے کی نشانیاں بتائیں تو ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ ہنسے اور اللہ اکبر کا نعرہ بلند کر کے فرمایا: "ربِ کعبہ کی قسم شہر فتح ہو گیا"۔ پادری نے پوچھا: کیا تم ان صاحب کو جانتے ہو؟ انھوں نے جواب دیا: میں انھیں کیسے نہ پہچانوں گا کہ

مدتوں ان کے ساتھ رہا ہوں یہ ہمارے نبی کے ساتھی اور ہمارے خلیفہ حضرت عمر فاروق ہیں۔ پادری نے کہا کہ اگر ایسا ہے تو ہمیں لوگوں کا خون بہانے سے بچنا چاہیے۔ تم لوگ انھیں بلا لو، اگر ہم نے ان میں نشانیاں پائیں تو ہم شہر تمھارے حوالے کر دیں گے۔ حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ نے اپنے ساتھیوں کے سامنے ساری بات رکھی۔ انھوں نے باواز بلند لا إله إلا الله و الله أكبر پکارا اور کہنے لگے: اے امیر! خلیفہ کی خدمت میں جلد خط روانہ کریں۔ حضرت شرحبیل رضی اللہ عنہ نے رائے دی کہ حضرت خالد بن ولید کا حلیہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے تو کیوں نہ پادری کو آزمایا جائے۔ اس پر اتفاق ہوا تو حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو دیوار کے نزدیک لایا گیا اور قلعے والوں سے کہا گیا: تمھارا مطلوب آ گیا لہٰذا اپنے پادری کو بلا لو۔ پادری نے غور سے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو دیکھا اور پھر کہنے لگا: ''یہ لگتا تو اسی کے جیسا ہے لیکن یہ وہ ہے نہیں۔ بعض علامات اس میں نہیں پائی جاتیں''۔ اب مسلمانوں نے خلیفۃ المسلمین کی خدمت میں خط روانہ کیا اور پوری تفصیل لکھ کر انھیں تشریف آوری کی دعوت دی۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے اصحاب سے مشاورت کی تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی رائے سامنے آئی کہ جب ہم نے اتنے شہر فتح کر لیے اور دشمن کمزور ہو چکا ہے تو اس کی طرف خلیفہ کو بھیج کر اسے عزت نہ دی جائے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی رائے یہ سامنے آئی کہ محاصرہ بہت طویل ہو چکا ہے۔ مسلمان موسم کی سختی کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ اس لیے ان کی تالیف اور سہولت کا خیال کرتے ہوئے خلیفہ کو بیت المقدس کا سفر کرنا چاہیے کہ انھیں اس سفر کا ڈھیروں اجر بھی ملنے والا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دشمن کو کہیں سے مدد مل جائے تو فتح مزید دور چلی جائے''۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دونوں کی تحسین کی اور فرمایا: ''عثمان نے جنگی چال اور حکمت کی بات کی جبکہ علی نے مسلمانوں پر شفقت و رحمت والی بات کی اور ہم علی کی رائے کو اختیار کرتے ہیں''۔ آپ نے اسی وقت سفر کی تیاری کا حکم دیا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب معسکر میں پہنچے تو فجر کا وقت تھا۔ آپ نے لوگوں کو نماز پڑھائی اور اس کے بعد آپ نے وعظ و نصیحت پر مبنی خطاب فرمایا۔ اس کے بعد حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ آپ کو مختلف محاذات کے احوال بتانے لگے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کبھی اظہار اطمینان کرتے اور کبھی رونے لگتے۔ ظہر تک یہی سلسلہ چلتا

رہا۔ ظہر کی اذان کا وقت آیا تو بعض اصحاب نے فرمائش کی کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے اذان کہلوائی جائے۔ آپ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے کہا: ”اے بلال! تمھارے ساتھی چاہتے ہیں کہ تم ان کے لیے اذان دو اور انھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایام کی یاد تازہ کراؤ“۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے اذان دی تو دِلوں کے پنچھی یوں پھڑپھڑانے لگے گویا سینوں کے پنجرے توڑ جانا چاہتے ہوں۔ ہر طرف گریہ اور آہ وزاری جاری تھی۔ جب کچھ تسکین ہوئی تو نمازِ ظہر ادا کی گئی۔

اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مساکین اور ضرورت مند حضرات کے لیے وظائف مقرر کیے اور فرمایا کہ لوگوں کو گندم، جو، شہد اور تیل وغیرہ فراہم کیا جائے۔ پھر آپ نے فوجوں سے کہا کہ اگر کسی کو اپنے امیر سے شکایت ہو یا جو حصے ہمارے طرف سے ان لوگوں کے لیے مقرر کیے گئے، وہ نہ ملتے ہوں تو مجھے آگاہ کریں۔ اس کے بعد آپ اونٹ پر سوار ہوئے تاکہ شہر پناہ کی طرف جا سکیں۔ لوگوں نے درخواست کی آپ اونٹ کے بجائے گھوڑے پر سوار ہو جائیں اور اپنا مُرَقّع (وہ لباس جس میں بہت سارے پیوند لگے ہوں) اتار کر اچھے کپڑے پہن لیں۔ خیر آپ نے ساتھیوں کی درخواست پر اچھے کپڑے پہنے اور گھوڑے پر سوار ہوئے، وہ گھوڑا کچھ شوخ سا تھا اچھل کود کرنے لگا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خیال آیا کہ یہ لباس اور گھوڑا ”تواضعِ شاہانہ“ کے خلاف ہے تو آپ گھوڑے سے اتر پڑے اور کہنے لگے: ”تم جانتے ہو جس کے دل میں رائی کے دانے جتنا تکبر ہو گا وہ جنت میں داخل نہ ہو گا“۔ پھر آپ نے اپنا مرقع منگوا کر پہنا۔ اس کے آپ اونٹ پر سوار ہو کر اگلے مورچوں کی طرف چلے۔

حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ آپ کے ساتھ تھے۔ مورچوں میں ایک جگہ آپ کے لیے خیمہ لگایا گیا تھا آپ نے وہاں نماز ادا کی۔ حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ نے شہر پناہ کے پہرے داروں سے کہا کہ لاٹ پادری کو اطلاع دی جائے کہ امیر المومنین تشریف لے آئے ہیں۔ پادری صفرونیوس دیوار پر آیا اور اس نے کہا کہ ان صاحب کو دیوار کے نزدیک لے آؤ تاکہ ہم دیکھ سکیں کہ وہی ہیں یا کوئی اور ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے اونٹ کو دیوار کے نزدیک لے چلے تو لوگوں نے اعتراض کیا کہ کہیں آپ کے خلاف کوئی ناشائستہ حرکت نہ کی جائے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آیتِ مبارکہ ﴿قُلْ لَنْ يُصِيبَنَا إِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا هُوَ مَوْلَانَا وَعَلَى

اللهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ﴾ پڑھی اور حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ دیوار کے نزدیک آ گئے۔ پادری صفرونیوس آپ کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ وہ زور سے چلا اٹھا: یہ محمد کے وہی ساتھی ہیں جن کی نعت وصفات ہماری کتابوں میں پائی جاتی ہیں۔ یہی قدس کے فاتح ہیں۔ اے لوگو! اترو اور ان سے امان طلب کرو۔ شہر پناہ کے دروازے کھول دیے گئے اور لوگ جوق در جوق حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس حاضر ہونے لگے۔ آپ رضی اللہ عنہ نے لوگوں سے کہا: واپس جاؤ، تم ہمارے ذمے میں ہو، تمھیں امان دی جاتی ہے۔ جاؤ اپنے شہر میں چلے جاؤ۔ آپ رضی اللہ عنہ معسکر میں آ گئے اور رات بسر کرنے کے بعد اگلے دن شہر میں داخل ہوئے جبکہ پیر کا دن تھا۔ آپ رضی اللہ عنہ مسجدِ اقصیٰ میں اسی دروازے سے داخل ہوئے جہاں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم داخل ہوئے تھے۔ آپ نے مسجد میں دو رکعت نماز ادا کی۔ آپ نے مسجدِ اقصیٰ میں فجر کی نماز پڑھائی جس میں آپ نے سورۂ بنی اسرائیل اور سورۂ ص کی قراءت کی۔ پھر آپ اس چٹان (صخرہ) کی طرف آئے جہاں سے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا معراج شروع ہوا تھا۔ آپ نے کعب الاحبار رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا کہ میں نماز کہاں ادا کروں تو انھوں نے کہا کہ صخرہ کے پیچھے ادا کریں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا یہ تو یہود کا طریقہ ہے۔ میں وہاں نماز ادا کروں گا جہاں حضورِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز ادا کی تھی پھر وہ قبلے کی طرف آگے بڑھے کہ صخرہ آپ کے پیچھے تھی۔ یہاں آپ نے نماز پڑھی اور اس جگہ کو مسجد قرار دیا (یہ مسجدِ جامع قبلی یا مسجدِ عمر یا جامع عمر کہلاتی ہے)۔

آپ رضی اللہ عنہ نے اہلِ بیت المقدس پر جزیہ عائد کیا، ان کو امان دی اور ایک معاہدہ تحریر کیا۔ اس معاہدے کی رو سے اہلِ قدس پر جزیہ عائد کیا گیا۔ جس کے بدلے میں ان کی جان ومال اور عبادت گاہوں کے تحفظ اور مذہبی آزادی کی ضمانت دی گئی۔ دین کے معاملے میں ان پر کوئی جبر و اکراہ نہیں کیا جائے گا۔ اگر ان میں سے کوئی اپنی مرضی سے نکل کر کہیں جانا چاہے تو اس پر کوئی دار و گیر نہیں ہوگی۔ اس معاہدے میں عیسائیوں کی خواہش کے مطابق یہودیوں کو بیت المقدس میں رہائش کی ممانعت کی گئی۔ اہلِ قدس کو اس کا پابند بنایا گیا کہ وہ رومیوں کو یہاں سے نکالیں گے اور جو بھی رومی یہاں سے نکلے گا اسے جان ومال کی امان دی جائے گی یہاں تک کہ وہ اپنے مقام پر پہنچ جائے۔ اس معاہدے پر حضرت خالد بن ولید، عمرو بن العاص، عبد الرحمن بن عوف اور معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہم گواہ ٹھہرائے گئے۔ معاہدے کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے شام کا

کچھ بندوبست کیا اور پھر مدینہ تشریف لے آئے۔ آپ رضی اللہ عنہ نے عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو مصر کی طرف روانہ کیا۔ حضرت یزید بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ کو شام کے ایک حصے کا والی بنایا۔ جبکہ دوسرے حصے پر آپ نے حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ کو حکمران بنایا۔

*****

کتابیات:

فتوح الشام للواقدي

البداية و النهاية لحافظ بن كثير

الكامل في التاريخ لإمام ابن الأثير

تاريخ الطبري لإمام ابن جرير الطبري

المفصل في تاريخ القدس، عارف العارف

القدس و المسجد الأقصىٰ عبر التاريخ، دكتور محمد علي البار، دارالقلم، دمشق

علامہ شبلی نعمانی

بیت المقدس کا معاہدہ

بیت المقدس کا معاہدہ جو خود حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی موجودگی میں اور ان کے الفاظ میں لکھا گیا حسبِ ذیل ہے:
''یہ وہ امان ہے جو خدا کے غلام امیر المؤمنین عمر نے ایلیا کے لوگوں کو دی، یہ امان ان کی جان و مال، گرجا، صلیب، تندرست، بیمار اور ان کے تمام مذہب والوں کے لیے ہے۔ اس طرح پر کہ ان کے گرجاؤں میں نہ سکونت کی جائے گی، نہ وہ ڈھائے جائیں گے، نہ ان کو یا ان کے احاطے کو کچھ نقصان پہنچایا جائے گا، نہ ان کی صلیبوں اور ان کے مال میں ان پر جبر کیا جائے گا، نہ ان میں سے کسی کو نقصان پہنچایا جائے گا۔ ایلیا میں ان کے ساتھ یہودی نہ رہنے پائیں گے، ایلیا والوں پر یہ فرض ہے کہ اور شہروں کی طرح جزیہ دیں اور یونانیوں اور چوروں کو نکال دیں۔ ان یونانیوں میں سے جو شہر سے نکلے گا اس کی جان اور مال کو امن ہے تا آنکہ وہ جائے پناہ میں پہنچ جائے اور جو ایلیا ہی میں رہنا اختیار کرے تو اس کو بھی امن ہے اور اس کو جزیہ دینا ہوگا۔ اور ایلیا والوں میں سے جو شخص اپنی جان اور مال لے کر یونانیوں کے ساتھ چلا جانا چاہے تو ان کو اور ان کے گرجاؤں کو اور صلیبوں کو امن ہے، یہاں تک کہ وہ اپنی جائے پناہ تک پہنچ جائیں۔ اور جو کچھ اس تحریر میں ہے اس پر خدا کا، رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا، خلفا کا، مسلمانوں کا ذمہ ہے، بشرطیکہ یہ لوگ جزیۂ مقررہ ادا کرتے رہیں۔ اس تحریر پر گواہ ہیں: خالد بن الولید اور عمرو بن العاص اور عبدالرحمن بن عوف اور معاویہ بن ابی سفیان اور ۱۵ھ میں لکھا گیا''۔

*****

ماخذ: الفاروق، مولانا شبلی نعمانی، دار الاشاعت کراچی، ۲۰۱۷ء، ص: ۲۳۵

ممتاز لیاقت

آہ! القدس میں تقدیرِ الٰہی نازل ہوئی

سقوطِ قدس اور صلیبی لشکروں کے مظالم کی بھیانک داستان

۱۵، اگست ۱۰۹۶ء کو یورپی حکومتوں کی باقاعدہ افواج ساحلِ ایشیا پر اتریں۔ ان میں فرانس، برطانیہ، اٹلی، سسلی اور جرمنی کی فوجیں شامل تھیں۔ ان کی قیادت یورپ کے جری گاڈ فری رئیس بولون، ہیوغ اعظم، ریمنڈ کاؤنٹ ٹولوز، رابرٹ امیرنا، رمنڈی، ہیگو آف در مینڈا جیسے سالار کر رہے تھے۔ افواج کی تعداد دس لاکھ سے کم نہ تھی۔ صلیبی محاربین نے قونیہ کا محاصرہ کرلیا اور سلطان امیر ارسلان، ایک خوفناک معرکے کے بعد شکست تسلیم کرنے پر مجبور ہو گیا۔ اس کے بعد صلیبی محاربین انطاکیہ کی طرف بڑھے اور ارمنی النسل امیر فیروز کی غداری نے انھیں انطاکیہ میں داخلے کا راستہ دے دیا۔ صلیبی فوجیں رات کو شہر میں داخل ہوئیں اور ساری مسلمان آبادی کو تہِ تیغ کرکے ان کے مکانات مسمار کر دیے۔ عیسائی مؤرخین کے بیان کے مطابق مسلمان مقتولین کی تعداد دس ہزار سے کم نہ تھی۔ اس کے بعد عیسائی فوجیں معرۃ النعمان کی طرف بڑھیں اور اسے فتح کرکے تین دن تک قتلِ عام کرتی رہیں۔ ایک لاکھ سے زیادہ مسلمان قتل اور اسی قدر زندہ گرفتار کیے گئے۔ عین اسی مرحلے میں فاطمی خلافتِ مصر نے ترکمانوں کو کمزور پاکر ارضِ فلسطین پر قبضہ کرنے کی ٹھانی اور فاطمی خلیفہ مستعلی (المستعلي باللہ) کے سپہ سالار افضل بن بدر جمال نے القدس پر چڑھائی کردی۔ چالیس روز کے محاصرے کے بعد شعبان ۴۸۹ھ مطابق ۱۰۹۶ء کو شہر فاطمیوں کے قبضے میں آگیا اور افتخار الدولہ حاکم ہوا، لیکن تین سال بعد صلیبیوں نے قدس کا محاصرہ کرلیا۔ صلیبی چالیس ہزار اور مصری فوج صرف ایک ہزار تھی۔ اسے مصر سے کمک پہنچی نہ ہی عباسی خلیفہ المستظہر باللہ کوئی اعانت کرسکا۔ نتیجتاً چالیس روز کے بعد ۲۳ شعبان ۴۹۲ھ (۱۵، جولائی ۱۰۹۹ء) کو صلیبی کوہِ صیہون کی طرف سے شہر میں داخل ہو گئے۔

مسلمانوں نے مسجدِ اقصیٰ میں پناہ لی لیکن عیسائیوں نے شہر میں قتل وغارت کے بعد مسجد کا رخ کیا۔ اور بچوں، بوڑھوں، جوانوں سب کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر شہید کیا۔ ایک گروہ محرابِ داؤد میں جا پہنچا۔ لیکن جس وقت نصرانی بیت المقدس کی شمالی دیوار توڑ کر اندر آ گئے تو ایک قیامت برپا ہو گئی۔ حاملہ عورتوں کے پیٹ چاک کیے گئے۔ معصوم بچوں کو اٹھا اٹھا کر فصیلوں پر پٹکا گیا۔ علمائے کرام کو تیل اور نَفت چھڑک کر جلایا گیا۔ مسجدِ اقصیٰ اور محرابِ داؤد میں شہدا کی تعداد سات ہزار سے زیادہ تھی۔ مشرقی و مغربی مؤرخین متفقہ طور پر مسلمان مقتولین کی مجموعی تعداد ستر ہزار بتاتے ہیں۔ قدس کے گلی کوچوں کے علاوہ ویرانوں اور کھنڈروں میں لاشوں کے انبار لگے ہوئے تھے۔ مسجد اور اس کے صحن میں مقتولین کا خون گھوڑوں کے گھٹنوں تک پہنچتا تھا۔ اس غارت گرفتح کے تیسرے روز بعد مسلمان قیدی بھی موت کے گھاٹ اتار دیے گئے۔ باقیوں کو مجبور کیا گیا کہ وہ خود کو میناروں اور مکانوں کی چھتوں سے گرا کر ہلاک کر ڈالیں، مشہور یورپی مؤرخ سٹینلے لین پول لکھتا ہے کہ صلیبی بیت المقدس میں اس طرح گھسے جیسے کہ کوئی پرانی لکڑی میں پچر ٹھونکے۔ ایک اور عیسائی مؤرخ رقم طراز ہے: بیت المقدس میں فاتحانہ داخلے پر صلیبیوں نے ایسا قتلِ عام کیا کہ ان صلیبیوں کے -جو مسجدِ عمر رضی اللہ عنہ میں سوار ہو کر گئے تھے- گھوڑوں کے گھٹنے خون کے چشمے میں ڈوبے ہوئے تھے۔ بچوں کو ٹانگوں سے پکڑ کر دیواروں پر دے مارا گیا یا ان کو گھما کر فصیل سے پھینک دیا گیا۔ دوسرے دن ان لرزہ خیز مظالم کا وسیع پیمانے پر اور جان بوجھ کر اعادہ کیا گیا۔ ٹینکریڈ نے تین سو قیدیوں کو جان کی امان دی تھی۔ وہ چیختا رہا لیکن اس کی چیخ پکار کسی نے نہ سنی اور سب کو قتل کر دیا گیا۔ پھر ایک زبردست قتلِ عام شروع ہوا، عورتوں، بچوں، بڑوں اور بوڑھوں کو ٹکڑے ٹکڑے اور ریزہ ریزہ کر دیا گیا۔ شیخ سعدی شیرازی نے اس واقعے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ جو عیسائی بیت المقدس میں داخل ہو جائے، انھیں انسان کہنا انسانیت کی توہین ہے۔ عینی شاہد رابرٹ کے حوالے سے لیبان نے لکھا ہے: ''ہمارے لوگ (صلیبی) راستوں میں اور مکانوں کی چھتوں پر دوڑ رہے تھے اور اُس شیرنی کی طرح جس کے بچے چھین لیے گئے ہوں، قتلِ عام کے مزے لے رہے تھے۔ یہ بچوں کے ٹکڑے کر رہے تھے اور کسی متنفس کو بھی نہ چھوڑتے تھے۔ جلد فراغت حاصل کرنے کی غرض سے ایک ہی رسّی میں کئی کئی آدمیوں کو لٹکا دیتے تھے''۔ ایک دوسرا عینی شاہد ریمانڈ وا ژیل پوٹی کے قیس بیان کرتا ہے کہ:

"بیت المقدس کے راستوں اور ہر جگہ پر سروں، ہاتھوں اور رانوں کے انبار لگے ہوئے تھے اور لاشوں پر سے چلنا پڑتا تھا... ہیکل سلیمانی (مسجدِ عمر رضی اللہ عنہ) میں اس قدر خون بھرا تھا کہ اس کے صحن میں لاشیں تیرتی پھرتی تھیں۔ کسی کا ہاتھ، کسی کا پیر، کسی کا دھڑ، بے جوڑ اس طرح سے ایک دوسے سے ملے ہوئے تھے کہ انھیں پہچاننا مشکل تھا۔ صلیبیوں نے اس قتلِ عام کو ناکافی سمجھ کر ایک محفل منعقد کی، جس میں قرار پایا کہ کُل باشندگانِ بیت المقدس کو تہِ تیغ کر دیا جائے۔ حامیانِ دینِ عیسوی کی مُستعدی کے باوجود، قتلِ عام کا یہ بازار آٹھ روز تک گرم رہا۔ عورتیں، بچے، بوڑھے سب مارے گئے، کوئی متنفس زندہ نہ رہا"۔ مسجدِ عمر رضی اللہ عنہ سے چاندی کی چالیس بڑی قندیلیں جس کا وزن ایک سو رطل شامی اور دو سو چھوٹی قندیلیں لوٹی گئیں۔ مسجدِ اقصیٰ کا مالِ غنیمت اس قدر تھا کہ چھے گاڑیاں بھی بھری جاتیں تو ختم نہ ہوتا۔ اس قتلِ عام کی اطلاع بغداد پہنچی تو گریہ کناں اہلِ بغداد سیاہ ماتمی لباس پہن کر گلیوں میں نکل آئے۔ وہ دہائی دے رہے تھے:

آہ!القدس میں تقدیرِالٰہی نازل ہوئی

* * * * *

ماخذ: تاریخِ بیت المقدس، ممتاز لیاقت، سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۰۳ء، ص: ۶۲

مولانا محمد اسماعیل ریحان

لشکرِ اسلام القدس کے سامنے

القدس کی فتح اور سلطان صلاح الدین ایوبی رحمۃ اللہ علیہ کا عدل وانصاف

اتوار ۱۵ رجب (۲۰، ستمبر ۱۱۸۷ء) کو اسلامی لشکر پہاڑیاں اور وادیاں عبور کرتے ہوئے مغرب کی سمت سے القدس کے سامنے اترنے لگا۔ مسلمان قبلۂ اوّل کے امین شہر کو اپنے سامنے پاکر مسرت سے نہال نظر آرہے تھے۔ یہ وہ شہر تھا جہاں پیغمبر آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم نے شبِ معراج میں تمام انبیا علیہم السلام کی امامت کی تھی، جو سولہ ماہ تک امتِ مسلمہ کا قبلہ رہا تھا، جس کا چپہ چپہ انبیائے سابقین کی برکات سے معمور اور وحی کے انوار سے روشن تھا۔ یہی وہ مقام تھا جس کی وراثت کا دعویٰ ایک صدی سے مسلمانوں اور نصرانیوں میں خون ریز جنگوں کی بنیاد بنا ہوا تھا۔ اکیانوے برس سے یہ شہر نہ صرف شام کی عیسائی ریاستوں کا دار الحکومت تھا بلکہ یورپی ممالک کے نزدیک بھی اس کی اہمیت اپنے سیاسی مرکز اور پایہ تختوں سے کہیں زیادہ تھی، وہ اسے اپنے مذہب کا عالمی مرکز مانتے تھے اور مسیح ومریم کی میراث کی حیثیت سے اس پر جان نچھاور کرتے تھے۔

سلطان صلاح الدین ایوبی جب القدس کی وادی میں اترے تو دیکھا، شہر پناہ جنگجوؤں سے بھری پڑی ہے۔ مسلمان سپاہی حیرت سے دیکھ رہے تھے کہ دشمن کی تعداد ان کی توقع سے کہیں زیادہ ہے۔ نہ صرف فصیل پر کھڑے عیسائی نعرے بلند کر رہے تھے بلکہ اندرونِ شہر سے بھی جوش وغضب سے بھرپور نعروں کی گونج اٹھ اٹھ کر وادی میں دور دور تک پھیل رہی تھی۔ یہ بات واضح تھی کہ حریف ہتھیار ڈالنے کے بجائے لڑکر مرجانے کو ترجیح دے گا تاہم ان میں پیشہ ور سپاہی زیادہ نہ تھے، اکثریت عوام کی تھی جنھیں بالیان اور بطریقِ اعظم کی پرجوش تقاریر نے سر دھڑ کی بازی لگانے پر آمادہ کر دیا تھا۔ عماد کاتب کے مطابق ان لڑنے والوں کی تعداد دس ہزار سے کم نہ تھی۔ سلطان صلاح الدین ایوبی بیت المقدس میں خون ریزی سے احتراز کرنا چاہتے تھے مگر نصرانیوں کا جوش

وخروش ظاہر کررہا تھا کہ ارضِ مقدس کی عزت واحترام کے مشترکہ جذبات کے باوجود جنگ ہوکر رہے گی۔

معرکۂ القدس بپا ہوتا ہے

اسلامی لشکر پانچ دن تک القدس کے مغرب میں فروکش رہا۔ اس دوران سلطان اپنے ساتھیوں کے ساتھ القدس کے اردگرد چکر لگا کر فیصلہ کن حملے کے لیے بہتر جگہ تلاش کرتے رہے۔ بیت المقدس کی عمارت اور خاص طور پر گنبدِ صخرہ کو تو شہر کے باہر ہر طرف سے دیکھا جاسکتا تھا مگر اردگرد کی بلند پہاڑیوں اور ٹیلوں سے شہر کے اندر کا منظر بھی صاف نظر آتا تھا۔ اس وقت بیت المقدس پر جگہ جگہ صلیبیں نصب تھیں، فصیل کے ہر برج پر صلیبی نشان والے پرچم پھڑپھڑا رہے تھے۔ ان سب سے بڑھ کر گنبدِ صخرہ پر ایک بہت بڑی صلیب جگمگا رہی تھی۔ یہ مناظر مسلمانوں کی حمیت پر چوٹیں لگا رہے تھے۔ ہر افسر جلد از جلد حملے کے لیے بے چین تھا تاہم مصلحت کا تقاضا یہ تھا کہ پہلے صحیح منصوبہ بندی کر لی جائے اور موزوں تر مقام چن لیا جائے۔ مغرب کی سمت جہاں اس وقت فوج تھی وادی وسیع نہیں تھی۔ پھر یہاں صبح سے لے کر دوپہر تک سورج آنکھوں کے سامنے رہتا تھا، اس حالت میں محصورین کی تیراندازی اور سنگ باری سے بچ کر آگے بڑھنا بہت مشکل تھا۔ شہرِ پناہ اتنی بلند اور مضبوط تھی کہ کسی بھی جانب سے کامیاب حملہ کرنا بہت مشکل تھا۔ جمعہ ۲۰ رجب (۲۵ ستمبر) کی شام سلطان کی افواج اپنے خیمے اور ڈیرے اکھاڑ کر القدس کے سامنے سے ہٹنے لگیں۔ نصرانیوں نے یہ منظر دیکھ کر گمان کیا کہ مسلمان جارہے ہیں، چنانچہ شہر میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ عیسائی خود کو فاتح تصور کرکے مسرت کے نعرے لگانے لگے مگر سلطان نے صرف حملے کی سمت تبدیل کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ رات کو سلطانی افواج القدس کے شمال میں خیمے لگا رہی تھیں۔ اسی رات سلطان کے سپاہیوں نے منجنیقیں نصب کرنا شروع کر دیں، صبح تک وہ اس کام سے فارغ ہو چکے تھے۔ اس جانب شہرِ پناہ کا دروازہ ''بابِ عمود'' کہلاتا تھا۔ فصیل کے پیچھے دور دور تک القدس کی گنجان آبادی تھی۔ بلند عمارتوں کا سلسلہ شہرِ پناہ کے پار سے بھی نظر آتا تھا، یہاں ایک قدیم معبد تھا جو ''کنیسۂ صیہون'' کہلاتا تھا۔ سورج نکلتے ہی حملہ شروع ہوگیا، منجنیقیں فصیل پر بھاری پتھر برسانے لگیں۔ نصرانیوں میں اس شدید حملے سے افراتفری پھیل

گئی مگر جلد ہی وہ منظم ہو گئے۔ انھوں نے بھی جوابی کارروائی کے لیے منجنیقیں تیار کر لیں اور کچھ دیر بعد فصیلِ شہر سے سلطان کی فوج پر سنگ باری کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ پھر اچانک عیسائی گھڑ سوار پر جوش نعرے لگاتے ہوئے شہر سے باہر نکل آئے اور اسلامی لشکر پر ٹوٹ پڑے۔ ایک زوردار معرکہ شروع ہو گیا۔ فرنگی دیر تک لڑتے بھڑتے رہے اور مسلمانوں کو فصیلِ شہر تک پہنچنے سے روکے رکھا۔

اگلے دن بھی اسی طرح جنگ ہوتی رہی، عیسائی گھڑ سوار میدان میں آکر مسلمانوں کو روکنے کی بھرپور کوشش کر رہے تھے۔ ان سے دست بہ دست مقابلے کے دوران سلطان کی فوج کا امیر عزالدین عیش بن مالک شہید ہو گیا۔ وہ ہر دل عزیز شخص تھا، اس کا باپ ''جعبر'' کا قلعہ دار تھا، اس کی شہادت سے مسلمانوں میں ایک جوش پیدا ہو گیا۔ تب اسلامی لشکر نے یک بارگی ایک طوفانی حملہ کیا جس کے سامنے صلیبی گھڑ سوار ٹھہر نہ سکے۔ وہ پشت پھیر کر بھاگے اور شہر پناہ میں داخل ہو گئے۔ مسلمان آگے بڑھتے ہوئے خندق عبور کر کے فصیل سے قریب تر ہو گئے۔ اب فصیل شکن بھاری اسلحہ طلب کیا گیا۔ فصیل پھلانگنے والے جانبازوں اور فصیل کی بنیادوں میں بارودی سرنگیں بچھانے والے ہنرمند اپنے اپنے کارکنوں کے ساتھ تیزی سے آگے آئے۔ مگر ان سب کو روکنے کے لیے فصیل سے نصرانیوں نے زبردست سنگ باری اور تیر اندازی شروع کر دی۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ کھولتا ہوا پانی اور گرم گرم تارکول بھی پھینک رہے تھے۔ فصیل سے ہونے والی شدید مزاحمت کے دوران سرنگیں بچھانے کا کام تسلسل سے نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لیے سلطان کی فوج کے تیر انداز حرکت میں آ گئے۔ منجنیقیں دور سے فصیل پر سنگ باری کرنے لگیں، اس کے ساتھ ساتھ جلتے ہوئے تیل کی ہانڈیاں بھی پھینکی گئیں جن سے فصیل پر جگہ جگہ آگ لگ گئی۔ مسلم تیر انداز مناسب مقامات پر آکر نشانہ بازی کرنے لگے۔ ان کی پوری کوشش یہ تھی کہ عیسائی جنگجوؤں کو فصیل سے ہٹا دیا جائے۔ ادھر سلطان نے اپنی گھڑ سوار فوج بھی میدان میں اتار دی۔ دس ہزار شہ سواروں نے جوزفات اور سینٹ اسٹیفن کے پھاٹکوں پر حملہ کر کے وہاں سے عیسائیوں کو پسپا کر دیا۔ اس وقت تیروں، پتھروں اور آگ کے گولوں کی بارش سے القدس کے شمال میں ایک ہنگامہ محشر بپا تھا۔ فصیل شکن اسلحہ، آہنی پھاٹک توڑنے والے آلات اور سرنگیں بچھانے کا سامان تیزی سے فصیل تک پہنچایا جا رہا تھا۔ یہ سامان آگے منتقل کرنے والوں کی حفاظت کے لیے تیر انداز بار بار تیروں کا مینہ برسا رہے تھے۔ سلطان صلاح الدین ایوبی کو گرد و غبار کے

مرغولوں، خون کے فواروں اور تلواروں کی کوندتی بجلیوں کے درمیان بیت المقدس کا سنہرا گنبد نظر آ رہا تھا۔ سپاہیوں کی للکار، گھوڑوں کی ہنہناہٹ اور تکبیر کے نعروں کے ساتھ انھیں مسجدِ اقصیٰ میں گونجنے والی وہ اذان سنائی دے رہی تھی جو مدتوں سے خاموش تھی۔ تیروں کی بے پناہ بارش دونوں طرف سے جاری تھی کہ سلطان کے اشارے پر پیادہ دستے ڈھالوں کی اوٹ میں فصیل کی طرف بڑھنے لگے تھے۔ ان دستوں کے پیچھے لکڑی کے بلند و بالا مینار نما "دبابے" تھے جنھیں سینکڑوں غلام اور مزدور دھکیل رہے تھے۔ ان کے پہیوں کی گڑگڑاہٹ سے زمین دہل رہی تھی (عربی میں دبابوں کو عرّادات کہا جاتا ہے، یہ اس زمان کی بکتر بند گاڑی تھی)۔ جوں جوں دبابے فصیل کے قریب تر ہو رہے تھے، نصرانیوں کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی، اس کے ساتھ ان کی مدافعت کا جوش و اضطراب بھی بڑھ رہا تھا۔ تاہم ان کی بھرپور مزاحمت کے باوجود مسلمان "دبابوں" کو دھکیل کر فصیل کے ساتھ لے آئے۔ دبابوں کی چوٹی فصیل سے کچھ اوپر ہی تھی۔ اب بہترین تربیت یافتہ سپاہی تیزی سے دبابوں کے اندر لگی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر کے درجے میں پہنچے۔ پھر ایک زوردار نعرے کے ساتھ انھوں نے سامنے لگا دروازہ گرا دیا جس کا دوسرا سرا کسی پل کی مانند فصیل سے جا لگا۔ مسلمان سپاہی نعرۂ تکبیر بلند کر کے اس پل سے فصیل پر کودنے لگے اور پوری فصیل پر ایک خون ریز جنگ شروع ہو گئی۔ شدید لڑائی کے باوجود نصرانیوں نے فصیل پر مسلمانوں کے قدم نہ جمنے دیے۔ شام تک القدس کے برجوں پر صلیبی جھنڈے بدستور لہرا رہے تھے۔ مگر اس دوران مسلمان انجینیروں نے فصیل کی بنیادوں میں سرنگیں بچھانے کا کام بڑی حد تک پورا کر لیا تھا۔ اگلے دن منجنیقوں کی پے در پے سنگ باری اور بارودی سرنگوں کے دھماکوں نے فصیل کا ایک حصہ اڑا کر رکھ دیا۔ عیسائی جو سر ہتھیلی پر رکھ کر لڑ رہے تھے، اب مدافعت سے مایوس ہو گئے۔ ان کے نائٹوں اور جانبازوں نے فصیل کے منہدم حصے پر انسانی جسموں کی دیوار بنا کر مسلمانوں کو اندر داخل ہونے سے روکے رکھا مگر تا بکے۔ بارودی سرنگیں پھٹنے کا سلسلہ جاری تھا اور شگاف وسیع ہوتا جا رہا تھا۔ لین پول اس وقت شہر کی اندرونی حالت بیان کرتے ہوئے بتاتا ہے کہ شہر میں بھگدڑ مچی ہوئی تھی، چرچ لوگوں سے بھر گئے تھے، دعائیں ہو رہی تھیں، لوگ پادریوں کے سامنے اپنے اپنے گناہوں کا اقرار کر رہے تھے اور خود کو اذیتیں دے کر خدا سے رحم کی فریادیں کرتے تھے۔ شہر کو آغوشِ رحمت میں لانے کی خاطر پادریوں اور راہبوں نے انجیل اور صلیب کے ساتھ مناجات گاتے ہوئے شہر میں جلوس نکالا مگر

(خود لین پول کے الفاظ میں): ''خدا اس شہر کی بدکاری اور شہوت پرستی سے نالاں ہو چکا تھا، گناہوں میں ڈوبے ہوئے لوگوں کی دعائیں اس کی دربار میں قبول نہ ہوئیں''۔

صلح کی بات چیت

اب فصیل کا اتنا بڑا حصہ گر چکا تھا کہ عیسائی کسی طرح بھی مسلمانوں کے ریلے کو نہیں روک سکتے تھے۔ اب دو ہی صورتیں تھیں وہ ہتھیار ڈال دیتے یا لڑتے لڑتے مرجاتے۔ عوامی طبقات سے تعلق رکھنے والے سر کردہ لوگ ہتھیار ڈالنے کے حق میں تھے مگر فوجی جرنیل اور پیشہ ور سپاہی لڑکر مرجانے کو ترجیح دیتے تھے۔ اس دوران بطریقِ اعظم ہرکولیس نے ایک درمیانی راہ سمجھائی وہ یہ کہ معقول شرائط پر باعزت صلح کرلی جائے۔ اس مشورے کے مطابق شہر کے سرکردہ افراد پر مشتمل ایک وفد سلطان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ارکانِ وفد نے مقدس شہر سلطان کے حوالے کر دینے پر رضامندی ظاہر کی اور اس کے بدلے سلطان سے جان و مال کی امان طلب کی مگر سلطان صلاح الدین ایوبی کو خوب یاد تھا کہ ان صلیبیوں نے القدس پر قبضے کے وقت بے گناہ مسلمانوں پر کیسے لرزہ خیز مظالم ڈھائے تھے۔ سلطان کے تصور میں وہ ستر ہزار بے گور وکفن جسم تڑپ رہے تھے جنھیں صلیبی درندوں نے اپنی خون آشامی کی بھینٹ چڑھایا تھا۔ مسجدِ اقصیٰ میں پناہ لینے والے ان بچوں اور عورتوں کی چیخیں سلطان کے کانوں میں گونج رہی تھیں جن کی بوٹیاں اڑا دی گئی تھیں۔ شہدا کی وہ پامال لاشیں سلطان کے سامنے آکھڑی ہوئی تھیں جن کے خون کا دریا صلیبی نائٹوں کے گھوڑوں کی لگاموں کو چھونے لگا تھا۔ تب وقت کی باگ شیطان کے کارندوں کے ہاتھوں میں تھی اور رحمان کے بندے بے بس تھے۔ آج اللہ واحد و قہار نے مسلمانوں کو زمانے کی مقتدر قوت بنا دیا تھا۔ آج فیصلے کا اختیار اللہ کے بندوں کے پاس تھا۔ وہ صلیبیوں کو عبرت کا نمونہ بنا سکتے تھے۔ ان کے ماضی کی ستم خیزیوں کو دیکھتے ہوئے وہ ایسا کرنے میں حق بجانب تھے۔ سلطان صلاح الدین ایوبی نے فیصلہ سنا دیا: ''میں بیت المقدس کو تم سے اسی طرح چھینوں گا جیسے اکانوے برس پہلے تم نے مسلمانوں سے چھینا تھا۔ تب صلیبیوں نے قتلِ عام کو روا سمجھا تھا اور کسی جان کو زندہ نہیں چھوڑا تھا۔ پس اب میں صلیبیوں کے مردوں کو قتل کر کے فنا کر ڈالوں گا اور

ان کی عورتوں کو باندیاں بنالوں گا۔ برائی کا بدلہ اس کی مثل ہی ہوتا ہے"۔ سلطان نے اس جواب کے ذریعے اپنے اختیار کو واضح کر دیا تھا۔ تاہم فتح القدس کے بعد انھوں نے مقامی لوگوں سے جو انتہائی فراخ دلانہ سلوک کیا، اسے سامنے رکھیں تو صاف محسوس ہوتا ہے سلطان نے اس وقت وفد پر اسلام کی برتری اور اپنے اختیار کا سکہ جمانے کے لیے یہ سخت فیصلہ سنایا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ پہلے مسلمانوں کے قہر اور شوکت کا رعب طاری کر کے دشمن کے غرور و تکبر کا بت پاش پاش کر دیا جائے اور فتح کے بعد انھیں خلافِ توقع احسانات کرتے ہوئے ممنون کیا جائے۔

بہر حال سلطان کے اعلان نے ان کی توقع کے عین مطابق نصرانیوں کو لرزا دیا۔ جب وفد کے ارکان واپس پہنچے تو القدس میں ایک کہرام مچ گیا۔ سب کو یقین ہو گیا کہ اب وہ زندہ نہیں بچیں گے۔ تب شہر کے عارضی حاکم بالیان نے آخری کوشش کے طور پر ایک بار خود سلطان کے پاس جانے کا فیصلہ کیا۔ بالیان ایک ہوشیار اور دلیر آدمی تھا۔ محاصرے کے دوران بالیان نے القدس کو سلطان سے بچانے کے لیے جو کوششیں کیں اس کی بنا پر اسے یورپی مؤرخین خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں۔ اس نے پہلے سلطان کو خط بھیج کر جان کی امان کے ساتھ حاضری کی اجازت طلب کی کیونکہ سلطان نے اسے جن وعدوں پر قید سے رہائی دی تھی، وہ ان کی خلاف ورزی کا مرتکب ہو چکا تھا۔ لہٰذا اسے سلطان سے عہد شکنی کی سزا کا خوف تھا۔ مگر سلطان نے بڑی بردباری کے ساتھ اسے جان کی امان اور حاضری کی اجازت مرحمت کی۔ تب وہ سلطان کے خیمے میں پہنچا۔ اس نے بڑی منت وزاری کے ساتھ اہلِ شہر کے لیے امان کی درخواست کی مگر سلطان نصرانیوں کو مزید مرعوب کرنا چاہتے تھے۔ ان کا جواب تھا: "تمھارے لیے کوئی امن ہے نہ امان۔ اب ذلت ہی تمھارا اوڑھنا بچھونا ہے۔ کل ہم بزورِ قوت تم پر حکومت کریں گے۔ فوج کو قتل و گرفتاری کی کھلی چھوٹ دیں گے۔ مردوں کا خون بہائیں گے، عورتوں اور بچوں کو قیدی بنائیں گے"۔ جب بالیان نے دیکھا کہ سلطان کو منانا مشکل ہے تو اس نے مایوسی اور غصے کے ملے جلے جذبات سے مغلوب ہو کر کہا: "ٹھیک ہے، جب ہم آپ کی امان سے مایوس اور آپ کے احسان سے محروم کر دیے گئے ہیں اور اب نجات اور صلح و صفائی کی کوئی صورت نہیں رہ گئی تو ہم لڑتے لڑتے مر جائیں گے۔ سلطانِ عالی مقام! آپ جان لیں کہ شہر میں آبادی اتنی زیادہ ہے کہ اس کی تعداد خدا ہی جانتا ہے۔ یہ لوگ امان کی

امید پر سست پڑ گئے ہیں۔ انھیں توقع ہے کہ آپ دیگر شہروں کی طرح انھیں امان طلبی کا مثبت جواب دیں گے۔ یہ لوگ موت سے بے زار اور زندگی کے مشتاق ہیں مگر جب ہم یہ دیکھیں گے کہ موت کے سوا کوئی چارہ نہیں تو بخدا ہم اپنی عورتوں اور بچوں کو خود قتل کر دیں گے۔ مال و دولت اور ساز و سامان کے ذخیروں کو نذرِ آتش کر دیں گے۔ آپ کو غنیمت کے طور پر ایک درہم و دینار بھی نہیں ملے گا، آپ ہمارے کسی مرد و عورت کو غلام یا باندی نہیں بنا سکیں گے۔ صرف یہی نہیں بلکہ پھر ہم گنبدِ صخرہ اور مسجدِ اقصیٰ کو منہدم کر دیں گے۔ ہمارے پاس آپ کے پانچ ہزار مسلمان قیدی ہیں۔ ان سب کو قتل کر دیں گے۔ شہر میں کوئی جانور یا مویشی نہ چھوڑیں گے جو آپ کے کام آئے۔ یہ سب کر کے ہم آپ کے مقابلے میں آئیں گے۔ ہمارا ہر آدمی آپ کے کم از کم ایک آدمی کو قتل کر کے مرے گا اور ہمارا ہر زخمی آپ کے دس افراد زخمی کر چکا ہو گا۔ ہم فاتح نہ ہوئے تب بھی عزت کی موت تو مریں گے۔ بتائیے پھر اس فتح سے آپ کو کیا حاصل ہو گا...؟"۔ بالیان کی اس پر جوش تقریر سے واضح ہو گیا کہ نصرانی مایوس اور خوفزدہ ہیں اور ان سے رحم کے طلب گار بھی۔ پھر مایوسی واشتعال کی انتہا میں وہ مسجدِ اقصیٰ تک کو تباہ کرنے پر آمادہ ہیں۔ سلطان خود بے جا خون ریزی کے خلاف تھے مگر نصرانیوں کی حد سے متجاوز سرکشی دیکھنے کے بعد وہ چاہتے تھے کہ پہلے اسلام کی قوت کا سکہ کفار پر اچھی طرح جما کر نصرانیوں کو گھٹنوں کے بل جھکنے پر مجبور کر دیں، پھر انھیں حسنِ سلوک سے نہال کر دیں۔ اب جبکہ بیت المقدس میں صلیب کی قوت کو توڑا جا چکا تھا، خون ریزی کی نہیں، احسان کی ضرورت تھی۔ پھر بھی سلطان نے ضابطے کی کارروائی پوری کرنے کے لیے علما، امرا اور مشیروں سے مشورہ کیا۔ سب نے سلطان کو نرمی اختیار کرنے کی رائے دی۔

معاہدۂ القدس

آخر سلطان نے مذاکرات کی پیش کش قبول کر لی۔ صلح کی ابتدائی بات چیت میں طے یہ ہوا کہ اہلِ شہر کو جان کی عام امان دی جائے گی۔ تاہم وہ مسلمانوں کے ہاتھوں میں قیدی تصور کیے جائیں گے، اس کے بعد مسلمان انھیں طے شدہ نرخ یا زرِ فدیہ کے مطابق رہا کرتے جائیں گے۔ معاہدے کی خوش خبری القدس پہنچی تو جان سے مایوس ہونے والوں میں زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ سلطان اور نصرانی نمائندوں کے درمیان مزید چند ملاقاتوں اور

اجلاسوں کے بعد دیگر تفصیلات بھی طے ہوگئیں۔ طے یہ پایا کہ ہر مرد چاہے مال دار ہو یا غریب، دس دینار زرِ فدیہ ادا کرے گا۔ عورت پانچ دینار اور بچے اور بچیاں دو، دو دینار ادا کر کے آزاد ہوتے جائیں گے۔ زرِ فدیہ کی ادائی کے لیے خاصا وسیع وقت دیا گیا، یعنی چالیس دن۔ جو شخص اس مدت کے گزرنے پر بھی ادائی نہ کر سکے گا وہ بہر حال غلام شمار ہوگا۔ نصرانیوں کے مویشیوں، اناج خانوں، گوداموں، اسلحہ خانوں اور خالی گھروں کو مسلمانوں کی ملکیت مانا جائے گا۔ تمام نصرانیوں کو دوسرے محفوظ شہر (صور) تک بحفاظت پہنچانے کا کام مسلمانوں کے ذمے ہوگا۔ بالیان، پادری، ہاسپٹلرز، ٹیمپلرز اور دیگر جنگجو گروہوں کے افراد، پیشہ ور سپاہی، نائٹ، یروشلم کے اسیر بادشاہ گائی کی ملکہ اور تمام خواص بھی اس معاہدے میں شامل سمجھے گئے۔ سب کو جان کی امان دی گئی تھی۔ سلطان نے کسی سخت سے سخت دشمن کا بھی استثنا کر کے اس کا خون بہانے پر اصرار نہیں کیا۔ بات چیت کے دوران بالیان نے ہزاروں غریب شہریوں کی طرف سے جو زرِ فدیہ کی ادائی سے معذور تھے، تیس ہزار دینار پیش کرنے کی تجویز دی۔ سلطان نے اسے بھی قبول کیا۔ مسلمانوں اور نصرانیوں کے درمیان اس معاہدے پر ۲۷ رجب ۵۸۳ھ/۱۲، اکتوبر کو دستخط کیے گئے۔ اسی دن شہر مسلمانوں کے حوالے کر دیا گیا۔

یہ امت کی تاریخ کا ایک ناقابلِ فراموش دن تھا۔ ارضِ مقدس اس دن فاتحینِ اسلام کی قدم بوسی کر رہی تھی، مسلمانوں کے چہروں پر خوشی، نشاط اور بشاشت کا ایسا عالم تھا جو کبھی دیکھنے میں نہ آیا تھا۔ القدس کی روح پرور فضا کا ہر جھونکا ان کے مشامِ جان کو معطر کر رہا تھا۔ سلطان صلاح الدین ایوبی اور ان کے عالی ہمت رفقا کے جذبات ثریا کی بلندیوں پر تھے۔ احساسِ تشکر میں بسی مناجاتیں ان کے ہر سانس کے ساتھ جاری تھیں۔ ان کے دل کی ہر دھڑکن کے ساتھ سپاس و منّت کے ترانے عرش تک پہنچ رہے تھے۔ القدس کے قلعے فصیل اور برجوں سے صلیبیں ہٹائی جا رہی تھیں، ان کی جگہ سرخ ہلالی پرچم نصب کیے جا رہے تھے۔

* * * * *

ماخذ: فاتح و محافظِ القدس سلطان صلاح الدین ایوبی: شخصیت و کارنامے، مولانا محمد اسماعیل ریحان، المنہل پبلشرز کراچی، ص: ۴۲۳

ممتاز لیاقت

صبحِ قیامت

سقوطِ قدس اور صیہونی لشکروں کے مظالم کی خونچکاں روداد

جون، ۱۹٦۷ء

﴿إِنَّ اللهَ اشْتَرَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُم بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ﴾(سورۃ التوبۃ، ۱۱۱)

القدس، پیغمبروں کی سرزمین، امّتِ مسلمہ کا قبلۂ اوّل، سرورِ کائنات ﷺ کے سفرِ معراج کی پہلی منزل، وہ سرزمین جس کے ذرے ذرے پر تیرہ صدیوں کی اسلامی تاریخ کے نقوش ثبت ہیں۔ ۷، جون ۱۹٦۷ء تاریخِ اسلام کا ایک الم ناک ترین دن ہے۔ اس روز القدس پر کیا گزری؟ یہ ایک ایسی داستان ہے کہ جسے سننے کے لیے پتھر کا دل چاہیے۔ یہ کہانی ایسی ہے جسے ہر شخص اشک بار آنکھوں سے سنا تا ہے۔

سپیدۂ سحر نمودار ہو چلا ہے۔ پیغمبروں کی یہ سرزمین پارے کی طرح لرز رہی ہے۔ القدس کے باشندوں نے پچھلی دو راتیں آنکھوں میں کاٹی ہیں۔ شرقِ اردن اور عراق کی فوجیں دیوارِ گریہ کے اُس پار یہودی علاقے میں دشمن پر آگ برسا رہی ہیں۔ توپوں کی گولہ باری اور جہازوں کی بمباری سے در و دیوار لرز رہے ہیں۔ گھن گرج اتنی ہے کہ دل دہل جاتے ہیں۔ ننھے بچّے ماؤں کے سینے سے چمٹے آنکھوں ہی آنکھوں میں پوچھ رہے ہیں کہ ہماری گیتی پر کیا بیت رہی ہے؟ بوڑھے پریشان، آسمان کی جانب آنکھیں اٹھائے اپنے دونوں ہاتھوں کو پھیلائے آنسوؤں کی بھیک مانگ رہے ہیں۔ اور نوجوان ہاتھوں میں خنجر، لاٹھیاں، تلواریں اور بندوقیں لیے گلی کوچوں کے ناکوں پر سینے تانے پہرہ دے رہے ہیں جیسے فولادی دیوار ہوں۔ پو پھٹ رہی ہے، مسجدِ اقصیٰ کے مشرقی کنارے پر شفق کی سُرخی اور گہری ہوگئی ہے، یُوں لگتا ہے جیسے القدس کے پچاس ہزار عربوں نے اپنے خون سے آسمان کو لالہ زار بنا دیا ہے۔ اچانک مسجدِ اقصیٰ کے مینار سے اذان کی آواز گونجتی ہے۔ اس مینار سے مؤذن اہلِ

ایمان کو صدیوں سے بلاوا دیتے آئے ہیں۔ "آؤ نماز کی طرف، دوڑو فلاح و کامرانی کی طرف"۔ اور شہر کے باشندوں نے اس اذان کو پہلے بھی کئی بار سنا ہے، لیکن آج تو یُوں لگتا ہے جیسے یہ اذان نہیں بلکہ آخری انتباہ ہے جو محرابِ عمر رضی اللہ عنہ سے مسلمانوں کو کیا جا رہا ہے۔ آہ! مؤذن کی پکار بے پناہ درد و اضطراب میں ڈوبی ہوئی ہے۔ اس کی آواز کبھی اُبھرتی، کبھی دھیمی ہوتی ہے۔ خون کے آنسوؤں میں بھیگی ہوئی پکار کا ایک ایک لفظ دلوں پر قیامت ڈھا رہا ہے۔ اب مؤذن کی آواز سِسکیوں میں تبدیل ہوگئی ہے۔ اور جب وہ کہتا ہے: حَيَّ عَلَى الصَّلٰوة (نماز کی طرف دوڑو) تو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتا ہے۔ لاؤڈ اسپیکر پر اُس کی سِسکیاں اور دبی دبی چیخیں القدس کے شہریوں کے دل میں تیر کی طرح اُتر جاتی ہیں، ان چیخوں کی آواز جہاں تک پہنچتی ہے، لوگ رونے لگتے ہیں۔ آج انھیں احساس ہُوا ہے کہ مؤذن انھیں جس راہ کی طرف بلاتا رہا ہے وہ اس سے کس طرح اعراض کرتے رہے ہیں۔ آج یہ اس کی آخری پکار ہے۔ جو بیت المقدس کی فضا میں گونج رہی ہے، تقریبًا پونے چھے سو برس قبل بھی اس پر ایک دَور ایسا آیا تھا جب اس کی فضا اذان سے محروم رہی۔ یہ عرصہ پورے نوے برس پر محیط تھا۔ مسلمانوں کو اس عرصے میں بے انتہا قربانیاں دینا پڑیں۔ تب کہیں صلاح الدین ایوبی رحمۃ اللہ علیہ کی قیادت میں وہ اس مقدس شہر کو غاصبوں کے چنگل سے نجات دلانے میں کامیاب ہو سکے۔ اب یہ فضا پھر اس پکار سے کتنی دیر محروم رہے گی؟ اور اس ارضِ پاک کو غاصب یہودیوں کے چنگل سے چھڑانے کے لیے عالمِ اسلام کو کتنا خون دینا پڑے گا؟ اس کا تصور بھی انھیں رُلائے دیتا ہے۔

دھیرے دھیرے سورج کی روشنی پھیل رہی ہے، سورج نے مشرق سے ابھر کر سر باہر نکالا ہے اور چھے سو برس بعد پہلی مرتبہ دیکھا ہے کہ فلسطین پر ایسی قیامت ٹوٹ پڑی ہے کہ جو پہلے چشمِ فلک نے نہیں دیکھی تھی۔ اردنی فوجوں کی مزاحمت ختم ہو چکی ہے، اکثر سپاہی اپنی جانیں نچھاور کر چکے ہیں، باقی پیچھے ہٹ آئے ہیں۔ گاہے گاہے گولہ باری کی آواز اب بھی آجاتی ہے۔ یہودی فوجوں نے بیت المقدس کو گھیر لیا ہے۔ شہریوں کی زبردست مزاحمت سے مقابلے کے بعد ان کے دستے سٹیفن گیٹ اور بابِ دمشق سے شہر میں داخل ہوگئے ہیں اور وسطِ شہر کی طرف بڑھ رہے ہیں، مسلمان قدم قدم پر ان کی مزاحمت کرتے ہیں۔ بالا خانوں اور کھڑکیوں سے گولیاں برس رہی ہیں، اسرائیلی مشین گنوں اور مارٹر توپوں کے منھ کھول دیتے ہیں اور دو گھنٹے کے اندر شہریوں کی

مزاحمت دم توڑ دیتی ہے۔ القدس پر قیامت گزر گئی ہے۔ ان دو گھنٹوں کی کہانی دردناک داستان ہے۔ ظلم و جور کے وہ کون سے پہاڑ ہیں جوان عربوں پر نہیں ٹوٹے ؟ اسرائیلی فوجیں شہر میں داخل ہوئیں تو انھیں یہ محسوس ہوا کہ ہر دروازے پر ان کا دشمن سینہ تانے کھڑا ہے۔ کسی نے بندوق سے مقابلہ کیا اور کوئی ننگی تلوار لے کر ٹوٹ پڑا۔ بعض نے ترکاری اور تربوز تراشنے والے چاقو ہی سٹین گنوں سے مسلح اسرائیلیوں کے پیٹ میں گھونپ دیے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اسٹالن گراڈ کے گلی کوچوں میں لوگوں نے بے جگری سے مقابلہ کیا اور اپنے شہر کو دست بُرد سے بچالیا تھا۔ لیکن بیت المقدس کے مسلمانوں نے روسیوں سے بھی زیادہ بے جگری کا مظاہرہ کرتے ہوئے ارضِ مقدس پر جان قربان کردی ہے، وہ کون سی گلی ہے جو نوجوان عربوں کی لاشوں سے اٹ نہ گئی ہو؟ اور وہ کون سا دروازہ ہے جس کی دہلیز پر خون میں لت پت اردنی مقابلہ کرتے ہوئے شہید نہ ہو گئے ہوں؟ خود مسجدِ اقصیٰ کے صدر دروازے پر اپنی مقدس عبادت گاہ، اپنے قبلۂ اوّل کے لیے جان کی بازی لگانے والے مسلمانوں کی لاشوں کا ڈھیر لگا ہوا ہے۔ ہیکلِ سُلیمانی کا خواب دیکھنے والے یہودی مسجدِ اقصیٰ کے اندر داخل ہو گئے۔ مسجد کا مؤذن عزیز، ان کے سامنے سینہ تان کر کھڑا ہو گیا۔ شیر کی طرح بپھرا اور چیتے کی طرح تنہا ہی دشمن پر ٹوٹ پڑا۔ اس کے ہاتھ میں صرف ایک آہنی سلاخ ہے، جس کی لمبائی چھ فٹ سے زیادہ نہیں، یہودی سپاہیوں نے ایک قہقہہ لگایا اور رائفل کی سنگین اس کے سینے سے پار کردی۔ مسجدِ عمر رضی اللہ عنہ سے اذان بلند کرنے والی آواز ہمیشہ کے لیے خاموش کر دی گئی۔ نمازِ ظہر کے وقت پہلی مرتبہ یہاں اذان کی آواز بلند نہیں ہوئی۔ اب یہودی گلی کوچوں میں بوڑھوں، عورتوں اور بچّوں پر یُوں پل پڑے، جیسے وہ صدیوں سے مسلمانوں کے خون کے پیاسے ہوں، مقابلہ کرنے والے نوجوان یکے بعد دیگرے جامِ شہادت نوش کر چکے ہیں۔ گلی کوچوں میں ہر طرف لاشیں بکھری ہوئی ہیں۔ گھروں اور اسپتالوں میں لاشوں کے انبار لگے ہیں۔ نزارہ کے مشن اسپتال میں غیر ملکی رپورٹر ایک امریکی اخبار نویس کی لاش لینے پہنچے، کیا دیکھتے ہیں کہ ایک کمرے میں دیواروں کے ساتھ ساتھ فرش سے چھت تک لاشوں کے انبار لگے ہیں۔ اسپتال کا بوڑھا پادری کہتا ہے: ”تم ایک شخص کی لاش لینے آئے ہو، ہمارے پاس تو بے شمار لاشیں ہیں، تمھیں بس ایک لاش کی فکر ہے، اور بھی لو نا“۔ یہ کہہ کر وہ فرش پر لگے ہوئے ایک ڈھیر سے کمبل ہٹا دیتا ہے۔ گڑیوں کی طرح چھوٹے چھوٹے اردنی بچّوں کے خُون میں لت پت ٹوٹے پھوٹے ڈھانچے بڑا

ہی دردناک منظر پیش کررہے ہیں۔ ان بچّوں کے درمیان ایک اردنی خاتون ہاتھ پھیلائے اس طرح پڑی ہے، جیسے وہ انھیں آسمان سے برستی ہوئی آگ سے بچانے کی کوشش کررہی ہو۔

دشمن نے ہزاروں لاشوں پر سے گزر کر القدس فتح کرلیا ہے، جو لوگ بچ گئے ہیں ان میں سے اکثر زخموں سے چُور ہیں، مگر ان کے دل اب بھی غیر مفتوح ہیں۔ جگہ جگہ کمین گاہیں قائم ہیں جہاں سے اسرائیلیوں پر گاہے گاہے فائرنگ ہوتی رہتی ہے۔ اسرائیلی شہر پر قابض ہونے کے باوجود اپنے آپ کو محصور تصور کرتے ہیں۔ سرفروش نوجوان کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے، اسرائیلی آچکے ہیں۔ اپنے ایک ایک زخمی اور مرنے والے کا انتقام دس دس بارہ بارہ اردنیوں سے لیتے ہیں۔ مگر حملوں کے واقعات میں کمی نہیں آنے پائی۔ تحریکِ مزاحمت کے نوجوان ڈھونڈ ڈھونڈ کر گرفتار کیے جارہے ہیں۔ دیوارِ گریہ کے اس پار شارع اللحم پر شہر کے رئیس طارق الاحد کا خوبصورت بنگلہ ہے، وہ یہودیوں کا مقابلہ کرتے ہوئے جامِ شہادت نوش کرچکے ہیں، اسرائیلی سپاہی بنگلے میں داخل ہورہے ہیں۔ شہید کی بیوہ نے یہ دیکھ کر پستول نکال لیا ہے لیکن اس سے پہلے کہ کوئی گولی پستول سے نکل کر کسی یہودی کو ٹھنڈا کرے، خود اُن کے سینے میں کئی گولیاں پیوست ہو جاتی ہیں۔ یہودی سپاہیوں نے پے درپے گولیاں چلاکر ان کے سینے کو چھلنی کردیا ہے۔ اس وقت ان کے تین نوعمر بچّے ایک دوسرے سے چمٹے ہوئے ایک کونے میں کھڑے ہیں۔ ان میں بڑے کی عمر گیارہ سال اور چھوٹے کی تین سال ہے۔ ننھے سہیل کو صرف اتنا معلوم ہے کہ جب ماں غضب ناک ہوتی اور اسے ڈانٹنے کے لیے ہاتھ اٹھاتی تھیں تو وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر معافی مانگ لیا کرتا تھا اور اس وقت امی اسے لپک کر اٹھالیتیں اور سینے سے لگالیا کرتی تھیں۔ اُس نے یہودیوں کو غضب ناک دیکھا تو غیر شعوری طور پر دونوں ننھے ننھے ہاتھ جوڑ دیے لیکن اسے امی کے پیار کے بجائے پہلے تو ایک زناٹے دار تھپڑ ملتا ہے۔ پھر ایک یہودی نے اس کے پیٹ میں سنگین چبھو کر اچھال دیا اور یہ کہتا ہوا باہر نکل گیا ہے: ’’سانپ کے بچے کو بھی زندہ چھوڑنا یہودیوں سے دشمنی کے مترادف ہے‘‘۔[1]

---

[1] یہ واقعہ مہاجر کیمپ میں پہنچ کر ننھے سہیل کے گیارہ سالہ بھائی نے سنایا۔ (الجمہوریہ قاہرہ)

یہودی فوج ایک نوجوان یوسف قمر کی تلاش میں ہے، ایک دستہ ایک دو منزلہ مکان کو گھیر لیتا ہے، فوجی افسر دروازے پر دستک دیتا ہے، ایک بوڑھا عرب دروازہ کھولتا ہے، اسرائیلی درّانہ اندر گھس جاتے ہیں، مکان کا کونا کونا چھانتے اور یوسف قمر کو ڈھونڈ نکالتے ہیں۔ فوجی گاڑی اسے لے کر روانہ ہو جاتی ہے۔ یوسف ہتھکڑی پہنے درمیان میں ہے اور اس کے دائیں بائیں آگے پیچھے اسرائیلی فوجی رائفلوں پر سنگین چڑھائے بیٹھے ہیں۔ دُور ایک دو منزلہ مکان کی کھڑکی سے آلِ معلمی کا ایک نوجوان یہ منظر دیکھ رہا ہے۔ وہ یوسف قمر کا بچپن کا دوست ہے۔ دونوں اسکول میں ایک ساتھ پڑھتے رہے ہیں۔ دونوں القدس کی فضا میں اکٹھے پروان چڑھے ہیں اور دونوں یہودیوں کے ساتھ لڑے جانے والے معرکوں میں دوش بدوش حصہ لیتے رہے ہیں۔ معلمی کے ہاتھ میں دستی بم ہے۔ بم کا پن اس نے نکال لیا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ آنے والی فوجی گاڑی پر دے مارے مگر یوسف قمر کو دیکھ کر رک جاتا ہے۔ اس کا دماغ کہتا ہے: ''بم مارو''، لیکن دل آڑے آجاتا ہے، بچپن کا ساتھی مارا جائے گا۔ گاڑی قریب تر آتی جا رہی ہے، وہ فرض اور محبّت کی کش مکش میں مبتلا ہے، اب اسرائیلی یُوسف قمر کو لیے بالکل قریب پہنچ جاتے ہیں۔ یوسف کی نگاہیں بے اختیار اپنے دوست کے مکان کی طرف اٹھ جاتی ہیں، وہ دیکھتا ہے کہ معلمی کھڑکی میں کھڑا ہے اور بم اس کے ہاتھ میں ہے، فوراً سمجھ جاتا ہے کہ معلمی کش مکش میں ہے۔ وہ اشارے سے کہتا ہے: ''ہچکچاؤ مت۔ بم پھینک دو۔ میری پروانہ کرو''۔ معلمی نفی میں سر ہلا دیتا ہے، فوجی گاڑی اب کھڑکی کے عین نیچے پہنچ گئی ہے۔ اسرائیلی یوسف قمر کی آنکھوں کے اشارے سے چوکنے ہو جاتے ہیں۔ ان کی نگاہیں اُوپر اٹھتی ہیں اور وہ معلمی کو بم ہاتھ میں لیے دیکھ لیتے ہیں۔ ایک فوجی اپنی بندوق چھتیاتا ہے، مگر ابھی وہ گھوڑا دبانے بھی نہیں پاتا کہ معلمی بم دے مارتا ہے۔ بم ایک خوفناک دھماکے کے ساتھ پھٹتا ہے۔ فوجی گاڑی اور اس میں سوار سب لوگوں کے پرخچے اُڑ جاتے ہیں۔ معلمی کی آنکھیں اشک بار ہو جاتی ہیں مگر اپنے دوست کی موت پر آنسو بہانے کا وقت کہاں ہے؟ چند لمحے بعد فوج کی زبردست جمعیت بلڈوزر لے کر پہنچ جاتی ہے، معلمی کا مکان مسمار کیا جا رہا ہے۔ مکینوں کو باہر نکلنے کی مہلت بھی نہیں دی گئی۔ مکان اپنے مکینوں سمیت زمین کے برابر کر دیا جاتا ہے۔ جو لوگ مکان کے ملبے تلے زندہ دفن ہو گئے ہیں۔ ان میں ایک بچہ بھی ہے، جو صرف بیس دن پہلے پیدا ہوا تھا۔ القدس میں کئی روز سے قتل وغارت کا سلسلہ

جاری ہے، اسرائیلیوں کے ہاتھ سے کوئی بھی محفوظ نہیں ہے۔ بوڑھے نہ جوان نہ بچّے۔ عورتیں اپنے گوہرِ عصمت سے محروم کی جاچکی ہیں۔ بوڑھوں کو گھروں سے ہانک کرلے جاتے ہیں اور ان سے دھوپ میں دوڑ لگواتے ہیں۔ یہ سب کچھ اسرائیلی فوج کے اعلیٰ افسروں کے سامنے ہورہاہے، بعض غیر ملکی نامہ نگار اسرائیلی فوجیوں کی چیرہ دستیوں کا ذکر جب اسرائیلی ہائی کمان سے کرتے ہیں توانھیں جواب ملتاہے: ''آخر ہمارے فوجی انسان ہی توہیں'' اور یہ ''انسان'' وہ سب کچھ کررہے ہیں جن کا مجرم یہودی، نازیوں کو گردانتے ہیں۔ رات کے وقت کرفیو لگادیا جاتاہے۔ کوئی شخص اپنے گھر سے نکل نہیں سکتا۔ اس دوران میں یہودی فوجی دکانوں کے دروازے توڑکر گھس جاتے ہیں اور جو چیز بھی ہاتھ لگتی ہے، فوجی گاڑیوں میں لاد کرلے جاتے ہیں۔ عبادت گاہوں کی حرمت ان کی نظر میں سرے سے ہے ہی نہیں۔ بیتِ لحم کی مسجدوں اور کلیساؤں کو اسرائیلی طیاروں نے تاک تاک کر تباہ کیا ہے۔ بطرون کے علاقے میں تو مساجد اور گرجاگھروں کا بالکل صفایا کردیا ہے، فتح کے بعد انھوں نے مسجدِ اقصیٰ کے صحن میں جشنِ مے نوشی منایا اور خدا جانے کہ القدس کے مقدس مذہبی مقامات کی یہ بے حرمتی کب تک ہوتی رہے گی؟[۲]

* * * * *

ماخذ: تاریخِ بیت المقدس، ممتاز لیاقت، سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۰۳ء، ص: ۱۳۰

[۲] یہ باب جنگ کے فوراً بعد کے عرب اخبارات بالخصوص بیروت کے ہفت روزہ 'الجمہوریہ جدیدہ' کی رپورٹوں سے مرتب کیا گیاہے، جس کا نامہ نگار جنگ بندی کے بعد چُھپ کر مقبوضہ عرب علاقے میں گیا تھا۔

فاضل جمیلی

یروشلم ہے کہ راہِ غم ہے! . . .

یروشلم ہے کہ راہِ غم ہے
مقامِ گریہ، مقامِ مصلوبیت سے بابِ مغاربہ تک
سبھی کے رُوح وبدن شکستہ
سبھی کی پیشانیاں ہیں زخمی
بجائے مرہم، مگر زمانوں کے تن بدن پر،
غزہ کی پٹی بندھی ہوئی ہے
کوئی محلہ نہیں ہے ایسا
کہ جس میں دیوارِ اجنبیت کا کوہِ ہیکل نہ آگیا ہو
اے بابِ اسباط کے مکینو!
کبھی جو بابِ دمشق سے ہو گزر تمھارا
تو بابِ صیہون کی قسم ہے
ہماری جانب بھی دیکھ لینا
زمیں سے تا آسماں معلق جو سلسلہ ہے
ہمارے خوابوں سے آملا ہے
کبھی جو قبلہ ہوا تمھارا
وہ اب ہمارا بھی قرطبہ ہے

اے شہرِ داؤد کے مقدس چراغ دانو!

رہیں تمھاری لویں سلامت

قبول ہو ہر دعاے اقصیٰ

سنائی دے ہر اذان اُونچی

رہے چٹانوں کی شان اُونچی

انھی اذانوں، انھی چٹانوں میں کچھ صدائیں بھی گونجتی ہیں

جو آنے والے ہر اک زمانے سے پوچھتی ہیں

یروشلم ہے کہ راہِ غم ہے؟

یہ غم ہی قرنوں سے ہم قدم ہے

تو کیا کبھی بھی نہ اب سکینہ ظہور ہو گی؟

تو کیا کبھی بھی یہ بابِ رحمت نہیں کھلے گا؟

* * * * *

مولانا عبدالغفور صدیقی
استاذ فقہ اکیڈمی

آزادیِ فلسطین کی جدوجہد

قیامِ ریاست سے ۸۲ء کی جنگِ لبنان تک

مئی ۱۹۵۰ء میں امریکہ، برطانیہ اور فرانس نے مشترکہ طور پر اسرائیل کی مکمل حمایت کا اعلان کیا۔ اس مشترکہ بیان میں تمام عرب ممالک کو روڈس امن معاہدے پر کاربند رہنے کی تاکید کی گئی۔ تین بڑی طاقتوں سے تحفظ کی ضمانت ملنے کے بعد یہودی خارجی خطرے سے بے فکر ہو کر نوزائیدہ ناجائز ریاست کے داخلی استحکام کی طرف متوجہ ہوئے۔ اسرائیلی وزیر اعظم ڈیوڈ بن گوریان کی سربراہی میں تل ابیب میں ہونے والے ایک اجلاس میں اس داخلی استحکام کے لیے وسیع پیمانے پر فلسطینیوں کے قتلِ عام اور جلاوطنی کو ناگزیر قرار دیا گیا۔ چنانچہ اس منصوبے پر عمل پیرا ہوتے ہوئے یہودی افواج نے فلسطینی مسلمان عوام کے قتلِ عام کے نئے دور کا آغاز کر دیا۔ جو گزشتہ سے بھی زیادہ بھیانک اور سنگین تھا۔

قتلِ عام کے چند واقعات

دیر ایوب ۱۹۵۰ء: اردن کے اس علاقے میں اسرائیلی افواج نے لکڑیاں جمع کرتے تین معصوم بچوں میں سے دو کو گولی مار کر شہید کر دیا۔

شرفات ۱۹۵۱ء: القدس کی اس مسلمان بستی میں یہودی فوجیوں نے ایک گھر میں گھس کر دو بوڑھے مرد، تین خواتین اور پانچ معصوم بچوں کو بے دردی سے شہید کر دیا۔ ان بچوں کی عمریں تین سے بارہ سال کے درمیان تھیں۔

بیتِ لحم ۱۹۵۲ء: القدس کے علاقے میں محلہ بیتِ لحم میں گھس کر یہودیوں نے ایک بوڑھے مرد، دو خواتین اور چار معصوم بچوں کو شہید کر دیا۔ ان بچوں کی عمریں دس سال سے کم تھیں۔

اقرت ۱۹۵۲ء: اس سال کے آخر میں لبنان کی سرحد پر واقع اس بستی کو آگ لگادی گئی اور یہاں کے مکینوں کو زبردستی لبنان میں دھکیل دیا گیا۔ پچاس کے قریب لوگ زخمی ہوئے۔

ریحانیہ ۱۹۵۳ء: اس پوری بستی کو تباہ کرکے یہاں کے مسلمانوں کو شام کی طرف جلاوطن کردیا گیا۔

نحالین ۱۹۵۴ء: القدس کی اس بستی میں بچوں اور خواتین سمیت دس افراد کو شہید کیا گیا۔

غزہ ۱۹۵۵ء: اسرائیلی فوج جنگ بندی لائن عبور کرکے رات کی تاریکی میں غزہ میں داخل ہوئی اور پناہ گزین کیمپ میں چالیس مسلمان مرد و خواتین اور بچے شہید کردیے۔ ان کی مدد کے لیے آنے والی مصری فوج پر بھی حملہ کیا جس میں مصری فوجی بھی شہید ہوئے۔

حوسان ۱۹۵۶ء: بیتِ لحم کے قریب اس مسلمان بستی کو مکمل تباہ کردیا گیا۔ تیس سے زائد مسلمان شہید ہوئے۔ یہاں مسلمان خواتین کو سر کے بالوں سے پکڑ کر گھسیٹا گیا۔

کفر قاسم ۱۹۵۶ء: حوسان میں قتلِ عام کے ایک ماہ بعد مغربی کنارے کی جنگ بندی لائن کے قریب واقع اس علاقے میں یہودی افواج نے چالیس سے زیادہ نہتے کسانوں کو شہید کردیا جو دن بھر کھیتی باڑی کرکے واپس آرہے تھے اور کرفیو کے اعلان سے بے خبر تھے۔

غزہ ۱۹۵۶ء: اس سال کے آخر میں یہ علاقہ ایک بار پھر اسرائیلی درندگی سے لرز اٹھا۔ اسرائیلی افواج نے خانیونس کے پناہ گزین کیمپ میں قتلِ عام شروع کردیا۔ یہ قتلِ عام دس دن تک جاری رہا اور رفح تک پھیل گیا۔ یہاں ایسے ہولناک واقعات ہوئے کہ انسانیت شرما جاتی ہے۔ لوگوں کے ہاتھ پشت پر باندھ کر انھیں لائنوں میں کھڑے کرکے گولیاں ماری گئیں، کئی مسلمان خواتین کی عصمتیں پامال کی گئیں اور معصوم بچوں کو ذبح کیا گیا۔

فلسطینی مزاحمت

ان سالوں میں اگر کسی مسلمان بستی سے مزاحمت کی بُو بھی محسوس ہوئی تو اُسے فوری نیست و نابود کردیا جاتا۔ اگر کسی فرد پر مزاحمت کا شک بھی ہوا تو اُسے خاندان سمیت قتل کردیا گیا۔ مثلاً ۱۹۵۲ء میں قفین بستی کے مجاہد مصطفیٰ خلیل کے گھر میں گھس کر یہودیوں نے ان کی اہلیہ اور چار بچوں کو بے دردی سے شہید کردیا۔

چھوٹا بچہ ایک سال اور سب سے بڑا دس سال کا تھا۔ ۱۹۵۳ء میں مغربی کنارے کے علاقے قبیا میں یہودی گھرانے پر بم حملہ ہوا جس میں دو افراد مارے گئے۔ جواب میں اسرائیلی فوجیوں نے پوری بستی کو بموں سے تباہ کر دیا۔ یہاں ستر سے زیادہ فلسطینی شہید ہوئے۔ ۱۹۵۶ء میں مغربی کنارے کی جنگ بندی لائن کے قریب قلقلیہ کے علاقے کے مکینوں نے یہودی مظالم کے خلاف مزاحمت کا منصوبہ بنایا۔ اس منصوبے کی بھنک یہودیوں کو پڑگئی۔ چنانچہ آدھی رات کو یہودی افواج نے اس علاقے میں داخل ہو کر قتلِ عام شروع کر دیا۔ مسلمانوں کے مکانات بموں سے اڑا دیے گئے۔ یہاں بھی کئی خواتین کی عصمت دری ہوئی اور ستر سے زیادہ لوگ شہید ہوئے۔ اردنی فوج مدد کو آنے لگی تو ان کے راستے میں پہلے سے بارودی سرنگیں نصب کر دی گئی تھیں۔ دو گاڑیاں تباہ ہوئیں اور کئی اردنی فوجی بھی شہید ہوئے۔ ۱۹۵۶ء میں نابلس کے مضافات میں چند فلسطینی نوجوان مزاحمت کی منصوبہ بندی کر رہے تھے۔ اسرائیلی افواج نے ان کو گرفتار کر لیا۔ لیکن پھر کبھی پتا نہیں چل سکا کہ یہ کہاں گئے۔ یاد رہے کہ اُس دور کے قتلِ عام کی بیش تر کارروائیوں میں اسرائیلی فوجی دستوں کی قیادت ایریل شیرون نے کی، جو بعد میں اسرائیل کے اہم عسکری و سیاسی عہدوں پر فائز رہا اور آخر ۲۰۰۱ء میں اسرائیل کا گیارھواں وزیرِ اعظم بھی منتخب ہوا۔ یہ آخری عمر میں یہودیت کی طرف سے اسے اعزاز دیا گیا۔ ۱۹۵۰ء سے ۱۹۵۶ء تک یورپ، امریکہ اور دیگر ممالک سے فلسطین میں یہودیوں کی آمد کا سلسلہ جاری رہا۔ محتاط اندازے کے مطابق اس عرصے میں چھ لاکھ کے قریب مزید یہودی فلسطین میں آباد ہوئے۔ اس دوران ۱۹۵۰ سے ۱۹۵۶ء تک فلسطینی شہری مصر سے فلسطین میں داخل ہو کر یہودیوں کے خلاف چھوٹے پیمانے پر جنگی کارروائیاں کرتے رہے۔

۱۹۵۶ء کی مصر اسرائیل جنگ

مصر میں اس وقت جمال عبد الناصر حکمران تھے۔ جنھوں نے ۱۹۵۲ء میں شکست خوردہ دیگر فوجی افسران کے ساتھ مل کر بغاوت کے ذریعے اقتدار سنبھالا تھا۔ پہلے جنرل نجیب اور پھر خود صدر منتخب ہوئے۔ صدر ناصر عرب قومیت اور سوشلزم کے بڑے داعی تھے۔ سوویت یونین کے انتہائی قریب تھے۔ ۱۹۵۵ء میں

انھوں نے سوویت یونین کی سرپرستی میں چیکوسلواکیہ سے اسلحہ خریداری کا معاہدہ بھی کیا۔ اور سویت حمایت میں معاہدۂ بغداد سے بھی دور رہے جو امریکہ نے سوویت یونین کو مشرقِ وسطیٰ میں روکنے کے لیے تشکیل دیا تھا۔ صدر ناصر اپنی پالیسیوں کے نفاذ میں اسلام پسندوں کو سب سے بڑی رکاوٹ سمجھتے تھے۔ اس لیے برسرِاقتدار آتے ہی انھوں اپنے اوپر ہونے والے حملے کو بنیاد بنا کر الاخوان المسلمون پر پابندی عائد کر دی اور اس کی قیادت کو پابندِ سلاسل کر دیا گیا۔ صدر ناصر کے دور میں اخوانیوں پر شدید ترین مظالم ڈھائے گئے۔

جنگ کے اسباب

یہ جنگ مصر، اسرائیل، فرانس اور برطانیہ کے درمیان لڑی گئی۔ اس کا فوری سبب تو صدر ناصر کا وہ اعلان تھا جس میں انھوں نے بحیرۂ روم اور بحیرۂ احمر کو ملانے والی مشہور آبی گزر گاہ نہرِ سوئز کو قومی ملکیت میں لینے کا فیصلہ کیا تھا۔ صدر ناصر کا یہ فیصلہ برطانیہ سے براہِ راست تصادم کے مترادف تھا۔ کیونکہ برطانیہ کسی قیمت پر نہرِ سوئز کو کھونا نہیں چاہتا تھا۔ اگرچہ ۱۹۵۴ء میں مصر اور برطانیہ کے درمیان مصر سے برطانوی انخلا کے معاہدے میں کنال زون کی چھاؤنی کو بھی خالی کرنے کا معاہدہ تھا لیکن اس میں یہ بھی وضاحت تھی کہ سوئز کنال کمپنی آئندہ بیس سال تک مصری حکومت کے کنٹرول میں منتقل نہیں ہوگی۔ فرانس ناصر سے اس لیے نالاں تھا کہ الجزائر میں فرانس سے برسرِپیکار تحریک کو ناصر کی پرزور حمایت حاصل تھی۔ جبکہ مذکورہ دونوں ممالک صدر ناصر کی روس سے قربت اور انگریز مخالف بیانات سے بھی پریشان تھے۔ جبکہ اسرائیل کے لیے بھی یہ اپنی سرحدوں میں توسیع کا سنہری موقع تھا جو پہلے ہی مصری صدر کے بیانات اور پالیسیوں سے مشتعل تھا۔ ان حالات میں برطانیہ اور فرانس نے اسرائیلی وزیرِ اعظم سے خفیہ معاہدہ کیا۔ فرانس کی طرف سے اسرائیل کو خصوصی عسکری پیکیج فراہم کیا گیا جو تیس جنگی طیاروں، تین سو ٹینکوں، جدید میزائیلوں اور بھاری توپ خانے پر مشتمل تھا۔ اسرائیل کے یک چشم چیف آف جنرل سٹاف موشے دایان نے اس جنگ کی منصوبہ بندی کی۔ ۲۹، اکتوبر ۱۹۵۶ء کو اسرائیل نے مصر پر حملہ کر دیا۔ یہ حملہ انتہائی زوردار، تیز ترین اور اچانک تھا۔ اسرائیلی فوجیں تیزی سے پیش قدمی کرتے ہوئے مصری علاقے سینا میں داخل ہو گئیں۔ اسی دوران فرانسیسی اور برطانوی بمباری سے مصری افواج کے ٹھکانے تباہ

ہونے لگے۔ برطانیہ کی پیراشوٹ رجمنٹ نے الجمیل کے ہوائی اڈے پر قبضہ کر لیا جبکہ فرانسیسی فوج کے ایک خصوصی دستے نے سوئز کے ساحل پر الفواد کے فوجی اڈے پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد اتحادی افواج پورٹ سعید کی طرف بڑھیں۔ اور شدید مزاحمت کے باوجود اس کے قریب پہنچ گئیں۔ چھے نومبر تک یہ آپریشن انتہائی سرعت و کامیابی سے جاری تھا۔ لیکن امریکی مداخلت اور سویت یونین کی دھمکی سے یک دم حالات تبدیل ہوگئے۔ چنانچہ روس نے جب یقینی مصری شکست کو دیکھا تو اس نے فوری جنگ بندی اور اتحادی انخلا کا مطالبہ کیا۔ اور بہ صورتِ دیگر مصری حمایت میں اس جنگ میں براہِ راست ملوث ہونے کی دھمکی بھی دی۔ جبکہ دوسری طرف امریکہ نے بھی شدید مداخلت کی۔ دراصل امریکہ عالمی سیاست میں فیصلہ کن مقام حاصل کر چکا تھا اور وہ اس خطے میں ان دونوں طاقتوں کا بوریا بستر گول کر کے اپنی اجارہ داری کے لیے پر تول رہا تھا۔ بلکہ مصر میں چار سال قبل ہونے والی فوجی بغاوت کو بھی اس کی درپردہ حمایت حاصل تھی۔

اتحادی افواج کا انخلا اور برطانوی تذلیل

سلامتی کونسل میں جنگ بندی کی قرارداد منظور ہونے کے بعد اتحادی افواج کو مصری علاقے واپس کرنے پڑے۔ اس سے برطانیہ کی عالمی ساکھ شدید مجروح ہوئی۔ کیونکہ اوّل تو اس نے جارحیت کا ارتکاب کیا اور بعد ازاں سفارتی سطح پر ناکام ہو کر اس خطے سے ہاتھ دھو بیٹھا اور یہی امریکہ کا مقصد تھا جس میں وہ مکمل کامیاب رہا۔ اس جنگ میں ایک ہزار کے قریب مصری فوجی شہید ہوئے، دو ہزار سے زیادہ قیدی بنے، ساتھ ساتھ مصری فضائیہ اور بحریہ کو شدید نقصان پہنچا۔ جبکہ اتحادی افواج کے ڈھائی سو کے قریب فوجی کام آئے۔ ان میں زیادہ تعداد اسرائیلی فوجیوں کی تھی۔

۱۹۵۶ء سے ۱۹۶۷ء آزادیِ فلسطین کے لیے سیاسی و عسکری جدوجہد

۱۹۵۸ء میں مصر میں موجود نوجوان فلسطینیوں نے رابطہ مہم شروع کی۔ جس کے لیے انھوں نے مختلف عرب ممالک میں موجود فلسطینیوں سے رابطے قائم کیے۔ ۱۹۶۲ء میں غزہ میں متحدہ محاذ قائم کر کے

ایک عارضی دستور کا اعلان کیا گیا۔ اس دستور میں غزہ کو فلسطینی حصہ قرار دے کر غصب شدہ زمینیں بھی واپس لینے کا عہد کیا گیا۔ اس سے پہلے ۱۹۵۲ء میں عرب لیگ نے غزہ میں فلسطینی پارلیمنٹ کا خیال پیش کیا تھا لیکن یہ خیال سے آگے نہ بڑھ سکا۔ ۱۹۶۳ء میں عرب لیگ نے ایک قرار داد منظور کی جس کے تحت فلسطینی شہریوں کو اپنے اپنے علاقوں سے اپنا نمائندہ منتخب کرنے کا کہا گیا۔ تاکہ یہ سب نمائندے قومی پارلیمنٹ میں جمع ہو کر فلسطینی حکومت قائم کریں۔ اسی قرارداد میں آزادیِ فلسطین کے لیے ایک آزاد فلسطینی فورس کی تجویز بھی پیش کی گئی۔ اس قرارداد میں یہ بھی وضاحت کی گئی کہ جملہ امور کی انجام دہی عرب لیگ پالیسی کے تحت ہوگی اور اس مقصد کے لیے أحمد شقيري کو عرب لیگ میں فلسطین کا نمائندہ مقرر کیا گیا۔

پی ایل او کا قیام

۱۹۶۴ء میں القدس کی قومی کانفرنس میں تحریکِ آزادیِ فلسطین منظمة التحرير الفلسطينية کے قیام کا اعلان کیا گیا۔ یہ تحریک پی ایل او(Palestine Liberation Organization)کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس کانفرنس میں صحت مند نوجوانوں کے لیے جنگی تربیت لازم ہونے کی تجویز بھی پیش کی گئی۔ تین ماہ بعد عرب لیگ کے سربراہ اجلاس میں ان تجاویز کی منظوری دے دی گئی۔ مفتی امین حسینی نے اس تنظیم کے قیام کی مخالفت کرتے ہوئے اس کو مسئلۂ فلسطین کے خلاف سازش قرار دیا۔

تحریکِ الفتح کا قیام

فلسطین کی اس بڑی مزاحمتی تحریک کے قیام میں بنیادی کردار ان فلسطینی نوجوانوں کا ہے جو اسکندریہ اور قاہرہ کی مصری جامعات میں زیرِ تعلیم رہے۔ انھوں نے سب سے پہلے طلبہ یونین کے ذریعے مصر میں فلسطینیوں کو منظم کیا۔ پھر خلیجی ریاستوں اور دیگر ممالک کے ساتھ ساتھ جرمنی آسٹریا اور سپین میں مقیم فلسطینیوں سے بھی رابطے قائم کیے۔ ان میں تین انتہائی اہم کردار ہیں اور یہی اس تحریک کے بانی ہیں۔ ان میں ایک صلاح خلف ہیں، ان کا تعلق فلسطینی علاقے یافا سے تھا اور یہ جامعۃ الازہر میں زیرِ تعلیم رہے۔

دوسرے خلیل وزیر ہیں، یہ ابوجہاد[1] کے نام سے مشہور ہوئے۔ ان کا تعلق فلسطین میں رملہ سے تھا۔ یہ جامعہ اسکندریہ کے طالب علم رہے۔ تیسرے یاسر عرفات ہیں، یہ القدس کے مشہور حسینی خاندان کے فرزند تھے۔ جامعہ قاہرہ میں انجینیرنگ کے طالبِ علم رہے۔ ان کے علاوہ خالد قدومی، عادل عبدالکریم، جبارہ، عبداللہ دنان وغیرہ بھی ابتدائی کردار ہیں۔ خلیل وزیر نے عرفات اور صلاح خلف کے ساتھ مل کر ۱۹۵۶ء کی جنگ کے بعد خلیجی ممالک کے دورے کیے اور کویت کو اپنا مسکن بناکر ہر جگہ فلسطینیوں سے رابطے قائم کیے۔ متموّل حضرات سے فنڈنگ کے حصول کا نظم تشکیل دیا۔ ایک طرح سے ۱۹۵۹ء میں انھوں نے اس تحریک کا ابتدائی سرسری آغاز کر دیا۔ انھوں نے کویت میں رہتے ہوئے لبنان سے فلسطینی کاز کو اجاگر کرنے کے لیے فلسطیننُا کے نام سے پہلا مجلہ نکالا۔ ۱۹۶۴ء کے آخر میں ان تین حضرات نے کویت کے ایک اجلاس میں تحریک الفتح کی باضابطہ بنیاد رکھی۔ اور ساتھ ہی عاصفہ کے نام سے ایک چھاپامار دستہ قائم کرکے فلسطین میں چھوٹی چھوٹی گوریلا کارروائیوں کا آغاز کر دیا۔

الفتح کا نظریہ

سیکیولر رجحانات کے ساتھ آزادیِ فلسطین کی جدوجہد اس کا منشور تھا۔ اس کا ہدف ایک آزاد سیکیولر فلسطینی قومی ریاست کا قیام تھا جس کا دارالحکومت القدس ہو۔ اس تحریک نے اپنے منشور میں فلسطین کو عرب سرزمین کا جزِلازم قرار دیا، اس کا موقف تھا کہ شام اور دیگر عرب ممالک میں آباد فلسطینیوں میں آزادیِ فلسطین کے لیے مسلّح دستے تیار کیے جائیں۔ چنانچہ اپنے ان نظریات کی وجہ سے یہ تحریک بہت سے عرب

---

[1] ۱۶، اپریل ۱۹۸۸ء میں ابوجہاد کو تیونس کے دارالحکومت میں پی ایل او کے ہیڈ کوارٹر میں اسرائیلی کمانڈوز نے گولیاں مار کر شہید کیا تھا۔ بی بی سی نے ابوجہاد کے قاتل کا انٹرویو شائع کیا ہے۔ مشہور شاعر احمد فرازؔ نے ابوجہاد کی مظلومانہ شہادت کا ذکر ان الفاظ میں کیا:

ابو جہاد مرا دل لہو لہو ہے مگر
معاف کر کہ ترے دشمنوں کے ساتھ ہیں ہم
ترا جنوں، ترا ایثار محترم لیکن
جو سچ کہوں تو ترے قاتلوں کے ہاتھ ہیں ہم
ہمی تو ہیں وہ ستم گر، کہ مصلحت جن کی
دراز دستیِ قاتل کا دل بڑھاتی ہے

ممالک کو قبول تھی اس لیے صرف دو سال کے اندر اس کے رضا کار اردن، شام، لبنان اور مصر میں موجود تھے۔ اس نے الجزائر میں بھی مراکز قائم کیے۔

الفتح کی ابتدائی مسلح کارروائیاں

۱۹۶۵ء ایلابون ٹنل، دریاے اردن سے پانی کے حصول کے لیے اسرائیل کے اس منصوبے پر الفتح کے رضا کاروں نے حملہ کیا جس میں چند اسرائیلی فوجی زخمی ہوئے۔ یہ الفتح کی پہلی کارروائی تھی۔ اسی سال دوسری کارروائی ایک اسرائیلی چوکی پر کی گئی جس میں الفتح کا رضا کار احمد موسیٰ شہید ہوا اور محمود حجازی اسرائیل کے ہاتھوں گرفتار ہوا۔ اپنے اس رضا کار کی رہائی اور فلسطین میں مسلّح مزاحمت کے لیے عرفات نے اقوامِ متحدہ کے نام میمورنڈم جاری کیا۔ نومبر ۱۹۶۶ء میں مغربی کنارے کے علاقے سامو میں الفتح کے رضا کاروں نے ایک اسرائیلی فوجی گاڑی کو نشانہ بنایا جس میں تین فوجی ہلاک ہوئے۔ اردن نے اس پر اسرائیل سے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے تعزیت بھی کی لیکن اس کے باوجود اسرائیل نے مغربی کنارے میں آپریشن شریڈر کے نام سے ایک بڑی فوجی کارروائی کی جس میں اردن کے بیس فوجی شہید اور پندرہ فوجی گاڑیاں تباہ ہوئیں۔ طبی ادارے، تعلیمی ادارے، تھانے اور مساجد بھی شہید ہوئیں۔ الفتح کی کارروائیاں اب عرب حکومتوں کے لیے پریشانی کا باعث بننے لگیں جس کی وجہ سے بعض ممالک میں ان کی پکڑ دھکڑ اور ان پر سختی ہونے لگی۔ اس دوران اس خطے میں ایک بار پھر ایک بڑی جنگ کے سیاہ بادل منڈلانے لگے۔

عرب اسرائیل جنگ ۱۹۶۷ء

یہ وہ جنگ ہے جس نے اسرائیل کے ناقابلِ شکست ہونے کے تصور کو جنم دیا۔ کیونکہ اسرائیل نے صرف چھے دنوں میں اپنے طوفانی حملوں سے عرب ممالک کی فوجوں کو تباہ کر دیا تھا۔ ۱۹۵۶ء کے بعد صدر ناصر کی مقبولیت میں ڈرامائی طور پر اضافہ ہوا۔ وہ اپنے آپ کو عالمِ عرب کے بڑے فاتح کے طور پر پیش کر رہے تھے۔ عرب قومیت کی تحریک کے ذریعے وہ اپنی مقبولیت کی معراج پر تھے۔ یمن میں حکومت کی

تبدیلی اور وہاں اپنی فوج تعینات کرکے سعودیہ کو نیچا دکھا چکے تھے۔ اپنے اشتراکی نظریات کی وجہ سے روس سے انھیں انتہائی قربت تھی۔ روسی مدد سے تشکیل پانے والی اپنی مضبوط فضائیہ کی وجہ سے وہ بہت پر اعتماد بھی تھے۔ ناصر کے خیال میں یہی وہ بہترین موقع تھا جس میں اسرائیل کو شکست دے کر عربوں کے اجتماعی و قومی تفاخر کو بحال کیا جاسکتا تھا۔ صدر ناصر کے فوجی سربراہ فیلڈ مارشل عبدالحکیم عامر تو دو دن میں اسرائیل کو تباہ کرنے کے دعوے دار تھے۔ دوسری جانب شام، سوویت یونین کی طفیلی ریاست بن چکی تھی۔ بار بار حکومتوں کی تبدیلی سے داخلی طور پر غیر مستحکم تھی۔ شام فلسطینی مسلّح گروہوں کی حمایت کر رہا تھا۔ فلسطینی گوریلاؤں کے حملوں کی وجہ سے اسرائیل اور شام میں شدید کشیدگی تھی۔ تیسری طرف اردن میں بادشاہت تھی۔ نوجوان بادشاہ شاہ حسین، صدر ناصر سے خائف تھا۔ مجبور ہو کر ناصر سے معاہدہ تو کر لیا لیکن وہ ”تیل دیکھ اور تیل کی دھار دیکھ“ کی پالیسی اپنانا چاہتا تھا تاکہ فریقین کی پوزیشن دیکھ کر واضح فیصلہ کرے۔ لیکن شاہ حسین مصری ریڈیو ”صوت العرب“ کی سنسنی خیز ٹرانسمیشن سے غلط فہمی کا شکار ہوا جو دعویٰ کر رہا تھا کہ مصری افواج نے اسرائیل کے اندر داخل ہو کر کئی علاقوں پر قبضہ کر لیا ہے۔ جبکہ اس وقت صورتِ حال یہ تھی کہ مصر پر شدید اسرائیلی بمباری کی وجہ سے مصری جرنیلوں کو چھپنے کی جگہ نہیں مل رہی تھی۔ اس جنگ کا آغاز اپریل ۱۹۶۷ء میں شام اور اسرائیل کے درمیان سرحدی جھڑپوں سے ہوا، جو بڑھتی چلی گئیں۔ ۱۵، مئی ۱۹۶۷ء کو اسرائیل نے ایک بڑی کارروائی کرتے ہوئے آٹھ شامی جہاز تباہ کر دیے۔ اس کے بعد مصر پر جنگ میں شرکت کے لیے دباؤ بڑھ گیا۔ مصر نے اپنی فوج کو صحرائے سینا میں پیش قدمی کا حکم جاری کر دیا۔ مصری افواج سینا میں ۱۹۵۶ء سے تعینات اقوامِ متحدہ کی افواج کو پیچھے دھکیل کر پورے علاقے میں داخل ہو گئیں۔ مصر نے خلیجِ عقبہ کو جہاز رانی کے لیے بند کر دیا جس سے اسرائیل کی بندرگاہ ایلات بھی بند ہو گئی۔ اسرائیل جنگ کے لیے پوری طرح تیار تھا۔ ۱۹۵۶ء کی جنگ میں اس نے بھاری توپ خانے، ٹینک اور طیارے فرانس سے حاصل کیے تھے۔ اس کے بعد برطانیہ نے بھی یہاں اپنے اسلحے کا ایک ذخیرہ اسرائیل کے حوالے کیا۔ ۱۹۶۵ء میں امریکہ نے بھی جدید آلات فراہم کیے۔ اس کے علاوہ اسرائیل ۱۹۵۶ء کی جنگ کے بعد سے مسلسل جاسوسی مشن کے ذریعے مصر، شام اور اردن کے ہوائی اڈوں اور فوجی ٹھکانوں سے پوری طرح واقف تھا۔ اسرائیل نے ۵۶ء کی

جنگ کے ہیرو کا نے جرنیل موشے دایان کو اچانک وزیرِ دفاع تعینات کر دیا جس نے فوجی سربراہوں سے مل کر جنگ کی منصوبہ بندی کی۔

اسرائیل کے تیز ترین فضائی حملے

۵ جون ۱۹۶۷ء کو اسرائیل نے اپنے طے شدہ منصوبے کے تحت اچانک اور انتہائی تیزی کے ساتھ بیک وقت تمام عرب ہوائی اڈوں پر فضائی بمباری شروع کر دی۔ اسرائیلی ایئر فورس کے طیاروں نے نہایت سرعت کے ساتھ ریڈار سے بچنے کے لیے نیچی پروازیں کیں اور مصر سے آغاز کرتے ہوئے تمام عرب فضائیہ کے اڈوں پر بیک وقت ہلہ بول دیا۔ یہ صورتِ حال اتنی غیر متوقع اور اچانک تھی کہ مصری جرنیل اولاً اس کو کوئی داخلی بغاوت سمجھ بیٹھے۔ پہلے دن ہی مصری فضائیہ رن وے پر کھڑی کھڑی ہی تباہ ہو گئی۔ اسی دن اردن اور شام کے اڈوں پر بھی تابڑ توڑ حملے ہوئے۔ اور ان ممالک کی فضائیہ کا بھی بھاری نقصان ہوا۔ دوسرے دن اسرائیلی بری فوج نے سینا میں پیش قدمی شروع کر دی۔ یہاں مصری افواج بہادری سے لڑیں لیکن قاہرہ کی فوجی قیادت میں سراسیمگی پھیل چکی تھی۔ پانچ دن تک مصر، اردن اور شام کی فضاؤں میں صرف اسرائیلی طیاروں کی گھن گرج تھی۔ اور اس نے ان پانچ دنوں میں ان تین ممالک کی فوجی قوت کو نیست و نابود کر دیا تھا۔

جنگ بندی اور نقصانات

۱۲، جون کو جنگ بندی ہوئی تو صورتِ حال یہ تھی کہ اسرائیل نے غزہ اور مصر کے پورے جزیرہ نمائے سینا پر قبضہ کر لیا تھا۔ جبکہ شام کی گولان پہاڑیاں بھی اسرائیلی قبضے میں تھیں جبکہ اردن سے مغربی کنارا بھی اسرائیل نے چھین لیا۔ اس کے ساتھ مشرقی بیت المقدس پر بھی اسرائیلی قبضہ ہو گیا۔ اس جنگ میں عرب افواج کے بیس ہزار سے زیادہ فوجی مارے گئے اور ہزاروں قیدی بنے۔ عرب افواج کے چار سو سے زیادہ طیارے تباہ ہوئے، ان کی فضائیہ اور فضائی اڈے ناکارہ کر دیے گئے۔ مبصرین اس جنگ میں سوویت یونین کے کردار پر آج تک سوالات اٹھا رہے ہیں جس پر اعتماد کرتے ہوئے مصر نے جنگ شروع کی لیکن اس کی

طرف سے کوئی مدد نہیں ملی۔ اس جنگ کے بعد صدر ناصر نے استعفیٰ دے دیا لیکن قاہرہ کے ایک مظاہرے کے بعد استعفیٰ واپس لے لیا۔ صدر ناصر نے ۱۹۷۰ء میں وفات پائی۔ اس جنگ کے بعد ۱۹۷۰ء کی جنگ بندی تک مصری افواج روسی مدد سے سینا میں اسرائیل کے خلاف برسرِپیکار رہیں لیکن ان کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ اس تین سالہ محدود جنگ کو استنزاف کہتے ہیں۔

فلسطینی مزاحمت ۱۹۶۷ء سے ۱۹۷۰ء تک

جب ۱۹۶۷ء میں عرب اسرائیل جنگ کا آغاز ہونے والا تھا تو اس دوران یاسر عرفات نے دمشق میں ایک اجلاس کے اندر فلسطین کے اندر رہتے ہوئے آزادی کی جنگ لڑنے کا منصوبہ پیش کیا۔ اور پھر بغیر وقت ضائع کیے تھوڑے ہی عرصے میں مغربی کنارے میں نابلس کو اپنا ہیڈ کوارٹر بنا دیا اور رام اللہ میں عسکری کیمپ قائم کیا۔

۱۹۶۸ء: نابلس میں اسرائیلی فوجی آپریشن اور فلسطینیوں کا قتلِ عام

یہ علاقہ ۶۷ء کی جنگ میں اردن کے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ ۱۹۶۸ء کے آغاز میں اس علاقے میں اسرائیل نے ایک بڑا فوجی آپریشن کیا جس میں پورے علاقے میں ایمرجنسی نافذ کر دی گئی۔ فلسطینیوں کے مکانات تباہ کر دیے گئے۔ اس آپریشن میں ڈھائی سو کے قریب فلسطینی شہید ہوئے۔ ایک ہزار سے زیادہ کو گرفتار کر لیا گیا۔ یاسر عرفات اردن چلے گئے۔

مارچ ۱۹۶۸ء: کرامہ کی جنگ، جرأت و استقامت کی عظیم مثال

یہ جنگ فلسطینی مزاحمت کی تاریخ میں جرات و بہادری کے عظیم کارناموں میں سے ایک کارنامہ ہے۔ یہاں صرف تین سو مجاہدین نے پندرہ ہزار فوج کا مقابلہ کیا جو ٹینک، توپ خانوں اور ہیلی کاپٹروں سے لیس تھی۔ مغربی کنارے میں اسرائیلی فوجی آپریشن کے بعد مجاہدین نے مشرقی اردن کی اس سرحدی پٹی کو اپنا مسکن بنایا تھا۔ جس سے بہت جلد اسرائیلی باخبر ہو گئے اور یہاں بھی فوجی آپریشن کے خطرات منڈلانے لگے۔ ان حالات میں شاہِ اردن نے بھی مجاہدین کو کسی دوسری محفوظ جگہ پر منتقل ہونے کی تجویز پیش کی۔ لیکن جذبۂ جہاد سے سرشار یہ نوجوان علاقہ

چھوڑنے سے انکار کرتے ہوئے سینہ سپر ہوگئے۔ اس میدان میں گھمسان کی جنگ ہوئی۔ فلسطینی فدائی اپنے جسموں پر بم باندھ کر اسرائیلی ٹینکوں پر جھپٹ پڑے۔ اسرائیل کے چالیس کے قریب فوجی مارے گئے، کئی گاڑیاں تباہ ہوئیں۔ عزیمت کے اس عظیم کارنامے سے الفتح کو خوب شہرت ملی۔ ۶۷ء میں عرب اتحاد کو ہونے والی شکست کی وجہ سے حوصلے پست تھے لیکن فلسطینیوں کے ان کارناموں کی وجہ سے عزم و ولولے کے نئے دور کا آغاز ہوا۔

مزاحمت کا نیا رخ: الجبهة الشعبية لتحرير فلسطين کا قیام

جیسے مصر میں زیرِ تعلیم طلبہ نے ایک مسلّح تحریک کو جنم دیا تھا، ویسے ہی دوسری جانب لبنان میں زیرِ تعلیم فلسطینی طلبہ نے ایک دوسری مسلّح تحریک Popular Front for the Liberation of Palestine (PFLP) شروع کی۔ اس تنظیم کا جنم ۶۷ء کی جنگ کی راکھ سے ہوا۔ اس کے بانی جارج حبش اور ودیع حدّاد تھے۔ یہ دونوں فلسطینی عیسائی تھے اور بیروت یونیورسٹی میں عرب نیشنلسٹ موومنٹ سے تعلق رکھتے تھے۔ ۱۹۶۷ء کے بعد انھوں نے اس مسلّح تنظیم کی بنیاد رکھی جو اگلے چند سالوں میں انتہائی خطرناک ثابت ہوئی۔ "پاپولر فرنٹ فار دی لبریشن آف فلسطین" بائیں بازو کی ایک سوشلسٹ مسلّح انقلابی تحریک تھی۔ یہ کمیونسٹ فلسطینی ریاست کے قیام پر عمل پیرا تھی۔ فلسطین کا ایک ریاستی حل اس کا منشور تھا۔ یہ اسرائیل کو عالمی سامراج کا ایک حصہ سمجھتی تھی۔ مارکسزم اور لینن ازم بھی اس کے منشور کا حصہ تھا۔ ان کے نزدیک فلسطین کی آزادی عالمی کمیونسٹ انقلاب کا لازمی حصہ ہے۔ یہ اسرائیل کے ساتھ کسی بھی قسم کی مفاہمت و مذاکرات کو رد کرتے تھے۔ یہ تنظیم کیوبا اور وینزویلا کے انقلابیوں سے شدید متاثر تھی، اس تنظیم کے جاپان کی ریڈ آرمی اور مشرقی جرمنی کی تنظیموں سے بھی تعلقات تھے اور اسے سوویت یونین کی حمایت حاصل تھی۔

اس تنظیم نے دنیا کی توجہ فلسطین کاز کی طرف مبذول کروانے کے لیے فدائی حملوں کے ساتھ ساتھ جہاز اغوا کرنے شروع کیے، مشرقی جرمنی کی سوشلسٹ تنظیم کی مدد سے انھوں نے کئی جہاز اغوا کیے۔ ۱۹۶۸ء سے ۱۹۷۴ء تک اس کے ہائی جیکنگ کے واقعات دنیا کی شہ سرخیوں میں رہے۔ ہائی جیکنگ کے ذریعے قیدی چھڑائے اور تاوان بھی وصول کیا۔ لیلیٰ خالد اسی تنظیم کی مشہور ہائی جیکر تھی جس نے ۱۹۶۹ء میں ایک جہاز اغوا کر

کے شام میں خالی کر کے تباہ کیا۔ ستمبر ۱۹۷۰ء میں اس تنظیم نے چار جہاز اغوا کیے۔ جن میں سے تین کو اردن کی ہوائی پٹی پر خالی کر کے تباہ کر دیا۔ ایک چوتھے جہاز میں جوابی کارروائی پر لیلیٰ خالد برطانیہ میں گرفتار ہو گئیں۔ لیکن دوسرے طیارے کے برطانوی مسافروں کے بدلے برطانیہ نے رہا کر دیا۔ ۱۹۶۹ء میں ایک جہاز کو اغوا کر کے الجزائر لے جایا گیا جس کے جواب میں اسرائیلی افواج نے لبنان پر بمباری کی اور بیروت ایئرپورٹ پر تیرہ جہاز تباہ ہوئے۔ جس کی وجہ سے وہاں قیام پذیر رضا کاروں اور لبنانی فوج کے درمیان شدید بحران پیدا ہوا۔ بعد میں ایک معاہدے کے تحت سب رضا کاروں کو پی ایل او کے ماتحت کر کے ان کے لیے ایک علاقہ مخصوص کیا گیا۔ جس کے بعد اس تنظیم کا بڑا حصہ اردن منتقل ہو گیا۔ ان لوگوں نے ۱۹۷۲ء میں جاپان ریڈ آرمی کے ساتھ مل کر تل ابیب ایئرپورٹ پر کئی قتل کیے۔ ۱۹۷۲ء کے میونخ اولمپکس پر حملہ کر کے گیارہ اسرائیلی قتل کیے۔ ۱۹۶۸ء تا ۱۹۶۹ء میں لبنانی فوج کے ساتھ اس کی شدید جھڑپیں ہوئیں۔ ۱۹۷۶ء میں ایئر فرانس کی پرواز ہائی جیک کر کے یوگنڈا میں اتاری جہاں اسرائیلی کمانڈوز کی کارروائی میں اس کے ہائی جیکرز قتل کر دیے گے۔

الاخوان المسلمون

امام شیخ حسن البنا کی اس عالمی اسلامی تحریک نے فلسطین میں ۱۹۳۵ء کے بعد امام قسام کی تحریک میں شرکت کی۔ ۱۹۳۹ء کے بعد بھی یہاں کی جہادی سرگرمیوں میں اس کی بھرپور معاونت رہی۔ ۱۹۴۸ء کی عرب اسرائیل جنگ میں چونکہ یہ مصری پالیسی کے تابع تھی اس لیے مصری افواج کی متابعت میں رہی۔ ۱۹۵۰ء کے بعد اہلِ غزہ کو بے دخل کر کے دوسرے مقام پہ بسانے کے اسرائیلی منصوبے کے خلاف اس نے خوب بیداری پیدا کی۔ لیکن مصر کے فوجی انقلاب کے بعد اس تحریک کو مصر میں دبانے کے لیے ہر طرح کے ہتھکنڈے استعمال کیے گئے۔ ۱۹۶۷ء کی جنگ کے بعد اس نے فلسطینی تحریکوں سے وابستہ بالخصوص الفتح کے مجاہدین کی نظریاتی تربیت کی بہت کوشش کی۔ اس تحریک سے وابستہ مصری کارکنان تو فوجی جنتا کے جبر و تشدّد کا شکار ہو کر پابندِ سلاسل تھے یا زیرِ زمین، لیکن شام کے اخوانی کارکن الفتح کے ساتھ مل کر جدوجہد میں شریک تھے، اردن میں اس تنظیم نے الفتح کے لیے ایک ٹریننگ کیمپ بھی قائم کیا۔ مصری عالم شیخ صلاح حسن نے الفتح

کو اسلامی جہادی خطوط پر استوار کرنے کے لیے کافی محنت کی لیکن سیکیولر قوم پرست اور سوشلسٹ تحریکوں کے اختلاف کی وجہ سے اس تنظیم کو پذیرائی نہ مل سکی۔ کیونکہ اس تحریک کا تصورِ جہاد خالص اسلامی ریاست کے قیام سے وابستہ تھا۔ دراصل اب بہت دیر ہو چکی تھی کیونکہ اسرائیلی ریاست کے قیام کے بعد جو مزاحمتی خلا تھا وہ اب پورا ہو چکا تھا۔

۱۹۷۰ء بلیک ستمبر

بلیک ستمبر سے مراد اردن کا فوجی آپریشن ہے جو ستمبر ۱۹۷۰ء میں اردن میں موجود فلسطینی مزاحمت کاروں کے خلاف کیا گیا۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ ۱۹۶۷ء میں مغربی کنارہ اسرائیلی قبضے میں جانے کے بعد فلسطینی مسلّح تحریکوں کے ارکان نے اردن کی سرحدی پٹی کو اپنا مرکز بنایا جہاں سے وہ اسرائیل کے اندر گوریلا کارروائیاں کرتے تھے۔ اس ستمبر میں تین جہاز بھی اغوا کر کے ہوائی پٹی ڈاسن فیلڈ میں تباہ کیے گئے۔ مزاحمتی تحریک کے کئی گروہ یہاں سرگرم تھے جن میں سے بعض اردن میں بھی انقلاب لانے کا منصوبہ رکھتے تھے۔ ان میں حرکة الشعبية یعنی PFLP زیادہ سرگرم تھا۔ اور یہاں کے حالات اس نہج تک لانے میں اس کی منفی سرگرمیوں کا عمل دخل زیادہ تھا۔ یہ گروہ اردن کی جانب سے طے کردہ حدود سے تجاوز کرتے ہوئے اردن کے اندر بھی کئی علاقوں پر قابض ہو گیا اور دار الحکومت عمان کے قریب تک آ گیا۔ ان کو شام کی زبردست حمایت حاصل تھی جس نے ان گروہوں کو اردن کی طرف سے کسی بڑی کارروائی کی صورت میں مکمل تعاون کی یقینی دہانی کروائی تھی۔ مزاحمت کاروں نے اردن کی نامور شخصیات پر بھی حملے کیے جن میں اردنی وزیرِ اعظم وصفی پر ہونے والا قاتلانہ حملہ قابل ذکر ہے۔ اس کے علاوہ اردنی افواج پر بھی حملہ ہوئے۔ ۱۵، ستمبر ۱۹۷۰ء کو اردن حکومت نے اپنے ملک میں ایمرجنسی کا اعلان کیا اور ۱۶، ستمبر کو فلسطینی گروہوں کے خلاف ایک بڑے فوجی آپریشن کا آغاز کر دیا۔ شامی فوج ان کی مدد کے لیے آگے بڑھی لیکن اردنی فضائیہ کی شدید بمباری کی وجہ سے بھاری نقصان اٹھا کر پسپا ہو گئی۔ فلسطینی مزاحمت کاروں نے عراقی فوج سے بھی مدد طلب کی جو نہ مل سکی آخر انھوں نے تنہا ہی یہ جنگ لڑی۔ لیکن اردن کی فضائی بمباری اور بھاری توپ خانے نے ان کو کچل کر رکھ دیا۔ ۱۶ سے ۲۷ ستمبر تک

جاری رہنے والے اس آپریشن نے فلسطینیوں کا صفایا کر دیا۔ اور اس جنگ میں چار ہزار کے قریب فلسطینی قتل ہوئے اور شام کے پانچ سو فوجی بھی اردن کی فضائی بمباری میں مارے گئے۔ جبکہ اردن کو بھی اپنے چھ سو سے زیادہ فوجیوں کا نقصان اٹھانا پڑا۔

بلیک ستمبر کے بعد بھی کچھ عرصے تک شمالی اردن میں فلسطینیوں کے خلاف اردن کا آپریشن جاری رہا۔ آخر اس مزاحمت پر قابو پا لیا گیا۔ اس کے بعد فلسطینی تحریک مکمل طور پر لبنان منتقل ہوگئی۔ اور اگلے گیارہ سال تک اس تحریک کا مرکز لبنان ہی رہا۔ ۱۹۶۹ء تک تمام مسلح تنظیمیں تنظیمِ آزادیِ فلسطین یعنی پی ایل او کی چھتری تلے آ چکی تھیں اور اب یہی تمام تنظیموں کا متحدہ سیاسی پلیٹ فارم تھا اور یاسر عرفات کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ ۱۹۷۳ء میں لبنان میں اسرائیلی خفیہ ایجنسی موساد نے اپنی سپیشل افواج کی مدد سے بیروت میں خصوصی اور خفیہ آپریشن میں تنظیمِ آزادیِ فلسطین کے مشہور رہنما محمد یوسف، کمال عَدوان اور کمال ناصر، ان تینوں رہنماؤں کو بلیک ستمبر کے نام سے قائم ایک بلڈنگ میں شہید کر دیا۔ اس آپریشن کی قیادت ایہود بارک نے کی جو بعد میں اسرائیلی وزیرِ اعظم بھی منتخب ہوا۔

۱۹۷۳ء مقبوضہ فلسطینی علاقوں میں فلسطینی حکومت قائم کرنے کا نظریہ

یہ نظریہ یاسر عرفات نے پیش کیا۔ مغربی کنارہ چھن جانے اور اسرائیلی قبضے میں جانے کے باوجود اردن اس کا دعوے دار تھا۔ عرفات چاہتے تھے کہ اردن پی ایل او کے حق میں اس دعوے سے دست بردار ہو جائے اور ہم اس کے ساتھ غزہ کو بھی ملا کر ان دو علاقوں میں فلسطینی حکومت قائم کر لیں۔ یہ نظریہ فلسطین کے دو ریاستی حل کی جانب پہلا قدم تھا۔ اور ابھی تک تمام تحریکوں کے مشترکہ اور واضح نظریہ یعنی ایک ریاستی حل سے ہم آہنگ نہیں تھا۔ چنانچہ سوشلسٹ انقلابی تنظیموں نے اس کی شدید مخالفت کی اور اس کو اسرائیل کو تسلیم کرنے کے مترادف قرار دیا۔ لیکن عرفات نے اسی سال رباط کی عرب لیگ کانفرنس میں بھی اس نظریے کی بھرپور ترجمانی کی۔ اس اجلاس میں عرب لیگ نے بھی پی ایل او کو فلسطینی عوام کا واحد نمائندہ قرار دے کر ایک آزاد ریاست کے قیام کے حق میں اس کی توثیق کر دی۔

اکتوبر ۱۹۷۳ء یومِ کپور جنگ

شام اور مصر نے مل کر یہودیوں کے مذہبی تہوار کے موقعے پر اسرائیل پر حملہ کر دیا۔ یہ حملہ بغیر کسی اعلانِ جنگ کے اور بنا کسی جنگی حالات کے انتہائی غیر متوقع ہوا، اس لیے اسرائیل بوکھلا گیا۔ در اصل اسرائیل ۱۹۶۷ء کی فتح کے نشے میں مخمور ہو کر خارجی خطرے سے بے فکر ہو چکا تھا۔ جبکہ شکست و ہزیمت کے شدید احساس سے چور شام اور مصر نے اس عرصے میں سوویت یونین کے تعاون سے اپنی افواج کی تشکیلِ نو کی۔ اور مذکورہ دونوں ممالک ایک عرصے سے سوویت یونین کے ساتھ مل کر ایک نئی جنگ کی تیاری کر رہے تھے جس کا مقصد مقبوضہ علاقوں کی واپسی اور کھوئے ہوئے وقار کی بحالی تھا۔ ۱۶، اکتوبر کی صبح مصر نے اسرائیل پر اچانک زوردار حملہ کر دیا۔ جنگ بندی لائن توڑتے ہوئے مصری افواج نے سینا میں تیز ترین پیش قدمی شروع کر دی۔ کئی مقامات سے اسرائیلی فوج بھاگ گئی۔ پہلے ہلے میں ہی سینکڑوں اسرائیلی فوجی مارے گئے۔ ایسا لگتا تھا کہ سینا اسرائیلی فوجی ٹینکوں کا قبرستان بن رہا ہے۔ مصری طیاروں کی بمباری سے ہر طرف خوف و ہراس تھا۔ دوسری طرف شامی افواج اسرائیل کے جوابی حملے کے بعد دباؤ میں آگئیں لیکن مصری افواج کی شدید یلغار کی وجہ سے اسرائیل شامی محاذ پر بھی خاص کامیابی نہ حاصل کر سکا۔ جنگ کا پہلا ہفتہ اسرائیل کے لیے انتہائی خوفناک تھا۔ تل ابیب میں موجود یہودی رہنما شدید ذہنی دباؤ کا شکار ہو گئے۔ ان حالات میں جوہری اسلحے کے استعمال تک بھی مشاورت ہوئی۔ بے کسی کا یہ عالم تھا کہ کچھ اسرائیلی رہنما خودکُشی کرنے کا سوچ رہے تھے۔

امریکی امداد اور حالات کی تبدیلی

ان حالات میں وہی ہوا جو ہمیشہ ہوتا آیا ہے کہ جب بھی یہودی ریاست شکست کے دہانے پہ پہنچی تو امریکہ و یورپ اس کے دفاع کو پہنچ گئے۔ اسرائیلی خاتون وزیرِ اعظم گولڈا میئر نے امریکہ سے مدد کی درخواست کی تو امریکہ نے فوجی مشیروں کے ساتھ عسکری ساز و سامان کی ایک بڑی کھیپ فوری روانہ کر دی۔ جس میں جدید ٹینک اور ٹینک شکن میزائل شامل تھے۔ اس کے علاوہ یورپی ممالک نے بھی ہر طرح کی مدد کی یقین دہانی کروائی۔ چنانچہ ۱۴، اکتوبر کو اسرائیلی افواج نے نئے سرے سے سینا میں پوزیشنیں محکم کرتے ہوئے مصر پر جوابی

حملہ کر دیا۔ اس حملے سے مصر کی دفاعی لائن تباہ ہوگئی۔ ۲۵۰ مصری ٹینک تباہ ہوئے، اب اسرائیلی افواج بہت تیزی سے آگے بڑھنے لگیں۔ نہرِ سوئز کے قریب ایک چھوٹے سے علاقے سے اندر داخل ہو کر قاہرہ کی جانب رخ کرنے لگیں۔ اب مصر شدید دباؤ میں تھا۔ اسرائیلی پیش قدمی کی وجہ سے قاہرہ میں انور سادات کو اپنی حکومت بھی خطرے میں محسوس ہونے لگی۔ ان حالات کے سبب امریکہ اور سوویت یونین میں مفاہمت اور عرب دباؤ کے بعد سلامتی کونسل میں ۲۲، اکتوبر کو جنگ بندی کی قرارداد منظور ہوگئی۔

عرب ممالک کا تیل کی فراہمی بند کرنے کا اعلان

امریکہ کی اسرائیل کو واضح امداد کی وجہ سے عرب ممالک شدید ناراض ہوئے اور پہلی بار انھوں نے تیل کو بطورِ ہتھیار استعمال کیا۔ چنانچہ تیل پیدا کرنے والے ممالک نے امریکہ، بعض یورپی ممالک اور جنوبی افریقہ کو خام تیل کی فراہمی بند کر دی جس سے امریکہ اور یورپی ممالک میں ایندھن کا شدید بحران پیدا ہوا اور تیل کی فی بیرل قیمت میں چار گنا اضافہ ہوا جس سے مہنگائی اور بے روزگاری نے جنم لیا۔ اس جنگ میں ابتدائی شدید ناکامی کی وجہ سے اسرائیل کے ناقابلِ تسخیر ہونے کا تصور بھی ماند پڑ گیا اور سفارتی ناکامی پر اس کی تذلیل ہوئی۔ عرب وقار بھی کافی تک بحال ہوا اور ۶۷ء کی جنگ کے شکست خوردہ جذبوں کو ایک نیا جوش و ولولہ ملا۔ اس جنگ کے بعد اسرائیل کے مجموعی رویے سے بھی وہ ہمیشہ کی رعونت اور جارحیت جاتی رہے اور اب وہ عربوں کے درمیان اعتدال پسند ریاست کے طور پر اپنی پہچان بنا رہا تھا۔ اس جنگ میں اسرائیل کے تین ہزار کے قریب فوجی مارے گئے۔ جبکہ پندرہ ہزار زخمی ہوئے اور ایک ہزار سے زیادہ اسرائیلی فوجی جنگی قیدی بنے۔ سو کے قریب جنگی جہاز اور چار سو سے زیادہ ٹینک تباہ ہوئے۔ دوسری طرف مصر و شام کے بھی آٹھ ہزار سے زیادہ فوجی جنگ میں کام آئے۔

پاکستانی فضائیہ کا کردار

۱۹۷۳ء کی جنگ میں پاکستان فضائیہ کے پائلٹ ستار علوی نے گولان کے پہاڑوں پر ایک اسرائیلی طیارہ

مار گرایا۔ جبکہ اس سے پہلے ۶۷ء کی جنگ میں پاک فضائیہ کے پائلٹ سیف الاعظم نے تین اسرائیلی طیارے تباہ کیے۔ سیف الاعظم پہلے سے اردن میں ہوابازوں کی تربیت پر تعینات تھے۔

اقوامِ متحدہ میں یاسر عرفات کا خطاب

۱۳، نومبر ۱۹۷۴ء کو نیویارک میں منعقدہ اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی کے اس اجلاس سے یاسر عرفات نے فلسطینی نمائندہ تنظیم کے سربراہ کی حیثیت سے خطاب کیا۔ کیونکہ اس سے قبل رباط کانفرنس میں عرب لیگ نے پی ایل او کو فلسطین کی واحد نمائندہ جماعت قرار دیا تھا۔ جناب عرفات نے اپنے خطاب کے اختتام میں زیتون کی شاخ لہرا کر کہا کہ: ”میرے ایک ہاتھ میں آزادی کی بندوق اور دوسرے ہاتھ میں یہ زیتون کی شاخ ہے، لیکن آپ میرے ہاتھ سے یہ زیتون کی شاخ مت گرنے دیجیے“۔ یہ امن مذاکرات کی بہت واضح پیشکش تھی اور عرفات کا اپنے نظریے سے واضح انحراف بھی تھا۔ اسی لیے اس کے بعد امریکہ اور اسرائیل کے لیے قابلِ قبول شخصیت بن گئے تھے۔ اس کے بعد پی ایل او کو اقوامِ متحدہ میں مبصر کا درجہ بھی مل گیا۔

۱۹۷۵ء لبنان خانہ جنگی اور فلسطینیوں پر حملے

لبنان کی خانہ جنگی یوں تو کثیر الجہتی تھی جو ۱۹۷۵ء سے ۱۹۹۰ء کے طائف معاہدے تک جاری رہی۔ اس جنگ میں کرسچن ملیشیا اور ڈینی جامون کی نیشنل لبرل پارٹی نے لبنان میں مسلمانوں کو اقلیت میں بدلنے کے لیے پر تشدد کارروائیاں کیں۔ لبنان کی مسیحی اشرافیہ اور فلسطینیوں کے درمیان شدید تناؤ تھا۔ عیسائیوں کا خیال تھا کہ فلسطینیوں کی وجہ سے لبنانی آبادی کا تناسب شدید متاثر ہوا ہے۔ ۱۹۷۵ء میں شام کی حمایت یافتہ مسلم فلسطینی تنظیمیں صاعقہ اور اقصیٰ محاذ کی کرسچن ملیشیا سے جھڑپیں ہوئیں۔ لیکن ۱۹۷۶ء کے آغاز میں اس جنگ نے تمام فلسطینیوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ بیروت میں تمام فلسطینی بستیوں کا محاصرہ کر دیا گیا۔ مجبوراً الفتح کو بھی شامل ہونا پڑا جس نے فلسطینی بستیوں کی حفاظت کے لیے رضا کار متعیّن کیے۔ کرسچن ملیشیا کے بڑھتے تشدد کی وجہ سے فلسطینی رضا کار کمال جنبلاط کے ساتھ شامل ہو گئے جو مسیحیوں کے ساتھ ساتھ شام

کے بھی انتہائی مخالف اور فلسطینی حمایتی تھے۔ اسی وجہ سے شام کو بھی موقع مل گیا اور شامی فوج بھی مسیحیوں کی حمایت میں جنگ میں شامل ہوگئی اور فلسطینی رضا کاروں کے ٹھکانوں اور بستیوں کا صفایا شروع کر دیا۔ اس جنگ میں کرسچن ملیشیا کے مظالم سے لوگ چھے سال قبل ہونے والے اردن کے مظالم بھول گئے۔ اکتوبر ۱۹۷۶ء میں ریاض میں ہونے والے ایک معاہدے کے بعد یہ تشدد ختم ہوا۔

الخالصہ آپریشن: ۱۹۷۴ء

یہ آپریشن پاپولر فرنٹ فار دی لبریشن آف فلسطین کے فدائیوں نے لبنانی سرحد کے قریب الخالصہ کے گاؤں میں کیا جو کِریات شمونہ میں واقع ہے۔ اس آپریشن کو صرف تین فدائیوں نے سرانجام دیا۔ یہ افراد پہلے ایک اسرائیلی چوکی پر حملہ آور ہوئے جہاں دو اسرائیلی فوجیوں کو قتل کرنے کے بعد قریب ایک رہائشی بلاک پر قابض ہو کر اسرائیلیوں کو یرغمال بنالیا اور یرغمالیوں کی رہائی کے بدلے اسرائیلی جیلوں میں قید اپنے ساتھیوں کی رہائی کا مطالبہ کیا جن میں جاپان ریڈ آرمی کا گوریلا کوزواو کاموٹو بھی شامل تھا۔ لیکن اسرائیل نے ان کے مطالبات کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا جس پر ان فدائیوں نے ان عمارتوں کو دھماکوں سے اڑا دیا۔ ان دھماکوں میں مادی نقصان کے علاوہ بیس اسرائیلی ہلاک اور اتنے ہی شدید زخمی ہوئے۔

معرکۂ طبریہ: ۱۹۷۷ء

یہ ایک تاریخی معرکہ ہے جو جبهة التحرير العربية یعنی عرب لبریشن فرنٹ اور اسرائیلی افواج کے درمیان بحیرۂ طبریہ کے قریب ۴، اگست ۱۹۷۷ء کو ہوا۔ عرب لبریشن فرنٹ کچھ عرصہ قبل پاپولر فرنٹ فار دی لبریشن آف فلسطین یعنی پی ایف ایل پی سے الگ ہوا تھا۔ اس جنگ کی قیادت فلسطین کے مشہور عسکری رہنما خالد محمود ذیاب نے کی، ذیاب نے یہاں اپنے مٹھی بھر جانبازوں کے ساتھ کئی گھنٹے تک ایک بہت بڑے فوجی دستے کا بے جگری سے مقابلہ کرتے ہوئے بہادری کی تاریخ رقم کی۔ اس جنگ میں اسرائیلی فوج انتہائی رسوا ہوئی۔ اس کے تیس فوجی اس جنگ میں مارے گئے۔ اس کے علاوہ تین ٹینک اور ہیلی کاپٹر بھی جانبازوں نے

تباہ کیا۔ خالد محمود ذیاب خود بھی اسی معرکے میں شہید ہوئے۔

۱۹۷۸ء الفتح کی کارروائی اور اسرائیل کا جنوبی لبنان میں فوجی آپریشن

تحریکِ فتح کے مزاحمت کاروں نے لبنان سے آکر اسرائیل کے ساحلی علاقے سے یہودیوں سے بھری ایک بس اغوا کی اور تل ابیب کی طرف لے گئے۔ اس کارروائی میں مشہور مزاحمت کار دلال المغربی بھی شامل تھی۔ اس بس کو چھڑانے کی کارروائی میں اسرائیل کے سینتیس لوگ مارے گئے۔ اس کے دو دن بعد اسرائیل کی بیس ہزار فوج نے لبنان میں فلسطینی بستیوں کو تباہ کر دیا۔ اس اسرائیلی بربریت میں چھ سو سے زیادہ فلسطینی اور تین سو لبنانی شہید ہوئے۔

۱۹۷۸ء کیمپ ڈیوڈ معاہدہ

یہ معاہدہ مصری صدر انور سادات اور اسرائیلی وزیرِاعظم بیگن کے درمیان امریکی صدر جمی کارٹر کی سرپرستی میں امریکی ریاست میری لینڈ کے دیہی علاقے میں واقع کیمپ ڈیوڈ میں تیرہ دن کے خفیہ مذاکرات کے بعد ہوا۔ اس سے ایک سال پہلے ہی سادات اسرائیل سے امن مذاکرات کا اعلان کرتے ہوئے اسرائیلی دورے پر بھی گئے تھے۔ سادات نے کیمپ ڈیوڈ معاہدے کے تحت پہلے عرب ملک کے طور پر باضابطہ اسرائیلی ریاست کو تسلیم کر لیا۔ اس معاہدے کے دو حصے تھے: ایک حصہ مصر اور اسرائیل سے متعلق تھا جس میں ۱۹۶۷ء کی اقوامِ متحدہ کی قرارداد نمبر ۲۴۲ کو نافذ کرنا تھا جس میں علاقائی سالمیت، ریاستی خود مختاری اور سیاسی آزادی کے احترام پر زور دیا گیا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ زیرِ قبضہ علاقوں سے اسرائیلی انخلا اور تسلیم شدہ حدود میں پر امن رہنے کے خطرات کو ختم کرنے پر زور دیا گیا تھا۔ ساتھ دونوں فریقوں سے تین ماہ میں جامع امن معاہدے کا کہا گیا تھا۔ معاہدے کے دوسرے حصے میں مغربی کنارے اور غزہ میں فلسطینی اتھارٹی کا قیام اور مذکورہ علاقوں میں قیامِ امن کے بعد اسرائیلی فوجی انخلا کا فریم ورک شامل تھا۔ یاسر عرفات نے اس معاہدے پر شدید برہمی کا اظہار کیا اور مصر سے اپنے تعلقات ختم کر کے شام کے قریب ہو گئے۔ جواب میں

سادات نے بھی مصر میں پی ایل او کا دفتر بند کر کے فلسطینی ریڈیو نشریات پر پابندی لگا دی۔ دراصل عرفات خود پانچ سال سے اسی نظریے پر گامزن تھے لیکن مصر نے پہل کر کے اس کو عملی صورت دینے کا آغاز کر دیا تھا۔ اس معاہدے کے بعد عرب لیگ نے بھی اپنے اتحاد سے مصر کو خارج کر دیا۔ اس معاہدے کی رو سے مصر کو سینا کا تمام مقبوضہ علاقہ واپس مل گیا۔ اسی سال آزادی فلسطین کے مشہور رہنما شیخ حسن سلامہ شہید رحمۃ اللہ علیہ کے فرزند علی حسن سلامہ بیروت میں اسرائیلی کمانڈوز کی ایک کارروائی میں شہید ہوگئے۔ یہ یاسر عرفات کے انتہائی قریبی ساتھی تھے اور انھوں نے ۱۹۷۰ء کے بعد بلیک ستمبر کے نام سے ایک الگ عسکری ونگ بھی تشکیل دیا تھا۔ یہ میونخ اولمپک میں اسرائیلیوں کی ہلاکت کے بھی اہم منصوبہ ساز تھے۔

۱۹۷۹ء میں ایران میں آنے والے انقلاب پر شام اور لبنان میں موجود فلسطینیوں کا جوش و خروش دیدنی تھا۔ جشن کی تقریبات منعقد ہوئیں، ریلیاں نکالی گئیں۔ ''آج ایران تو کل فلسطین کی باری ہے''، یہ نعرہ زبان زدِ عام ہو گیا۔ دراصل ان میں پہلے ہی بہترین روابط تھے۔ کیونکہ ایرانی انقلابیوں کی بڑی تعداد فلسطینی کیمپوں ہی کی تربیت یافتہ تھی۔ یاسر عرفات ایران آئے اور ان کا تہران میں شاندار استقبال ہوا۔

۱۹۸۲ء لبنان پر اسرائیلی حملہ اور لبنان سے فلسطینی مزاحمت کا خاتمہ

مصر سے معاہدے کے بعد اسرائیل پوری یک سوئی کے ساتھ لبنان میں موجود فلسطین کی مسلح تحریکوں کے خاتمے کی طرف متوجہ ہوا۔ جو اب فلسطینی مزاحمت کا مضبوط مرکز بن چکا تھا۔ چنانچہ ۶، جون ۱۹۸۲ء کو اسرائیل نے لبنان پر بیک وقت زمین، فضا اور سمندر سے ایک بڑے حملے کا آغاز کر دیا۔ سب سے پہلے شوف کے نشیبی علاقوں میں لبنان کی کرسچین ملیشیا سے مل کر فلسطینی بستیوں پر قبضہ کر لیا۔ اسرائیلی فوج آگے بڑھی۔ صیدا کے علاقے میں فلسطینیوں نے بغیر مزاحمت کے ہتھیار ڈال دیے لیکن اس کے باوجود ان کی بستیوں کو تباہ کر دیا گیا۔ اس کے بعد اسرائیلی فوجوں نے پیش قدمی کرتے ہوئے بیروت کے قریب فلسطینی عسکری کیمپوں کا محاصرہ کر لیا۔ فلسطینیوں نے لبنانی صدر الیاس سرکیس سے رابطہ کیا لیکن اس نے بھی کسی قسم کی رعایت دینے سے انکار کر دیا۔ اور شام نے بھی ہاتھ کھینچ لیے۔ یہ محاصرہ کئی دن جاری رہا۔ اور اسرائیل نے کسی قسم کا مطالبہ ماننے سے انکار کر

دیا۔ آخر فلسطینی مسلح تنظیموں کے انخلا پر مذکرات ہوئے۔ پی ایل او قیادت عام شہریوں کی یہاں سے پرامن منتقلی پر مُصِر تھی، لہذا امریکہ نے بین الاقوامی فوجوں کی نگرانی میں عام شہریوں کی پرامن منتقلی کی ضمانت دی۔ اس ضمانت کے بعد پی ایل او نے لبنان سے انخلا شروع کر دیا۔ اس طرح چند دنوں میں دس ہزار کے قریب فلسطینی مزاحمت کار لبنان چھوڑ کر قبرص، تیونس اور دیگر ممالک میں منتقل ہو گئے۔ اس طرح لبنان میں پی ایل او کے گیارہ سالہ دور کا خاتمہ ہو گیا، جنھوں نے ۱۹۷۰ء کے بلیک ستمبر کے بعد لبنان کو مرکز بنایا تھا۔

صبرا اور شاتیلا کا قتلِ عام

پی ایل او کے انخلا اور عام شہریوں کی پرامن منتقلی کی ضمانت کے باوجود اسرائیلی افواج نے بیروت کے جنوب مغرب میں واقع محلہ صبرا اور فلسطینی پناہ گزین کیمپ شاتیلا کو محاصرے میں لے لیا۔ اس کے بعد لبنانی ملیشیا کے ساتھ مل کر فلسطینیوں کا بھیانک قتلِ عام کیا۔ لوگوں کو باندھ کر قطاروں میں لٹا کر کلہاڑوں سے ٹکڑے کیا گیا۔ مردوں کے سامنے عفت مآب خواتین کی آبرو ریزی کی گئی۔ معصوم بچوں کو ماؤں کی آنکھوں کے سامنے بے دردی سے قتل کیا گیا۔ اور لاشوں کے ٹکڑے کر کے گڑھوں میں ڈال دیا گیا۔ تاریخ کے اس بھیانک قتلِ عام میں چار ہزار سے زیادہ فلسطینی شہید ہوئے۔ اس کے بعد الفتح نے شام سے تعلقات ختم کر دیے اور یاسر عرفات نے اپنے حریف مصر سے ہاتھ ملا لیا۔ جواب میں شام نے اپنے ملک میں موجود فلسطینی بعض رہنماؤں کے ذریعے عرفات پر الزامات لگوا کر اس کی قیادت کو متنازع بنا دیا۔

حزب اللہ، اسرائیل اور جنوبی لبنان

حزب اللہ لبنان بلکہ مشرقِ وسطیٰ میں اہلِ تشیع کی سب سے طاقت ور عسکری و سیاسی تنظیم ہے۔ اس کی بنیاد لبنان خانہ جنگی کے دوران ۱۹۸۵ء کے قریب رکھی گئی۔ یہ تنظیم براہِ راست ایران کے رہبرِ معظّم کے احکامات کی پابند ہے اور ایران کی انقلابی تعلیمات اس کا منہج ہے۔ ایران کے مذہبی انقلابی رہنما جناب خمینی اس تنظیم کے فکری اور روحانی مرجع ہیں۔ لبنان میں اسی طرز کے انقلاب کے لیے کوشاں یہ تنظیم مشرقِ وسطیٰ کے دیگر ممالک

میں بھی ایران اور شیعہ مفاد کی محافظ ہے۔ حزب اللہ نے لبنان میں امریکی، برطانوی اور فرانسیسی موجودگی کی شدید مخالفت کی۔ اور اس نے جنوبی لبنان میں اسرائیلی قابض افواج اور جنوبی لبنان آرمی کے خلاف اٹھارہ سالہ مسلح جدوجہد میں بنیادی اور قائدانہ کردار ادا کیا۔ صیہونی دشمنی اور اسرائیل کی بربادی اس کا اہم نعرہ ہے۔ حزب اللہ نے ہمیشہ فلسطین کی عسکری تنظیموں کے ساتھ اتحاد و تعاون کا تعلق برقرار رکھا۔

جنوبی لبنان جنگ: ۱۹۸۲ تا ۲۰۰۰ء

۱۹۸۲ء میں جب اسرائیل نے لبنان پر حملہ کر کے فلسطینیوں کا قتلِ عام کیا اور پی ایل او کو وہاں سے نکال دیا تو اس کے بعد جنوبی لبنان میں سیکیورٹی زون قائم کر کے اپنا قبضہ برقرار رکھا۔ اس سے پہلے اسرائیل نے ۱۹۷۸ء میں جنوبی لبنان میں ایک ملیشیا جیش لبنان الجنوبي قائم کی جس کی قیادت لبنانی فوج کے منحرف عیسائی آفیسر انٹونی لہاد اور سعد حداد کے ہاتھ میں تھی اور اس ملیشیا کے ارکان کی اکثریت بھی کرسچن تھی۔ اسی کی مدد سے اسرائیل نے فلسطینیوں کا قتلِ عام بھی کیا۔ جنوبی لبنان میں بھی اسرائیل نے اسی آرمی کی مدد سے اٹھارہ سال تک مظالم ڈھائے۔ اس عرصے میں حزب اللہ نے امل تنظیم اور کچھ فلسطینی سوشلسٹ تنظیموں کے ساتھ مل کر اسرائیل کے خلاف بھرپور مسلح جدوجہد کی۔ اور اس کی اسرائیل سے کئی خون ریز جھڑپیں ہوئیں۔ اس مزاحمت کو ایران اور شام کا بھرپور تعاون حاصل رہا۔ جبکہ روس، کوریا اور دیگر سوشلسٹ ممالک بھی اس کے حامی رہے۔ جنوبی لبنان کی آرمی اس مزاحمت کی تاب نہ لاتے ہوئے ڈھیر ہو گئی اور اسرائیل کو جنوبی لبنان سے اپنی فوجیں نکالنی پڑیں۔ آخر ۲۰۰۰ء میں اسرائیل نے جنوبی لبنان کو اپنی تمام فوجوں سے خالی کر دیا۔ اسرائیل کے فوجی انخلا کے اس دن کو حزب اللہ عظیم فتح کے طور پر مناتی ہے۔ اسرائیلی انخلا کے بعد لبنان آرمی کے بیش تر اراکین کو اسرائیل نے لبنانی سرحد کے قریب اسرائیلی علاقے کِریات شمونہ میں آباد کیا۔

۱۹۸۳ء: بیروت میں امریکی فوج پر حملہ

بیروت انٹرنیشنل ایئرپورٹ پر قائم امریکی فوجی اڈے پر ہونے والے طاقت ور بم دھماکے میں ۲۴۱

امریکی فوجی ہلاک ہوئے۔ اسی روز اس اڈے سے تین میل دور فرانسیسی فوجی اڈے پر بھی بم دھماکا ہوا جس میں ۵۸ فرانسیسی فوجی مارے گئے۔ یہ ویتنام جنگ کے بعد امریکہ کا سب سے بڑا فوجی نقصان تھا۔ یہاں موجود امریکی و فرانسیسی افواج اس کثیر الملکی افواج کا حصہ تھیں جو لبنان میں خانہ جنگی کے خاتمے اور یہاں سے فلسطینیوں کے انخلا میں مدد فراہم کرنے کے نام پہ آئی تھیں۔ ان دھماکوں کے بعد امریکہ اور فرانس نے لبنان سے اپنی افواج واپس بلالیں۔

عراق پر اسرائیلی حملہ

جون ۱۹۸۱ء میں اسرائیل نے ایک فضائی حملے میں بغداد کے قریب واقع عراق کے اوسیراق ایٹمی ری ایکٹر کو تباہ کر دیا۔ یہ دنیا میں پہلا ایسا حملہ تھا جب کسی مقتدر ریاست میں گُھس کر اس کے جوہری ری ایکٹر کو مکمل تباہ کر دیا گیا۔ سات جون کو صحرائے سینا میں واقع ایٹیزن ایئر پورٹ سے آٹھ ایف سولہ طیاروں نے اڑان بھری جن کے دفاع پر مزید پانچ ایف پندرہ طیارے بھی محوِ پرواز تھے۔ جبکہ کسی ہنگامی صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے مزید ساٹھ طیاروں کو متحرک رکھا گیا۔ یہ طیارے جنوبی اردن اور شمالی سعودیہ کے اوپر سے گزرتے ہوئے چھ سو میل دور اس ایٹمی ری ایکٹر پر حملہ آور ہوئے اور چند منٹوں میں کئی ٹن وزنی بم گرا کر اس کو نیست و نابود کر کے صحیح سلامت واپس آ گئے۔ اس حملے کو آپریشن اوپیرا کا نام دیا گیا۔

* * * * *

کتابیات:

حركـــة المقاومـــة الإســـلامية، علـــي الجربـــادي، مجلـــة الدراســـات الفلسطينية،**١٩٩٣ء**

الانتفاضـــــــةوالمقاومةوالعمليات الاستشـــــــهادية،ماجد كيـــــــالي، مجلة الدراسات الفلسطينية،**٢٠٢٠ء**

المقاومـــة الفلســـطينية بـــين غـــزة و لُبنـــان و الانتفاضـــة: محمـــد خالـــد الأزعر، مركز دراسات الوحدة العربية، بيروت

المقاومة الفلسطينية،مؤسسة الدراسات الفلسطينية

قائمة العمليات العسكرية،مؤسسة الدراسات الفلسطينية

قائمة أهم الأحداث الفلسطينية، مؤسسة الدراسات الفلسطينية

كـــي لا ننســـىٰ قُـــرى فلســـطين التـــي دمَّرتهـــا إســـرائيل**١٩٤٨ء**،وليـــد الخالـــد، مؤسسة الدراسات الفلسطينية

بلادنا فلسطين،مصطفى مراد الدّباغ، مؤسسة الدراسات الفلسطينية

المجازر الإسرائيلية بحق الشعب الفلسطينية،محسن صالح، مريم غشباني،بيروت

تاريخ العرب الحديث،أحمد عزت عبد الكريم،دار النهضة العربية

الكفـــاح المســـلم و البحـــث عـــن دولـــة الحركـــة الوطنيـــة الفلســـطينية، يزيـــد صائغ، مؤسسة الدراسات الفلسطينية

حرب العصابات في فلسطين، صبحي ياسين، دار الكتاب العربي، مصر

الطريق إلى القدس، محسن صالح، مكتبة الزيتونة، بيروت

تاريخ فلسطين، تيسير جباره، دار الشروق، عمان، أردن

شہرِ قدس تہذیبی چیلنج کے نشانے پر، مترجم: عبدالحمید اطہر ندوی، ادارہ احیاے علم، لکھنؤ

جہادِ آزادی کی نئی منزل فلسطین، شمیم فیضی، کمیونسٹ پارٹی پبلی کیشنز

المیۂ فلسطین، محمود جاوید، کتب خانہ جمہوریہ، کراچی

مسئلۂ فلسطین، ایڈورڈ سعید، مترجم شاہد حمید

الشرق الأوسط مجلة۲۰۱۰ء

وفا نیوز ایجنسی فلسطین

الجزیرة عربي

بي بي سي عربي

بی بی سی اردو

https://www.palestine-studies.org/ar

احمد جاویدؔ
معروف دانش ور، نقاد اور شاعر

فلسطینیوں کی اصل قوت

تحریکِ آزادیِ فلسطین کے معروف شاعر محمود درویش کی انقلابی شاعری پر محترم احمد جاویدؔ صاحب کا تبصرہ

محمود درویش جو فلسطین کے غالباً سب سے بڑے انقلابی شاعر تھے اور بین الاقوامی سطح کے ایک بڑے شاعر تھے۔ ان کی شاعری کا نوے فیصد سے زیادہ حصہ فلسطین اور اسرائیل کے تنازعے سے پیدا ہونے والی صورتِ حال کو اپنا موضوع بناتا ہے۔ لیکن چونکہ وہ بڑے شاعر ہیں، تو ان کی شاعری میں وہ صحافیانہ رپورٹنگ کا سا انداز نہیں ہوتا، بلکہ وہ زیادہ ارتکاز اس بات پر کرتے ہیں کہ فلسطینیوں کے باطن میں کون سا معرکہ برپا ہے۔ فلسطینی تہذیب کو کس طرح کی تحقیر کا سامنا ہے اور اسرائیل کی طرف سے ان پر ہونے والے مظالم اپنی تاثیر کے اعتبار سے کیا ہیں اور کیا نتائج پیدا کر رہے ہیں؟ کوئی بڑا تصورِ انقلاب ڈائری کو سامنے رکھ کہ بنایا نہیں جاتا، بلکہ اس میں ایک بہت بڑے منظر نامے میں چیزوں کو دیکھا جاتا ہے۔ مثلاً، خیر و شر، ظالم اور مظلوم، غلام اور آقا، جو انسانوں میں طبقاتی تضادات کی سب سے زیادہ شدید قسمیں ہیں، کوئی بھی انقلابی فکر انھیں استعمال میں لاتی ہے۔ اور اسی وجہ سے انقلاب چاہے مقامی ہو یا آزادی کی تحریک ہو، غلامی اور ظلم کی صورتِ حال چاہے مقامی ہو، ایک خاص خطے میں ہو رہی ہو، لیکن اس سے لڑنے کے لیے یا اس کا تجزیہ کرنے کے لیے جو پس منظر ہوتا ہے، جو منطق ہوتی ہے، وہ آفاقی اور عالمی ہوتی ہے۔ یعنی انسانی صورتِ حال میں آجانے والی ایسی چیزیں جو بڑے ردِّ عمل کا تقاضا کرتی ہوں، ان کی لاجک اور ان کا محرک بننے والا جذبہ، اس میں شامل نفرت، اس میں داخل ہوجانے والی جارحیت، غصہ اور افسوس یہ سارے لوازم جو کسی مجبور یا مظلوم قوم کے اندر جذبۂ انقلاب پیدا کرنے کے لیے ہوتے ہیں، وہ سب لوازم آفاقی ہوتے ہیں، وہ کسی خاص تہذیب سے مشروط اور کسی خاص نظریے تک محدود نہیں ہوا کرتے۔ یعنی انسان اپنی کلّیت میں چند بڑے آئیڈیلز رکھتے ہیں، ان آئیڈیلز کی سطح پر پہنچے بغیر مقامی انقلاب یا مقامی تحریک بھی نہیں چلائی جا سکتی۔ فلسطین کی

صورتِ حال اس اعتبار سے بہت منفرد ہے، حتٰی کہ چین، ویتنام، ایران اور افغانستان وغیرہ ان سب سے مختلف ہے۔ یہ وہ زمینیں ہیں جہاں پر بڑے بڑے انقلاب آئے اور جنھوں نے کامیابی کا اچھا خاصا دور بھی دیکھا۔ فلسطینیوں کے ساتھ مسئلہ یہ ہے کہ ان کے یہاں انقلاب ایک المیے کا حصہ ہے، یعنی ان کی جو انقلابی بنیادیں ہیں یا ان کا جو جذبۂ آزادی ہے، وہ اپنے قوام میں المیاتی ہے۔ اور یہ شاید جدید تاریخ میں یہودیوں کے بعد واحد قوم ہے، جس کو اپنے لیے راستہ بھی بنانا ہے اور منزل بھی بنانی ہے۔ اور جسے اپنی بقا کو لاحق خطرات سے نکلنے کے لیے اپنے اندر موجود تمام جذباتی قوتوں کو بروے کار لانا ہے۔ ان کے یہاں اصل طاقت باطنی ہے، جذبے کی ہے۔ اور جذبے کے اعتبار سے یہ جنگِ عظیم کے یہودیوں سے بہت زیادہ ہیں۔ ان کی مظلومی نے ان میں المیہ تو پیدا کیا ہے، لیکن وہ المیہ آتش فشاں بننے کا امکان رکھتا ہے۔ فلسطینیوں نے اس امکان کو زندہ رکھا ہے۔ یہ یہودیوں کی طرح کبھی مایوس نہیں ہوئے، یہ کبھی خوف میں مبتلا نہیں ہوئے، انھوں نے کبھی بھی ظلم سے کسی بھی طرح کی مصالحت کا رویہ قبول نہیں کیا۔ ان کے اندر، ان کی روح میں، ان کے وجود میں فلسطین کا جو تصور ہے اور فلسطینی ہونے کا جو تصور ہے وہ آج موجود تقریباً دنیا کی تمام قوموں سے زیادہ پُرزور، جذبے والا اور قربانی دے سکنے کے لائق بنانے والا ہے اور بڑی سے بڑی ناکامی کو اپنے جذبۂ انقلاب میں تقویت پیدا کرنے کا سبب بنا لینے والا ہے۔ اس وقت یہ واحد قوم ہے جو اپنے اندر اور باہر دونوں کی المناک صورتِ حال کو کسی بڑی رومانویت میں پڑے بغیر اور شر اور ظلم سے لڑنے کے لیے انسانی فطرت میں جتنی استعداد، صلاحیت اور قوت رکھی گئی ہے، اس کو اپنے اندر زندہ، بیدار اور تازہ رکھتے ہوئے اسے عمل میں لانے کے مراحل میں ہے۔ یعنی انقلاب جذبے کے طور پر انھیں پورا نصیب ہے، ذہنی یکسوئی پوری نصیب ہے، میں نے قربانی کے جذبے سے خالی کوئی فلسطینی نہیں دیکھا۔ اور آزادی کے اجتماعی تصور کو اگر کسی نے محسوس کیا ہے، اگر کسی نے اس کا ادراک کیا ہے، اگر کسی نے اس نظریے کو اپنی غلامی سے نکلنے کا واحد تصور اور رہنما بنایا ہے تو وہ صرف فلسطینی ہیں، لہذا یہ ایک بہت بڑی بات ہے۔

آج اگر موجودہ صورتِ حال پر بات کرنی ہو، یعنی اگر ہم سے پوچھا جائے کہ آج جو ہو رہا ہے، اس کا آغاز یا تاریخی پس منظر کیا ہے، وہ بھی پتا چل جائے گا اور یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ تاریخی پس منظر کا مطلب فلسطینیوں کے لیے وہ نہیں ہے جو دوسری قوموں کے لیے ہے۔ جب سے یہ تنازع چل رہا ہے یہ within

history اور Beyond History گزرنے کے تجربے سے کبھی خالی نہیں رہے۔ تو اس اعتبار سے یہ واحد قوم ہے، واحد اجتماعیت ہے، جس نے اپنے کُل کے زندہ اجزا کے طور پر بڑے بڑے خود مختار افراد پیدا کیے ہیں۔ جس قوم کے افراد اپنی انفرادیت کو اجتماعی وجود میں ڈھالنے کے قابل بنا سکیں اس قوم کو کوئی شکست نہیں دے سکتا۔ بہر حال، محمود درویش کی ایک بہت مشہور نظم ہے، اس کا اردو ترجمہ آپ کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔ اس نظم کا عنوان ہے: ''شناختی کارڈ'' اور یہ نظم آج کل کی نہیں ہے یہ ۱۹۶۴ء کی ہے۔ ۱۹۶۴ء میں جس صورتِ حال کا اس نظم میں اظہار ہوا ہے وہ صورتِ حال آج بھی ہے اور وہی صورتِ حال کل بھی تھی اور زیادہ شدت کے ساتھ تھی۔ جو آدمی انقلاب کے جذبے میں سچا ہو تو وہ مستقبل کو دیکھ لینے کی قابلیت پیدا کر لیتا ہے، مستقبل صرف جذبۂ انقلاب کی عینک سے نظر آتا ہے۔ اس ''شناختی کارڈ'' میں ذرا ان کا انداز دیکھیں: ''درج کرو''، اب جیسے یہ کسی دفتر میں گئے ہیں یا چیک پوسٹ پر پہنچے ہیں جہاں اسرائیلی چوکیدار کھڑا ہے اور ان لوگوں کو خاص شناختی کارڈ دیے گئے ہیں جو غلاموں کو دیے جاتے ہیں۔ اور پہلے اسرائیل میں ایسا تھا، شاید اب تک ہو۔ تو فلسطینیوں کو ہر ہر قدم پر مختلف قسم کی چیکنگ اور طرح طرح کے سوال جواب کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ اور ایک وضاحت یہ کر دوں کہ فلسطینیوں کو اسرائیل میں عرب کہا جاتا ہے، ان کے لیے عرب کا محاورہ ہے۔ اب ذرا نظم دیکھ لیجیے:

پہلا بند

''درج کرو! میں عرب ہوں۔ میرا شناختی کارڈ نمبر پچاس ہزار ہے۔ میرے آٹھ بچے ہیں اور نواں بچہ موسمِ گرما کے بعد دنیا میں آجائے گا۔ پس کیا تم غصہ کرو گے؟''۔

اب اس کے پس منظر میں جو سوالات ہیں وہ آپ سمجھ رہے ہیں کہ ان لوگوں سے کیا کیا پوچھا جاتا تھا۔ یہ ایک بند ہے، اس کی آخری لائن میں ہے کہ یہ سب میں ہوں، میری تفصیل یہ ہے، تو کیا مجھ پر غصہ کرو گے؟ کس بات پر کرو گے؟ اس بات پر کہ میں عرب ہوں؟ یا اس بات پر کہ میرا شناختی کارڈ نمبر پچاس ہزار ہے؟ یا اس بات پر کہ میرے آٹھ بچے ہیں؟ یا اس بات پر کہ نواں بچہ بھی پیدا ہونے والا ہے؟ تو تم کس بات پر غصہ کرو گے؟ کیونکہ میں تمھارے بارے میں جانتا ہوں کہ تمھیں ہماری ہر بات پر غصہ آتا ہے، ہماری ہر چیز پر تمھیں غصہ آتا

ہے، لیکن فی الحال میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ ان میں سے کون سی چیز تمھارے غصے کا بڑا سبب ہے۔

دوسرا بند

''درج کرو! میں عرب ہوں۔ اور یارانِ محنت کش کے ہمراہ پتھر کی کان میں کام کرتا ہوں۔ میرے آٹھ بچے ہیں۔ میں ان کے لیے نان اور ملبوسات اور اسکول کی کاپیاں پتھروں سے نکالتا ہوں۔ میں تمھاری چوکھٹ سے خیرات نہیں مانگتا، نہ ہی خود کو تمھارے آستانوں پر حقیر بناتا ہوں، پس کیا تم مجھ پر غصہ کروگے؟''۔

ذرا اس کو محسوس کریں! جیسے اس تصور سے جسم سرد سا ہو جاتا ہے۔ اب یہ دوسری چیک پوسٹ ہو سکتی ہے کہ وہاں بھی پوچھا گیا۔ تو انھوں نے کہا کہ میں عرب ہوں اور مزدور دوستوں کے ہمراہ جو میری ہی قوم کے ہیں ان کے ساتھ پتھر کی کان میں کام کرتا ہوں۔ پتھر کہا ہے سنگِ مرمر وغیرہ نہیں کہا، اس میں بھی ایک معنویت ہے کہ ہم چاہے سونا نکالیں اور چاہے مرمر کی سلیں بنا بنا کر دیں وہ ہمارے لیے تو بے فائدہ ہے۔ اس لیے کہ وہ ہمارے لیے ایک عام پتھر کی سلیں بنا دی گئی ہیں۔ تو میرے آٹھ بچے ہیں، میں ان کے لیے نان اور ملبوسات اور سکول کی کاپیاں پتھروں سے باہر نکالتا ہوں۔ یہ جو مصرع ہے یہ بہت گہرائی میں جا کر وار کرتا ہے کہ جو کوہ کنی کے سارے کام میں کر رہا ہوں اور پتھر نکال رہا ہوں میرے لیے ان پتھروں کی اہمیت صرف یہ ہے کہ ان پتھروں سے میرے بچوں کی کاپیاں اور روٹیاں اور کپڑے نکلتے ہیں۔

تیسرا بند

''درج کرو! میں عرب ہوں اور میرا صرف نام ہے کوئی لقب نہیں۔ میں ایک ایسی سرزمین پر صابر ہوں جہاں ہر کوئی وفورِ غضب میں زندگی بسر کرتا ہے۔ پیدائشِ زمانہ سے قبل، ادوار کے شروع ہونے سے پہلے، سرو اور زیتون سے پیش تر اور گھاس کے اگنے سے قبل میری جڑیں اس زمین میں پنجہ گاڑ چکی تھیں۔ میرے باپ کا تعلق ہل چلانے والے خاندان سے ہے، کسی نجیب خاندان سے نہیں، میرا دادا کسان تھا بے حسب بے نسب! قبل اس کے کہ وہ مجھے کتاب پڑھنا سکھائے اس نے مجھے سورج کا طلوع ہونا سکھایا، یا سورج کا

طلوع ہونا دکھایا۔ میرا گھر پہرے دار کی کوٹھری کے مانند ہے، شاخوں اور سرکنڈوں سے بنا ہوا۔ پس کیا تم میری ان حیثیتوں سے راضی ہو؟"۔

آپ دیکھ رہے ہیں کہ پہلی بات یہی ہوتی ہے کہ میں عرب ہوں، یعنی مجھ پر غصہ کرو، مجھ سے نفرت کرو پھر بھی میں عرب ہوں، میں غلام ہوں۔ تم اپنے آپ کو آزاد مانتے رہو اور مجھے غلامی کے پاٹ میں پیستے رہو کوئی بات نہیں۔ تو درج کرو! میں عرب ہوں اور میرا صرف نام ہے کوئی لقب نہیں، کوئی کنیت نہیں، جیسے عربوں کے ہاں ہوتا ہے، میں عرب ہوں۔ اس نے پوچھا ہوگا تمھاری کنیت کیا ہے؟ کہتے ہیں کہ میرا صرف نام ہے کوئی لقب نہیں۔ اب اس کو ذرا توجہ سے دیکھیں تو اس میں سمجھنے والی کوئی بات نہیں، لیکن محسوس کرنے والی ہے، کہ میں مٹی ہوں ایسی مٹی کہ جس پر آسمان سایا نہیں ڈالتا۔ میں ایک ایسی سرزمین پر صابر ہوں جہاں ہر کوئی وفورِ غضب میں زندگی بسر کرتا ہے۔ پیدائشِ زمانہ سے قبل یعنی زمانے کی پیدائش سے قبل، ادوار کے شروع ہونے سے پہلے سرو اور زیتون سے پیش تر اور گھاس کے اگنے سے قبل میری جڑیں اس زمین میں پنجہ گاڑ چکی تھیں۔ یہ ہوتا ہے فلسطینی، یعنی اس کا فلسطینی ہونا اس کی تمام شناختوں پر غالب ہے۔ میرا گھر پہرے دار کی کوٹھری کے مانند ہے۔ یہ بہت خوبصورت ہے، بہت علامتی ہے کہ ہر فلسطینی کا گھر اپنے ساتھ والوں کے لیے پہرے دار کی کوٹھری ہے۔ پس کیا تم میری ان حیثیتوں سے راضی ہو؟

چوتھا بند

"درج کرو! میں عرب ہوں۔ بالوں کا رنگ کوئلے کی طرح سیاہ، آنکھوں کا رنگ بھورا اور میری شناختی علامات: میرے سر پر عربی رومال اور اس پر سیاہ حلقہ ہے جو کہ مضبوط پتھر کے مانند ہے۔ اور لمس کرنے والے کے ہاتھ کو چھیل ڈالتا ہے۔ میری پسندیدہ ترین غزائیں روغنِ زیتون اور پھلیاں ہیں۔ میرا پتا: میں دور دراز اور فراموش شدہ گاؤں سے ہوں، جس کی سڑکیں بے نام ہیں اور جس کے تمام مرد کھیتوں اور پتھر کی کانوں میں کام کرتے ہیں۔ پس کیا تم غصہ کرو گے؟"۔

یعنی میری علامت یہ ہے کہ میرے سر پر عربی رومال اور اس پر سیاہ حلقہ ہے جو کہ مضبوط پتھر کے مانند

ہے، یعنی وہ سیاہ رومال سخت ہے اور ایسا سخت کے اگر کوئی ہاتھ ڈالے گا تو اس کا ہاتھ چھل جائے گا۔ اسی طرح میرا پتا اتنا حقیقی ہے کہ تمھاری سمجھ سے باہر ہے تم وہاں نہیں پہنچ سکتے جہاں میں رہتا ہوں۔ پس کیا تم غصہ کرو گے ؟۔

پانچواں بند

"اور درج کرو! میں عرب ہوں۔ تم نے میرے اجداد کے باغات چرا لیے ہیں اور وہ زمین بھی جہاں میں اپنے بچوں کے ہمراہ کاشت کاری کیا کرتا تھا۔ تم نے میرے لیے اور میرے تمام پوتوں کے لیے کچھ بھی باقی نہیں چھوڑا ہے سوائے ان پتھروں کے۔ تو کیا تمھاری حکومت جیسا کہ کہا گیا ہے ان پتھروں کو بھی چھین لے گی ؟

لہٰذا، درج کرو صفحۂ اوّل پر سب سے اوپر، میں لوگوں سے نفرت نہیں کرتا نہ ہی کسی سے زیادتی کرتا ہوں لیکن! جب مجھے بھوک لگے گی تو غاصب کا گوشت کچا چبا جاؤں گا۔ خبردار رہو... خبردار رہو... میری بھوک سے اور میرے غصے سے!"۔

بس اس کو محسوس کریں کہ سب کچھ تو چھین لیا تم نے، اب تو ہماری ملکیت میں صرف پتھر ہی رہنے دیے ہیں، تو کیا تم ان پتھروں کو بھی چھین لو گے ؟ فلسطینی تحریکِ آزادی میں پتھروں کی ایک تلمیحی حیثیت بھی ہے اور وہ ہے پتھراؤ کرنا، فلسطینی ٹینکوں پر بھی پتھراؤ کرتے ہیں۔ مطلب پتھر ان کا اسلحہ ہے، تو کیا تمھاری حکومت ان پتھروں کو بھی چھین لے گی ؟ لہٰذا، درج کرو صفحۂ اوّل پر سب سے اوپر، میں لوگوں سے نفرت نہیں کرتا نہ ہی کسی سے زیادتی کرتا ہوں لیکن...! اب یہ 'لیکن' اتنا پرزور ہے کہ میں کسی پر زیادتی نہیں کرتا ہوں لیکن...! جب مجھے بھوک لگے گی تو غاصب کا گوشت کچا چبا جاؤں گا۔ تو خبردار رہو... خبردار رہو... میری بھوک سے اور میرے غصے سے !۔ سن چونسٹھ میں محمود درویش نے اسرائیل کو خبردار کیا تھا کہ ہماری بھوک سے ہوشیار رہو، ہمارے غصے سے خبردار رہو! تو یہی دو موجودہ حملے کی وجہ ہیں، یعنی اب انھیں بھوک لگی ہے، اب انھیں غاصب پر غصہ آگیا ہے۔ تو صحیح کہا تھا کہ خبردار! ایسی خطرناک صورتِ حال میں خود کو ڈالنے سے بچو۔

بہر حال، یہ محمود درویش کی نظم ہے اور لگتا ہے کہ شاید کل ہی کہی گئی ہو، جیسا کہ آپ نے دیکھا بھی ان سے زیادہ فلسطین اور فلسطینیوں، اسرائیل اور اسرائیلیوں کو کون جانتا ہو گا۔ اس نظم کا آہنگ اور اس کا مرکزی خیال یہ

بتاتا ہے کہ اسرائیلیوں اور فلسطینیوں کے درمیان جو تصادم ہے یا جو جنگ ہے یہ حق و باطل کی نہیں، ظالم اور مظلوم کی جنگ ہے۔ حق و باطل میں پھر بھی بحث کی گنجائش ہے اور یہ بہر حال قابلِ وضاحت ہے، لیکن ظالم اور مظلوم کی definition میں تو کوئی اختلاف کسی کو بھی، کسی زمانے میں بھی، کسی زبان میں بھی نہیں ہے۔ تو یہ ظالم اور مظلوم کی جنگ ہے۔ اب یہ جنگ جو چل رہی ہے اس جنگ کے فریق ہیں اسرائیل اور فلسطین۔ جنگ میں پہلا جو خیال آتا ہے وہ یہ کہ ان دونوں میں طاقت کا توازن کیا ہے، لہذا جب طاقت نہ ہو تو مصلحت، حکمت اور صبر سے کام لینا چاہیے۔ تو جو لوگ طاقت کو صرف فوجی طاقت سمجھتے ہیں، ظلم کی طاقت سمجھتے ہیں، وہ ہمیشہ فلسطینیوں کو نصیحت کرتے چلے آئے ہیں کہ صبر کرو! صلح حدیبیہ بھی ہوئی تھی، تم صبر کرو، اس سے بڑی شرطیں تم سے نہیں منوائی جارہیں جو رسول اللہ ﷺ سے منوائی گئی تھیں۔ تو ایسے خیر خواہوں کی خدمت میں عرض ہے کہ اس کو منطق کی زبان میں قیاس مع الفارق کہتے ہیں، اس لیے کہ وہ جنگ حق و باطل کی جنگ تھی، کیونکہ اس میں ایک فریق رسول اللہ ﷺ تھے۔ یہ جنگ وہ نہیں ہے، یہ ظالم اور مظلوم کی جنگ ہے۔ اور مظلوم سب سے زیادہ اس بات کا حق رکھتا ہے کہ وہ یہ فیصلہ کرے کہ اسے ظالم پر کب حملہ کرنا ہے، اسے اپنی نفرت کو کب جنگ میں بدلنا ہے۔ لہذا، مظلوم کو کسی باہر کے مشیر کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ وہ ایک الگ تناظر ہے جسے باہر بیٹھے لوگ نہیں سمجھتے۔ تو اب اگر ظاہری طاقت، فوجی طاقت، اسلحہ وغیرہ اور اتحادیوں کے وسائل یہ سب دیکھے جائیں جو ایک جنگ میں ضروری ہیں، تو اس میں ہمارے ذہن میں طاقت کا مطلب صرف فوجی طاقت ہے، ایسے میں تو ظاہر ہے کہ اسرائیل کا اور فلسطینیوں کا کوئی موازنہ، کوئی مقابلہ نہیں ہے۔ جیسے وجود اور عدم میں تضاد ہے، فوجی طاقت کے اعتبار سے وہ فرق وہ تضاد اسرائیل اور ان میں ہے۔ تو اب کیا یہ فلسطینی یہ نہیں سمجھتے کہ فوجی طاقت میں ہمارا ان کے ساتھ کوئی موازنہ نہیں ہے۔ اور اگر وہ یہ سمجھنے کے باوجود جنگ چھیڑ دیتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارا تصورِ طاقت غلط ہے یا ادھورا ہے۔ ہم نے طاقت کو ظلم سے منسوب کرنا سیکھا ہے تاکہ اپنی مظلومی کو کمزوری کا مترادف بناکر اس پر صابر رہیں، لیکن ہر کوئی ہماری طرح نہیں ہوتا۔ ان کے پاس بھی ایک طاقت ہے جو فوجی طاقت سے بڑی طاقت ہے اور وہ ہے جذبۂ انقلاب، جذبۂ آزادی کی قوت۔ یہ کوئی رومانوی یا شاعرانہ بات نہیں ہے، تاریخ یہ بتاتی ہے کہ اگر مظلوم غصے میں آجائے تو اس کا غصہ طاقت ور سے طاقت ور ظالم کے لیے پیغامِ شکست ہے۔

مطلب یہ کہ اگر مظلوم غصے میں آجائے تو ظالم کا بچنا بہت دیر تک ممکن نہیں رہتا، یہ تاریخی قانون ہے۔ اور بظاہر تو طاقت ہاتھ کی طاقت ہے، لیکن ایک طاقت جذبے کی بھی ہوتی ہے، دل کی بھی ہوتی ہے، حوصلے کی بھی ہوتی ہے۔ تو یہ طاقت اپنے انسانی جوہر اور ساخت میں اسلحے کی طاقت سے بہت زیادہ ہوتی ہے۔ طاقت ور دل، مضبوط ہاتھ پر فاتح ہو کر رہتا ہے، چاہے بیچ میں مار کھاتا رہے، لیکن یہ اپنی طاقت کو اخلاقی اطمینان اور پوری وجودی اُمنگ کے ساتھ محفوظ رکھتا ہے۔ اور ظالم جو اگرچہ مضبوط ہاتھ والا ہے، لیکن اس کے پیچھے کوئی نظریہ، کوئی ہیومن اپروچ اور کوئی اخلاقی جواز نہیں ہے، وہ صرف ایک روبوٹک قوت ہے جو ہر احساس سے خالی ہو کر استعمال میں آرہی ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ فلسطینیوں جیسی قوم اس وقت روے ارض پر نہیں ہے، فلسطینی چاہے مسلمان ہوں، عیسائی ہوں، سیکیولر ہوں، سب کے سب اسرائیل سے نفرت میں ایک ہیں۔ یہ وحدت اس وقت دنیا میں اگر کہیں ہے تو فلسطینیوں میں ہے۔ تو اس پہلو سے اگر دیکھیں تو فلسطینی کسی بھی قوم کی آئیڈیل تعریف پر پورے اترتے ہیں۔ یعنی قومی وحدت کا شعور ان کے یہاں پوری طرح آئیڈیا کی سطح پر محکم، عمل کی سطح پر مسلسل اور جذبے کی سطح پر مستقل ہے۔ یہ شعور کہ ہم فلسطینی ہونے کی بنیاد پر ایک ہیں، تو یہ ذہنی یکسوئی، دلی جذبات اور مشترکہ نصب العین کے ساتھ اگر کسی قوم میں ہے تو وہ صرف فلسطینی ہیں۔ تو جس قوم کی استعداد کا یہ عالم ہو، جس قوم کے یہاں طاقت کا تصور مظلومی سے دلیل اور غذا حاصل کرتا ہو، جس کی مظلومی اس کی طاقت بن جائے، تو اسے پھر ظالموں کا بڑے سے بڑا اتحاد بھی زیر نہیں کر سکتا۔ اب جیسے اہلِ غزہ کا نقصان ہو رہا ہے، بہت اموات ہو رہی ہیں، بہت بچے شہید ہو رہے ہیں، بہت مظالم ہو رہے ہیں۔ لیکن اتنی اندوہ ناک صورتِ حال میں بھی آج اہلِ غزہ کا نقصان اسرائیل کو پہنچ جانے والے نقصان سے بہت کم ہے۔ تو حماس خدانخواستہ ہار بھی جائے تو یہ شکست بھی ان کا سر اونچا رکھے گی اور اس کے شجرے کو آباد رکھے گی۔ یعنی اس کے پیچھے اس جیسی نسلیں بہت دور تک ہیں، جیسے کوئی کثیر الاولاد باپ اطمینان سے مر سکتا ہے تو حماس بھی اسی اعتماد میں ہے۔ اگر یہ ہار بھی گئے تو فخر کر سکتے ہیں اور اسرائیل خدانخواستہ جیت بھی گیا تو یہ اپنی فتح پر بھی سر اونچا نہیں کر سکے گا۔

اگر کچھ طاقت ور مسلم ممالک حماس کی حمایت میں اسرائیل کے ساتھ جنگ کا اعلان کر دیں، صرف خطابت کے جوہر نہ دکھائیں باقاعدہ اتر آئیں، گو کہ سرِ دست ایسا ممکن دکھائی نہیں دیتا، تو مجھے کم از کم یقین ہے کہ امریکہ وغیرہ

کی تمام تر پشت پناہی کے باوجود اسرائیل کا وجود اپنی آج تک کی تاریخ میں سب سے بڑے خطرے کا شکار ہو جائے گا۔ نیا ورلڈ آرڈر وجود میں آنا شروع ہو چکا ہے، تکمیل تک جلدی پہنچ جائے گا۔ اور پھر ایک مثبت نتیجہ یہ نکلے گا کہ فلسطین ان شاء اللہ حقیقی مفہوم میں آزادی حاصل کر لے گا، اسے آزادی دی نہیں جائے گی۔ اس کے بعد اس کی آزادی چھینی نہیں جا سکے گی۔ اگر مسلم ممالک میدانِ جنگ میں فلسطینیوں کا ساتھ نہیں دیتے تو عالمِ اسلام میں ایک نئے نوآبادیاتی دور کا آغاز ہو سکتا ہے۔ اگرچہ وہ ابھی بھی چل رہا ہے لیکن یہ کہ پھر وہ بہت محکم اور مضبوط ہو جائے گا۔ ضروری نہیں ہے کہ ہم امریکہ کی نوآبادی بن کر رہیں، ممکن ہے ہم چین کے غلام بن جائیں، ممکن ہے ہم روس کی ماتحتی اور سرپرستی میں چلے جائیں، لیکن ہم ہمیشہ کسی کے دستِ شفقت کے سائے تلے رہیں گے۔ اسی طرح ایک بڑا خطرہ جس کا اظہار ہونا شروع ہو چکا ہے، وہ یہ ہے کہ یہودیوں سے عالم گیر نفرت پیدا ہو جائے گی۔ یعنی اس نفرت میں اضافے کے ساتھ ساتھ یہ نفرت جہاں جہاں یہودی آباد ہیں، وہاں وہاں اپنا متشددانہ اظہار کرنے لگے گی۔ اور اسلاموفوبیا میں اضافہ ہو جائے گا، خاص طور پر مغرب میں جو مسلمان رہتے ہیں ڈر ہے کہ وہ امتیازی رویے کا شکار ہوں گے اور مسلم عسکریت پسندی میں اضافہ ہو جائے گا۔ اسی طرح ایک بہت بڑا خطرہ اسرائیل کے لیے ہے جو جنگی شکست سے بڑا خطرہ ہے، وہ یہ ہے کہ اب یہودیوں کا یہ اعتماد نہیں رہ گیا کہ اسرائیل ہماری پناہ گاہ ہے۔ یہ جو ایک عدمِ تحفظ کا احساس پیدا ہوا ہے، مجھے یقینی لگتا ہے کہ یہ اسرائیل کے جواز کو کمزور کر دے گا اور ایک بہت مثبت اثر ہمارے لیے بھی ممکن ہے بشرطیکہ ہم خود کو اس طرف متوجہ کریں یا اس پر کام کریں کہ اس کام کے لیے سازگار ماحول پیدا ہو گیا ہے، ریاستی سطح پر تو نہیں البتہ عوامی اور سماجی سطح پر اُمّت کا تصور عمل میں لائے جانے کے قابل ہو جائے گا۔ یعنی اگر ہم ایک نئی فطری وحدت، اُمّت کے نام سے اختیار کرنا چاہیں تو اس خواہش کے پورے ہونے کے اسباب اب ہمارے پاس زیادہ ہو جائیں گے۔ بہرحال، یہ اب صرف مذہبی بات نہیں ہے، یہ ہمارے انسان ہونے کا بھی امتحان ہے کہ اس وقت جو بھی اسرائیل سے نفرت کے احساس میں نہیں رہ رہا، وہ انسان نہیں ہے، وہ آدمی نہیں ہے، بلکہ وہ ٹھیک سے جانور بھی نہیں ہے۔

٭٭٭٭

ڈاکٹر محمد رشید ارشد
مدیر غزالی فورم

اُمت کا موجودہ بحران فکرِ اقبال کی روشنی میں

علامہ اقبال کی فکر دو لحاظ سے ہمیں بہت فائدہ دے سکتی ہے: ایک یہ کہ جس ذہنی پستی میں ہم ہیں، علامہ اقبال ہمیں اُس سے نکال سکتے ہیں۔ علامہ اقبال کی شاعری کا ایک بڑا حصہ وہ ہے جو فلسفے اور تعقل کی بلندی پر ہے، یعنی بڑے سے بڑا دماغ جو سوالات پیدا کرتا ہے، علامہ اقبال نے اُن کا جواب دیا ہے۔ یہ علامہ اقبال کی ایک مثالیت پسندی ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ علامہ اقبال جس دور میں رہتے تھے، اُس کے ساتھ بھی وہ فکری طور پر اور عملی طور بہت متعلق تھے۔ یعنی علامہ اقبال دورِ استعمار میں پیدا ہوئے اور اسی دور میں دنیا سے چلے گئے، اُنھوں نے سیاسی آزادی کا دور نہیں دیکھا۔ تھرڈ ورلڈ کے مسلمان ممالک، ایشیا اور افریقا اور مڈل ایسٹ کے ممالک، یہ مابعد استعمار کے ممالک ہیں۔ تو ہم اپنے اجتماعی وجود کو نہیں سمجھ سکتے، جب تک کہ ہم استعمار کے بارے میں یا نوآبادیاتی نظام کے بارے میں گہری بصیرت پیدا نہ کریں۔ اس لحاظ سے علامہ اقبال کے ہاں ہمیں بہت قوت سے یہ چیز ملتی ہے۔ جدید سیاسی نظام، جدید تعلیمی نظام اور استعمار کی لوٹ مار پر جو تنقید اور تجزیہ اُنھوں نے کیا غیر معمولی ہے۔ اور پھر عملاً بھی اُنھوں نے بہت سے کام کیے، مسلم لیگ میں کام کیا، جلسوں میں گئے، انجمن حمایتِ اسلام کے جلسوں سے خطاب کیا، فلسطین اور لندن کا سفر کیا۔ مزید اُنھوں نے اپنے مرشد کی تعلیمات میں بھی جدید مسائل کا حل تلاش کیا۔ مولائے روم کے سامنے اپنا مسئلہ رکھا۔ بالِ جبریل میں علامہ کی ایک نظم ہے پیر و مرید، اس میں وہ ایک سوال کرتے ہیں اور پیرِ رومی جواب دیتے ہیں:

ہے زمانے کا تقاضا انجمن
اور بے خلوت نہیں سوزِ سخن!

عجیب المیہ ہے کہ بڑی شاعری وجود میں آتی ہے یا بڑا خیال آتا ہے، وہ خلوت میں آتا ہے، لیکن زمانے کا تقاضا

انجمن ہے۔ میں ایک غلام قوم میں پیدا ہوا ہوں تو مجھے لوگ سیاست میں گھسیٹ لیتے ہیں۔ مولانا روم نے اُس کا جواب دیا کہ خلوت یار سے نہیں اغیار سے ہوتی ہے۔ اور اُنھوں نے کہا کہ پوستین بہار کے لیے نہیں سردی کے لیے ہوتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بھلے لوگ، ہم مقصد لوگوں کی صحبت، وہ انسان کے لیے منفی اثر نہیں رکھتی، وہ انسان کی تعمیر و ترقی میں بہت مفید ہے۔

اس تمہید کے بعد اب ہم فلسطین کے موضوع پر آتے ہیں۔ مسئلۂ فلسطین کے پس منظر میں ایک اہم واقعہ ۱۹۴۸ء میں پہلی مرتبہ حیفا کے مقام پر یہودی بستی کا قیام ہے۔ اس سے پہلے ۱۸۹۶ء میں تھیوڈور ہرزل نے صیہونیت کی بنیاد رکھی اور پھر اُس نے سلطان عبد الحمید خان ثانی کو پیشکش کی کہ اگر آپ یہود کو آباد ہونے کی اجازت دے دیں گے تو ہم یہاں ایک بہت جدید طرز کی یونیورسٹی قائم کر دیں گے اور اسی طریقے سے سلطنت کا سارا قرض بھی ادا کروا دیں گے۔ لیکن سلطان نے انکار کیا اور اسے رسوائی کے ساتھ واپس ہونا پڑا۔ اس کے بعد سلطان نے خاص طور پر فلسطین میں آنے والے یہودی زائرین کے لیے ایک الگ سرخ رنگ کا پاسپورٹ جاری کیا اور جس کی وجہ سے کوئی بھی یہودی فلسطین میں تین ماہ سے زیادہ قیام نہیں کر سکتا تھا۔

سلطان کی معزولی کے کچھ ہی عرصے بعد جنگِ عظیم اوّل ہوئی، پھر اعلانِ بال فور ہوا اور انگریز نے بندر بانٹ شروع کی جس کے نتیجے میں مختلف عرب مملکتیں قائم ہوئیں، تو وہ ساری کی ساری انگریز کی باج گزار تھیں۔ اور پھر لیگ آف نیشنز قائم کی گئی جہاں اقوام کے معاملات پر غور و فکر کیا جانے لگا، لیکن یہ سب کچھ استعماری طاقتوں کے مفاد میں ہی استعمال ہوتا تھا۔ یہودی آباد کاری کو روکنے کے لیے فلسطین میں ایک قومی تحریک شروع ہو گئی تھی جو ۱۹۱۹ء سے ۱۹۲۸ء تک چلی، جس میں عالمی سطح پر کانفرنسیں بھی کرائی گئیں اور کوشش کی گئی کہ یہودی آباد کاری کا معاملہ روکا جائے اور انگریز جس طریقے سے اپنا جال پھیلا رہا ہے، اس کی تدبیر کی جائے۔ اسی دوران سات ستمبر ۱۹۲۹ء کو لاہور میں انجمنِ حمایتِ اسلام کے ہاں ایک جلسہ ہوا جس میں علامہ اقبال نے ایک تقریر کی۔ اس جلسے میں علامہ اقبال نے فرمایا:

"اے مسلمانانِ لاہور! آپ پر سلامِ رحمت اور برکاتِ الٰہی کا نزول ہو، ہم سب پر فرض ہے کہ ہم بارگاہِ الٰہی میں سجدۂ شکر بجا لائیں، کیوں؟ اس لیے کہ باوجود اُن اختلافات کے جو وطنی سیاست کے متعلق لاہور کے مسلمانوں

میں ہیں، آج ایک جذبے کے ماتحت ہم سب یہاں اکٹھے ہوئے ہیں اور ہم نے اِن تمام اختلافات کو مٹادیا ہے، ہم نے اِن اختلافات کو ایک مقدس غرض کی خاطر نظر انداز کر دیا ہے"۔

یعنی قضیۂ فلسطین علامہ کے نزدیک ایک مقدس غرض ہے۔

"یہ بات غلط ہے کہ مسلمانوں کا ضمیر حبِ وطن کے جذبات سے خالی ہے، البتہ یہ صحیح ہے کہ حبِ وطن کے علاوہ مسلمانوں کے دل میں دینیت و محبتِ اسلام کا جذبہ بھی برابر موجود رہتا ہے۔ اور یہ وہی جذبہ ہے جو ملت کے پریشان اور منتشر افراد کو اکٹھا کر دیتا ہے اور کر کے چھوڑے گا اور ہمیشہ کرتا رہے گا۔ فلسطین میں مسلمان اور اُن کے بیوی بچے شہید کیے جا رہے ہیں، اس ہولناک سفاکی کا مرکز یروشلم ہے جہاں مسجدِ اقصیٰ واقع ہے"۔

اب فرق یہ ہے کہ غزہ میں یہ سب ہو رہا ہے۔

"اس مسجد کا تعلق حضرت خواجۂ دو جہاں ﷺ کے معراجِ مبارک سے ہے اور معراج ایک دینی حقیقت ہے جس کا تعلق مسلمانوں کے گہرے جذبات کے ساتھ ہے"۔

ان دنوں میں جیسے آپ کو معلوم ہے کہ سوشل میڈیا کا دور ہے اور ہر آدمی کچھ نہ کچھ کہہ رہا ہوتا ہے، تو بہت سے لوگوں نے اس طرف توجہ دلائی اور کہا کہ آپ اس مسئلے کو کوئی دینی مسئلہ نہ بنائیں، اس کو دین ایمان کا، حق و باطل کی لڑائی نہ بنائیں، اس کو ایک سیاسی مسئلے کے طور پر پیش کریں۔ یا کچھ لوگوں نے کہا کہ آپ اس کو ظالم اور مظلوم کی جنگ قرار دیں۔ اگر آپ اس کو حق و باطل اور کفر و اسلام کی لڑائی بنائیں گے تو آپ اس قضیے کو نقصان پہنچائیں گے۔ اب دیکھیے علامہ اقبال اس کو ایک دینی رنگ میں ہی بیان کر رہے ہیں۔ یہ مسجدِ اقصیٰ، بیت المقدس، فلسطین کا معاملہ مسلمانوں کے لیے کبھی بھی محض سیاسی نہیں ہو سکتا، یعنی اُس کے ساتھ مسلمانوں کے مذہبی جذبات وابستہ ہیں۔

"صدیاں گزر گئیں کہ ایک معبد تعمیر ہوا تھا جسے ہیکلِ سلیمانی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، یہ معبد مسلمانوں کے یروشلم فتح کرنے سے بہت پہلے برباد ہو گیا۔ آنحضرت ﷺ نے معراج کا ذکر حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے فرمایا تو انھیں ہیکل یا مسجدِ اقصیٰ کے صحیح موقع و محل سے بھی مطلع کر دیا۔ فتحِ یروشلم کے بعد حضرتِ عمر رضی اللہ عنہ بنفسِ نفیس یروشلم تشریف لے گئے، اُنھوں نے مِسمار شُدہ ہیکلِ سلیمانی کا محلِ وقوع دریافت فرمایا اور وہ جگہ ڈھونڈ لی، اُس

وقت اس جگہ گھوڑوں کی لید جمع تھی، جسے اُنھوں نے اپنے ہاتھ سے صاف کیا، مسلمانوں نے جب اپنے خلیفہ کو ایسا کرتے دیکھا تو اُنھوں نے بھی جگہ صاف کرنی شروع کر دی اور یہ میدان پاک ہو گیا، عین اُسی جگہ مسلمانوں نے ایک عظیم الشان مسجد تعمیر کی جس کا نام مسجدِ اقصیٰ ہے۔ یہود و نصاریٰ کی تاریخ میں تو یہ کہیں مذکور نہیں ہے کہ موجودہ مسجدِ اقصیٰ اُسی جگہ پر واقع ہے جہاں ہیکلِ سلیمانی واقع تھا، اس تشخیص کا سہرا مسلمانوں کے سر ہے۔ یہود و نصاریٰ نے اس کی زیارت کے لیے اُس وقت آنا شروع کیا جبکہ یہ مشخص ہو چکی تھی"۔

برطانیہ اس سارے معاملے میں ملوث تھا اس لیے آگے جا کر علامہ نے برطانیہ کے کردار پر گفتگو فرمائی۔

"مگر چونکہ برطانوی مدبروں کا اصل مقصد کچھ اور تھا، اس لیے انھوں نے اپنے سیاسی اغراض و مقاصد کے لیے یہود کو آلۂ کار بنایا، صیہونی تحریک کو فروغ دیا اور اپنی غرض کی تکمیل کے لیے جو ذرائع استعمال کیے گئے، ان میں سے ایک کا نتیجہ آج ہمارے سامنے ہے۔ یہودی گریہ و بُکا کے بجائے مسجدِ اقصیٰ کے ایک حصے کے مالکانہ تصرف کا دعویٰ کر رہے ہیں۔ اُنھوں نے آتشِ فساد مشتعل کر رکھی ہے، مسلمان، اُن کی عورتیں اور بچے بھیڑ بکریوں کی طرح ذبح کیے جا رہے ہیں۔ فلسطین کے عربوں کی مجلسِ اعلیٰ نے اعلان کیا ہے کہ حکومت نے یہودیوں کو مسلح کر دیا ہے، جس کی وجہ سے اِس قدر خون ریزی ہو رہی ہے۔ صیہونی تحریک مسلمانوں کے لیے کوئی خوش گوار نتائج پیدا نہیں کرے گی، بلکہ اس سے غیر معمولی فتنوں کے ظہور پذیر ہونے کا خطرہ ہے۔ اب حکومتِ برطانیہ نے فلسطین میں تحقیقاتِ حالات کے لیے ایک کمیشن بھیجنا منظور کیا ہے، مگر میں اعلان کر دینا چاہتا ہوں کہ مسلمانوں کو اس پر کوئی اعتماد نہیں"۔

برطانیہ جو کام اُس وقت کر رہا تھا، آج بھی وہی کر رہا ہے۔ گزشتہ دنوں ایک وڈیو بہت نشر ہوئی جس میں دکھایا گیا کہ ایک برطانوی فوجی جہاز اسلحے اور جنگی ساز و سامان کے ساتھ اسرائیل پہنچا ہے اور اسلحے سے لیس اس مال بردار برطانوی جہاز کی دم سے برطانوی وزیرِ اعظم رشی سوناک نکل کر آ رہا ہے۔ اندازہ کیجیے کہ اپنے مقصد کے حصول کے لیے اُن میں کتنی ہمت اور غیرت ہے۔ اس واقعے سے کچھ غیرت مسلمان حکمرانوں کو محسوس کرنی چاہیے کہ وہ انگلستان جس نے ایک صدی پہلے یہ ڈول ڈالا تھا، اعلانِ بال فور کے بعد سے آج تک اُس پورے مقصد کے ساتھ وہ وابستہ ہے۔ اور پھر عرب حکمرانوں نے جو رویہ اختیار کیا، علامہ اقبال نے اُس کا کئی جگہ ذکر کیا کہ:

یہی شیخِ حرم ہے جو چرا کر بیچ کھاتا ہے
گلیمِ بوذر و دَلقِ اویس و چادرِ زہرا

یعنی کس طریقے سے انگریزوں نے شریفِ مکہ کو ابھارا کہ تم عرب ہو اور ترک تم پر غالب ہیں۔ اس طریقے سے عربوں کے اندر ترکوں کے خلاف نفرت پیدا کی اور امت کو پارہ پارہ کیا۔ ہمارے ہاں جب بھی کوئی معاملہ ہوتا ہے یو این او اس میں آکر قراردادیں پیش کرتی ہے۔ لیگ آف نیشنز کے بارے میں علامہ اقبال نے جو گفتگو کی ہے، اُس کے بھی چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

تفریقِ ملل حکمتِ افرنگ کا مقصود
اسلام کا مقصود فقط ملتِ آدم
مکے نے دیا خاکِ جنیوا کو یہ پیغام
جمعیتِ اقوام کہ جمعیتِ آدم!

جنیوا مرکز رہا تھا لیگ آف نیشنز کا، بعد میں یو این او کو یہ مرتبہ ملا:

طہران ہو گر عالمِ مشرق کا جنیوا
شاید کرۂ ارض کی تقدیر بدل جائے

یہ ایک الگ بات ہے کہ طہران جنیوا ہو جاتا تو کیا ہوتا، یہ ایک دردناک قصہ ہے کہ ان حضرات کا کیا کردار رہا ہے اور اس امت پر جب بھی اغیار نے حملہ کیا ہے تو اُس کی پیٹھ پر خنجر کس نے گھونپا ہے؟ تو علامہ اقبال کو چونکہ طہران سے ایک زمانے میں توقعات تھیں۔ جیسے مصطفٰی کمال پاشا سے اُن کو توقعات تھیں ویسے ہی اُنھیں رضا شاہ پہلوی سے بھی توقعات تھیں۔ اور پھر دونوں ہی نے علامہ کو مایوس کیا اور اُنھوں نے وہ شعر کہا کہ:

نہ مصطفٰی نہ رضا شاہ میں نمود اس کی
کہ روحِ شرق بدن کی تلاش میں ہے ابھی

اور پھر فلسطینی عرب سے ایک جگہ اُنھوں نے خطاب کیا:

زمانہ اب بھی نہیں جس کے سوز سے فارغ
میں جانتا ہوں وہ آتش ترے وجود میں ہے
تری دوا نہ جنیوا میں ہے، نہ لندن میں
فرنگ کی رگِ جاں پنجۂ یہود میں ہے
سنا ہے میں نے، غلامی سے امتوں کی نجات
خودی کی پرورش و لذتِ نمود میں ہے

تو اصل چیز خودی کی پرورش ہے یعنی اپنے اندر غیرت پیدا کرنا۔ آج کل یہ گفتگو بہت سننے کو ملتی ہے کہ ہم مسلمانوں نے ٹیکنالوجی میں ترقی نہیں کی اور ہم سائنس میں بہت بہت پیچھے رہ گئے۔ اسی لیے ہم مار کھا رہے ہیں، اتنا ظلم ہو رہا ہے وغیرہ۔ حیرت ہوتی ہے کہ یہ بات کوئی کیسے کہہ سکتا ہے؟ اس وقت کتنے اسلامی ممالک ہیں، سب کے پاس مسلح تربیت یافتہ افواج ہیں، پاکستان ایک ایٹمی طاقت ہے اور سعودی عرب نے تنتیس ملکوں کی فوج تیار کی، یہ کس کے لیے تیار کی اور کیا طاقت کم ہے؟ جبکہ افغانستان میں مجاہدین کے پاس کون سی ٹیکنالوجی تھی، کیا وسائل تھے، لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنی نصرت کی کیسی کیسی نشانیاں دکھادیں۔ اس کے بعد بھی کوئی آدمی یہ کہتا ہے کہ ہمارا مسئلہ سائنس اور ٹیکنالوجی میں پیچھے ہونا ہے، یہ محض بے کار بات ہے، بلکہ ہمارا اصل مسئلہ بے غیرتی، بے حمیتی اور بے ایمانی ہے:

سب کچھ اور ہے، تو جس کو خود سمجھتا ہے
زوال بندۂ مومن کا بے زری سے نہیں

پھر علامہ نے ایک اور جگہ لیگ آف نیشنز کے بارے میں بہت سخت الفاظ کہے کہ:

بیچاری کئی روز سے دم توڑ رہی ہے
ڈر ہے خبرِ بد نہ مرے منھ سے نکل جائے
تقدیر تو مبرم نظر آتی ہے و لیکن
پیرانِ کلیسا کی دعا یہ ہے کہ ٹل جائے

ممکن ہے کہ یہ داشتۂ پیرکِ افرنگ
ابلیس کے تعویذ سے کچھ روز سنبھل جائے

لیگ آف نیشنز کے بارے میں کہہ رہے ہیں کہ یہ افرنگی بڈھے کی داشتہ ہے اور ایک اور جگہ اُنھوں نے کہا کہ:

برفتد تا روشِ رزمِ دریں بزمِ کہن
درد مندانِ جہاں طرحِ نو انداختہ اند
من ازیں بیش ندانم کہ کفن دُزدے چند
بہرِ تقسیمِ قبور انجمنے ساختہ اند

اس پرانی دنیا میں جنگ ختم ہو جائے اس کے لیے جہان کے کچھ دردمندوں نے ایک نئی طرح ڈالی ہے، ایک نئی انجمن کی بنیاد ڈالی ہے، اس کے متعلق میں تو بس اتنی بات جانتا ہوں کہ چند کفن فروشوں نے قبروں کی تقسیم کے لیے ایک انجمن بنائی ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے بارے میں ہمارا خیال ہے کہ یہ حرم کے درد کا درماں کریں گے، حالانکہ یہ کفن چور ہیں اور قبروں کی تقسیم کرنے والے ہیں، چاہے وہ یو این او ہو، او آئی سی ہو، عرب لیگ ہو، چاہے وہ کچھ بھی ہو۔ اقبال کی ایک اور نظم شام و فلسطین ہے، اس میں وہ کہتے ہیں:

رندانِ فرانسیس کا مے خانہ سلامت
پُر ہے مئے گل رنگ سے ہر شیشہ حلَب کا
ہے خاکِ فلسطین پہ یہودی کا اگر حق
ہسپانیہ پر حق نہیں کیوں اہلِ عرب کا

یعنی اگر یہود کو فلسطین پر دعویٰ ہے تو پھر اسپین پر اہلِ عرب کیوں نہیں دعویٰ کر دیتے کہ وہاں اُن کی حکومت رہی ہے۔ ایک اور مقام پر کہتے ہیں کہ انگریزی استعمار کا مقصد کچھ اور ہے، یعنی مقصد کالونائزیشن ہے:

مقصد ہے ملوکیتِ اِنگلیس کا کچھ اور
قصہ نہیں نارنج کا یا شہد و رُطب کا

اور اُنھوں نے قائدِ اعظم محمد علی جناح کو ایک خط لکھا، جس میں اُنھوں نے کہا: ”فلسطین کا مسئلہ مسلمانوں کے ذہنوں کو بہت پریشان کر رہا ہے۔ مجھے اس میں کوئی شک نہیں کہ (مسلم) لیگ اس مسئلے پر ایک ٹھوس قرارداد منظور کرے گی اور قائدین کی ایک نجی کانفرنس کا انعقاد کر کے کسی ایسے مثبت قدم کا فیصلہ کرے گی جس میں عوام بڑی تعداد میں شریک ہو سکیں گے۔ ذاتی طور پر مجھے کسی ایسے معاملے پر جیل جانے پر بھی کوئی اعتراض نہیں ہو گا جس سے اسلام اور ہندوستان دونوں متاثر ہوں“۔

بہرحال علامہ مرحوم کی نظر میں فلسطین کا مسئلہ محض سیاسی مسئلہ نہیں ہے بلکہ یہ دینی حمیت و غیرت کا مسئلہ ہے۔ اسی طرح مسئلۂ فلسطین ہو یا امت کے دیگر مسائل، ان کا حل تہذیبِ نو سے نجات اور اپنی تہذیب سے مضبوط وابستگی میں ہے۔

*****

مفتی اویس پاشا قرنیؔ

قضیۂ فلسطین

مدیرِ فقہ اکیڈمی حضرت مفتی اویس پاشا قرنی صاحب مدظلہ کی اصلاحی مجلس

اس وقت آپ جانتے ہیں کہ ارضِ فلسطین پر معرکۂ حق و باطل جاری ہے۔ اور حق و باطل کی اس کشمکش میں ہم مسلمان کس طرف ہیں، یہی وہ آزمائش اور امتحان ہے جس کے لیے اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے بندۂ مومن کو مکلف ٹھہرایا ہے۔ مسلمان مختلف زمانوں اور علاقوں میں حق کی بالادستی کے لیے جہاد و قتال کے عظیم الشان فریضے کو انجام دیتے رہے۔ اور روے ارضی پر ایک مقام ایسا ہے جس کو اس اعتبار سے نبیِ اکرم ﷺ نے خاص قرار دیا کہ وہاں پر مجاہدین، مقاتلین اور مرابطین موجود رہیں گے۔ زمانے کے بدلنے سے، لوگوں کا ساتھ دینے یا نہ دینے سے اور لوگوں کے کہنے یا نہ کہنے سے ان پر کوئی اثر نہیں پڑے گا اور وہ اپنے کام میں برابر لگے رہیں گے۔ ایک حدیثِ مبارکہ میں انھیں الطائفة المنصورة یعنی ”ایسا گروہ جس کو اللہ کی نصرت حاصل ہے“ کہا گیا۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے پوچھا کہ یہ لوگ جن کو اللہ تعالیٰ کی نصرت اور تائید حاصل ہے اور جنھیں بے یار و مددگار چھوڑ دینے سے ان کا نقصان نہیں ہوگا، ایسے لوگ کون ہیں اور کہاں ہیں؟ مسندِ ابی یعلیٰ کی روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: یہ بیت المقدس میں اور اس کے اردگرد پائے جاتے ہیں اور یہ حق پر قائم رہیں گے۔ ایک دوسری روایت میں آتا ہے کہ یہ جہاد پر قائم رہیں گے، یعنی جہاد چلتا رہے گا یہاں تک کے یہ دجال سے مقابلہ کریں گے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اس وقت تک اہلِ حق مجاہدین و مرابطین کے وہاں موجود ہونے کی بشارت فرمائی۔ اور اہلِ شام کا ساتھ دینے پر کئی روایات موجود ہیں۔ اور کئی مواقع پر قرآنِ حکیم اور احادیثِ مبارکہ نے بھی اس طرف اشارہ کیا ہے۔ آپ ﷺ کا مشہور فرمان ہے: «عَلَيْكُمْ بِالشَّامِ» (موارد الظمآن، حدیث: ۲۳۱۲) ”تمھیں چاہیے کہ شام کا ساتھ دو“۔ بعض صحابۂ کرام نے ان

روایات کے پیشِ نظر وہاں ہجرت بھی فرمائی اور وہاں جاکر آباد ہوئے۔ چنانچہ ارضِ شام نبی کریم ﷺ کے زمانے میں بھی اور بعد میں بھی ایمان کا ایک مرکز رہا۔ اور بہت سے انبیاے کرام علیہم السلام کی اولادیں بھی وہاں آباد رہیں، پھر صحابۂ کرام کی اولادیں آج تک وہاں آباد ہیں۔ اس پورے خطے کو نبیِ اکرم ﷺ کے زمانے میں ارضِ شام کہا جاتا تھا، اسے محشر بھی کہا جاتا ہے۔ ان معنیٰ میں کہ نبیِ اکرم ﷺ نے بیت المقدس میں انبیاے کرام علیہم السلام کی امامت فرمائی۔ چونکہ معراج کے واقعے میں آپ ﷺ نے رات کے ایک تھوڑے سے حصے میں کعبۃ اللہ سے بیت المقدس کا سفر فرمایا اور بیت المقدس میں آپ ﷺ نے انبیاے کرام علیہم السلام کی امامت فرمائی۔ اسی زمینی سفر جو مسجدِ حرام سے مسجدِ اقصیٰ کی طرف تھا اسے ''اِسراء'' کہتے ہیں۔ وہاں ایک پتھر ہے جس کے اوپر اب سنہرا گنبد بنایا گیا ہے، جسے قبۃ الصخرۃ کہتے ہیں، یہاں سے آپ ﷺ نے زمین سے آسمان کی طرف صعود فرمایا۔ لہٰذا اس علاقے کو نبیِ اکرم ﷺ اور تمام انبیاے کرام علیہم السلام کے جمع ہونے کی وجہ سے بھی فضیلت حاصل ہے اور آپ ﷺ سے پہلے بھی یہ علاقہ انبیا علیہم السلام کا مسکن رہا ہے اس لیے اس اعتبار سے بھی بابرکت رہا ہے۔

موجودہ فلسطین جو آج مقبوضہ فلسطین ہے وہ بھی اسی شام کا ایک حصہ ہے۔ جدید تعبیر میں سیریا کا جو مرکز ہے یعنی دمشق، اس کو شام سے تعبیر کرتے ہیں، مگر احادیثِ مبارکہ میں جسے ارضِ شام کہا گیا ہے وہ کافی وسیع ہے۔ اس میں سیریا، لبنان، اردن، فلسطین اور مصر کا وہ حصہ جو صحراے سینا کی طرف ہے وہ بھی، اسی طرح ترکیہ کے وہ علاقے جو شام کی سرحد کے ساتھ لگتے ہیں، وہ بھی اس ارضِ شام کا حصہ ہیں۔ اس ساری سر زمین کو قرآنِ حکیم ارضِ مقدس کہتا ہے۔ انبیاے کرام علیہم السلام نے بھی اس کے ساتھ اپنی محبت کا اظہار کیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی وفات کے موقعے پر اس خواہش کا اظہار کیا کہ یا اللہ! مجھے وہاں موت عطا فرمائیں جو جگہ بیت المقدس سے قریب ہو۔ مسلم شریف کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جب معراج کے واقعے کو بیان فرمایا، تو فرمایا کہ میں تمھیں وہ جگہ دکھا سکتا ہوں، (یعنی وہ جگہ جہاں موسیٰ علیہ السلام اپنی قبر میں نماز ادا کر رہے ہیں)۔ جب آپ ﷺ معراج پر تشریف لے گئے تو آپ کو یہ مشاہدہ کروایا گیا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قبر میں نماز ادا کر رہے ہیں۔ انبیاے کرام علیہم السلام اپنی قبور میں زندہ ہوتے ہیں اور ان کی ایک خاص طرح کی

حیات قبر میں بھی جاری رہتی ہے۔ اور یہاں نوعِ انسانی کا ایک عظیم واقعہ ہے کہ سارے انبیاے کرام علیہم السلام ایک جگہ جمع ہیں اور ان کے سردار محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم ان کی امامت فرمارہے ہیں۔ اگر یہ واقعہ اس سے پہلے کہیں اور پیش آیا تھا تو وہ عالمِ ارواح تھا کہ وہاں سب جمع تھے۔ تو اس اعتبار سے یہ علاقہ بہت ہی غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔ اور یہ تمہید اس لیے باندھی ہے تاکہ یہ جو تصور ہمارے ہاں عام ہو گیا ہے اور کہا جاتا ہے کہ فلسطین کا مسئلہ یہ تو علاقائی مسئلہ ہے، سیاسی مسئلہ ہے، عربوں کا مسئلہ ہے، اس غلط فہمی کا ازالہ ہونا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ یہ علاقہ بابرکت ہے اور اس میں ہمارے لیے یہ حکم ہے کہ اس برکت کو اپنے لیے محفوظ رکھیں۔ اس برکت والی جگہ کو امتِ مسلمہ کی میراث جانتے ہوئے اس کی حفاظت کریں اور یہاں کے لوگوں کو یہ جو فضیلت حاصل ہے کہ وہ حق پر قائم رہیں گے، تو ہمیں اپنے آپ کو ان اہلِ حق سے وابستہ رکھنا چاہیے۔ اگرچہ علاقائی اعتبار سے ہم وہاں سے دور ہیں مگر ان شاء اللہ ہمارے دل اس برکت سے جڑے ہوئے ہیں۔ برکت کے منتقل ہونے کے لیے زمینی اتصال ضروری نہیں ہے، وہ برکت ان شاء اللہ اس مسئلے سے متعلق ہونے کی وجہ سے ہمیں حاصل ہوگی۔ اگر ہم اہلِ برکت اور اہلِ حق کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں اور ہمارے دل ان سے مربوط ہیں، تو وہ برکتیں ہمارے دلوں، ہمارے اعمال میں اور ہمارے اردگرد ظاہر ہوں گی۔ بعض لوگوں کی طرف سے یہ کہا جاتا ہے کہ ہم کیا کر سکتے ہیں، ہم تو کمزور اور مجبور ہیں کچھ نہیں کر سکتے۔ ایسے لوگوں کو یہ حدیث سامنے رکھنی چاہیے کہ: «مَنْ رَأَى مِنْكُمْ مُنْكَرًا فَلْيُغَيِّرْهُ بِيَدِهِ فَإِنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهِ، فَإِنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهِ، وَذَلِكَ أَضْعَفُ الْإِيمَانِ». (مسندِ احمد، حدیث: ۱۱۴۶۰) ”جو تم میں سے برائی دیکھے تو اسے اپنے ہاتھ سے روک دے۔ پھر اگر اس کی طاقت نہیں رکھتا تو اپنی زبان سے اس کی شناعت بیان کرے۔ اگر اس کی بھی طاقت نہیں رکھتا تو کم از کم اسے اپنے دل میں برا سمجھے اور یہ سب سے کمزور ایمان ہے“۔ علما نے اس حدیث کو بیان کر کے یہ بھی بتایا کہ اس میں سے پہلے درجے کی نہی عن المنکر کے لیے بعض شرائط اور بعض اہلیتیں درکار ہیں۔ مثال کے طور پر جو پہلا درجہ ہے برائی کو ہاتھ سے بدل دینے کا، یہ اس کے لیے ہے جس کے پاس قوت ہو۔ اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ برائی کو ہٹا کر اس کی جگہ اچھائی لائی

جا سکتی ہو، اگر اچھائی لانے کی طاقت نہ ہو تو پھر درست نہیں ہے۔ یہ طاقت عام طور پر حکمرانوں کے پاس ہوا کرتی ہے۔ اس لیے آپ اکثر شروحاتِ حدیث میں لکھا ہوا دیکھیں گے کہ جو تغییرِ منکر بالید ہے، یہ حکمرانوں کا کام ہے۔ البتہ حکمرانوں کو اپنی ذمے داری کی ادائی پر ابھارنے کے لیے کچھ طریقے ہو سکتے ہیں، پہلے زمانے میں دربار کے مقربین، مصاحبین بادشاہوں کی رائے پر اثر انداز ہوتے تھے۔ جبکہ آج کل مقتدر طبقات پر اثر انداز ہونے کے طریقے اور انداز بدل گئے ہیں۔ چونکہ آج کل حکومتیں عوامی رائے پر چلتی ہیں، اس لیے احتجاج کے راستے سے رائے عامہ کو ہموار کر کے حکومتی پالیسیوں پر اثر انداز ہوا جا سکتا ہے۔ بہر حال، تغییر بالید مطلقاً حاکم کی ذمے داری ہے۔ اس کے بعد کا جو درجہ ہے وہ نہی عنِ المنکر باللسان ہے۔ اس کے بارے اکثر شروحاتِ حدیث میں لکھا ہے کہ یہ علما کے کرنے کا کام ہے، کیونکہ جسے معلوم ہو گا منکر کیا ہے، وہی اسے روک سکتا ہے۔ جسے یہ فرق معلوم ہی نہ ہو کہ منکر اور معروف یا صحیح اور غلط کیا ہے تو وہ کسی معروف کو منکر اور منکر کو معروف بنا دے گا اور اپنے خیال میں کوئی نیک کام کر رہا ہو گا، لیکن وہ غلطی ہو گی۔ یہ اکثر جاہلوں کا طریقہ ہے اس لیے کہا جاتا ہے کہ نہی عنِ المنکر اصلاً علما کے کرنے کا کام ہے۔ بہر حال، اس حدیث کی روشنی میں ہم میں سے جس پر جتنی ذمے داری عائد ہوتی ہے، موجودہ صورتِ حال میں فلسطینی مظلوموں کے ساتھ ہمیں وہ ذمے داری ادا کرنی چاہیے۔

ایسے موقعے پر جب مسلمان دشمن کے مقابلے کے لیے میدان میں ہوں، یہ نصیحت کرنا کہ ایسا کرنا چاہیے تھا ویسا کرنا چاہیے تھا، یہ مثبت رویہ نہیں ہے۔ یہ باتیں میدان میں اترنے سے پہلے یا بعد میں کی جا سکتی ہیں، عین لڑائی کے وقت اس طرح کی باتیں دشمن کو تقویت پہنچانے کا ذریعہ بنتی ہیں، اس لیے اس طرزِ عمل سے گریز کرنا چاہیے۔ لہٰذا حماس کی موجودہ کارروائی کے موقعے پر یہ کہنا کہ حماس کا یہ اقدام درست تھا یا غلط اور اس کو کیا کرنا چاہیے تھا، یہ سب ادھر ادھر کی باتیں ہیں۔ آج بدقسمتی سے مسلمانوں کے معاشرے میں طرح طرح کی باتیں ہو رہی ہیں، ہر وہ شخص جو قرآن و حدیث سے واقفیت رکھتا ہے، اسے معلوم ہے کہ آج جو باتیں مسئلۂ فلسطین اور جہاد و قتال کے بارے میں کہی جاتی ہیں وہ دو طرح کی ہیں۔ بعض باتیں وہ ہیں جو صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے میدانِ جنگ اور جہاد میں کہیں اور قرآن حکیم نے انھیں نقل کیا اور یہی اہلِ حق کی باتیں ہیں۔

اور دوسری طرف ہمارے معاشرے میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو بعینہ وہی جملے ادا کر رہے ہیں جو حضور ﷺ کے زمانے میں رئیس المنافقین عبد اللہ بن ابی اور اس کے ساتھی میدانِ قتال میں جہاد اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں کیا کرتے تھے۔ لہذا ہمیں چاہیے کہ ہم اپنے خاندان، اپنے دائرۂ اثر اور معاشرے میں اس معرکۂ خیر و شر، حق و باطل میں اہلِ ایمان اور اہلِ حق کی باتوں کی ترویج کا ذریعہ بن جائیں۔ اور اس کے بر خلاف جو باتیں بد اخلاقی، بے غیرتی، حبِ دنیا، نفاق اور بزدلی پر مبنی ہیں، ان کے خلاف آواز اٹھانے اور خود کو اور اپنے معاشرے کو اس طرح کی باتوں سے دور رکھنے والے بن جائیں۔ اگر اتنی سختی ہو جائے کہ بولنے پر بھی پابندی ہو تو کم از کم دل میں ان برائیوں کو برا جاننا اور اہلِ حق کے لیے دل میں محبت رکھنا ضروری ہے۔ لہذا ہمیں چاہیے کہ ہم اس نقطۂ نظر سے قرآن و حدیث کا مطالعہ کریں اور ایسے حالات میں کم از کم صحیح نقطۂ نظر پر کھڑے ہو جائیں۔ اور یہ درست نقطۂ نظر ہمارے اکابر علما کی تعلیمات سے ملے گا، مثلاً، شیخ الاسلام حضرت مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم العالیہ نے پچھلے دو جمعوں میں جو خطبات ارشاد فرمائے ہیں ان سے قضیۂ فلسطین واضح ہو جاتا ہے۔[1] حضرت نے اتنی سہل اور آسان گفتگو فرمائی ہے کہ کوئی بھی شخص جس کے دل میں ایمان کی رمق ہے وہ خوب سمجھ جائے گا۔ پھر اس نقطۂ نظر کے مطابق اپنا اور اردگرد کے لوگوں کا نقطۂ نظر بنانا یہ اس وقت وہ کام ہے جو میں اور آپ کر سکتے ہیں، یہ ہمارے بس میں ہے، اس پر تو کوئی پابندی اور قدغن نہیں ہے۔ اسی طرح دعاؤں کا اہتمام ہم کر سکتے ہیں، یہ ہمارے بس میں ہے۔ یہاں بھی ایک غلط فہمی ہے جس کا ازالہ ہونا چاہیے، وہ یہ کہ بعض کہتے ہیں کہ کب تک ہم دعائیں کرتے رہیں گے۔ ہم نے دعائیں مانگیں کب ہیں؟ حقیقت تو یہ ہے کہ جیسی دعا مطلوب ہے اگر ویسی ہو جائے تو حالات بدل جائیں۔ یہ ہم اپنی طرف سے نہیں کہہ رہے بلکہ قرآنِ حکیم یہی بتلا رہا ہے کہ جب دشمن تم پر چڑھ دوڑے تب پہلے جو کام کرنے کا ہوتا ہے وہ دعا ہے۔ در اصل یہ مادیت کے اثرات ہیں کہ ہم دعا کی اہمیت سے بھی بے خبر ہو گئے۔ رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا کہ یا رسول اللہ جب دشمن کا خوف ہو تو کیا کریں؟

---

[1] حضرت شیخ الاسلام صاحب دامت برکاتہم کے دونوں خطبے اس شمارے میں شامل کیے گئے ہیں۔

آپ ﷺ نے فرمایا: «أَلَا أَدُلُّكُمْ عَلَى مَا يُنْجِيكُمْ مِنْ عَدُوِّكُمْ وَيَدِرُّ لَكُمْ أَرْزَاقَكُمْ؟». ”کیا میں تمھیں ایسی چیز نہ بتاؤں کہ جو تمھیں تمھارے دشمن سے نجات دے اور تمھارے رزق میں اضافے کا سبب بنے؟“۔ پھر آگے فرمایا: «تَدْعُونَ اللهَ فِي لَيْلِكُمْ وَنَهَارِكُمْ، فَإِنَّ الدُّعَاءَ سِلَاحُ الْمُؤْمِنِ». (مسندِ ابی یعلیٰ، حدیث: ۱۸۱۲) ”دن رات اللہ تعالیٰ سے دعا مانگیں، بے شک دعا مومن کا ہتھیار ہے“۔ ہم میں سے کتنے ایسے ہیں جو اپنے فلسطینی بھائیوں کے لیے رات کو اٹھ کر دعائیں کرتے ہیں۔ ہماری اس وقت کوئی نماز ایسی نہ جائے جس کے بعد ہم دل سے یہ دعا نہ مانگیں کہ: اَللّٰهُمَّ إِنَّا نَجْعَلُكَ فِيْ نُحُوْرِهِمْ وَنَعُوْذُ بِکَ مِنْ شُرُوْرِهِمْ. اسی طرح: حَسْبِيَ اللهُ لا إِلٰهَ إِلّا هُوَ، لاَ حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلّا بِالله. یہ ان لوگوں کے لیے دعا ہے جو امت کی طرف سے فریضۂ جہاد ادا کر رہے ہیں اور مسجدِ اقصیٰ کی حفاظت پر اپنی جانیں نچھاور کر رہے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ مالی طور پر ان کی کمر مضبوط کرنا یہ بھی ہماری ذمے داریوں میں سے ہے۔ فلسطین اور بالخصوص مسجدِ اقصیٰ سے ہمارا ایمانی رشتہ تو ہے ہی، لیکن اس کے ساتھ ساتھ قومی رشتہ بھی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشادِ مبارک ہے کہ ایک وقت آئے گا کہ کسی شخص کے پاس اگر بیت المقدس کے قریب ایک کوڑے بھر جگہ یعنی ایک میٹر جگہ بھی ہو، جس سے وہ دیکھ سکے یہ اس کے لیے دنیا و مافیہا سے بہتر ہو گا۔ آج آپ دیکھ سکتے ہیں کہ وہاں ایک میٹر جگہ کی جو قیمت یہودیوں کی طرف سے ملتی ہے وہ بہت ہی زیادہ ہے، لیکن اس کے باوجود وہ نہیں دیتے۔ جان دینے کے لیے تو تیار ہیں لیکن جگہ چھوڑنے کے لیے تیار نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم یہاں موجود رہیں گے اور اس کی حفاظت پر قائم رہیں گے۔

مسندِ احمد کی روایت ہے جب آپ ﷺ نے مسجدِ اقصیٰ میں نماز پڑھنے کی فضیلت بیان فرمائی تو حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا نے سوال کیا کہ کوئی وہاں نہیں جا سکتا ہو تو وہ اس فضیلت کو کیسے حاصل کرے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ وہاں چراغ کے لیے تیل ہی بھیج دے جس سے چراغ جلتا رہے۔ تو آج یہ امداد کی ایک صورت ہے، امداد وہاں پہنچ سکتی ہے۔ اور یہ امداد کا کام الحمدللہ پاکستان پہلے بھی کرتا رہا ہے اور آئندہ جب بھی ضرورت پڑے گی ان شاء اللہ کرتا رہے گا۔ ۱۹۳۸ء میں بھی جب قردادِ پاکستان پیش ہوئی تھی اس

وقت فلسطین کے لیے بھی ایک قراداد منظور ہوئی تھی اور قائدِاعظم نے ایک فنڈ فلسطین کے لیے مقرر کیا تھا۔علامہ اقبال نے اس موقعے پر قائدِاعظم کو ایک خط لکھا تھا کہ صرف ایک قراداد منظور نہ کی جائے بلکہ اس سے آگے بڑھ کر کچھ کام کیا جائے جس سے مسلمانانِ فلسطین کو فائدہ ہو۔علامہ اقبال جس طرح پاکستان کے مصور اور مبشر ہیں اسی طرح وہ آزاد فلسطین کے بھی مبشر ہیں۔علامہ نے ایک جملہ کہا تھا: یہ میرے عقیدے کا حصہ ہے کہ ایک دن آئے گا جب یہودیوں کے ناپاک وجود سے سرزمینِ فلسطین پاک ہوکر رہے گی۔ قائدِ اعظم کے بارے میں ان کی بہن فاطمہ جناح نے لکھا ہے کہ جب ان کے انتقال کا وقت قریب تھا تو ان کی زبان پر تین باتیں تھیں جو بار بار آتی رہیں: ایک مہاجرین کا مسئلہ، دوسرا کشمیر کے مسلمانوں کا مسئلہ اور تیسرا فلسطین کے مسلمانوں کا مسئلہ۔ یعنی مسئلۂ فلسطین ایمانی مسئلے کے ساتھ ساتھ ہمارا قومی مسئلہ بھی ہے۔ عرب اسرائیل جنگ کے موقعے پر پاک فضائیہ نے عرب افواج کا خوب ساتھ دیا اور پاکستان کے نظریاتی بنیاد پر قائم ہونے کے تقاضوں کو پورا کیا۔ضرورت اس بات کی ہے کہ اس جذبے کو ہم اپنے اندر زندہ رکھیں اور اپنی اولاد میں بھی اس کو منتقل کریں کہ مسلمان کہیں بھی ہیں وہ ہمارے بھائی ہیں اور مسلمان ایک جسم کی طرح ہیں، اگر جسم کے کسی ایک عضو میں تکلیف ہوتی ہے تو اسے پورا جسم محسوس کرتا ہے۔ ہمیں اہلِ ایمان کے ساتھ اپنے ایمان اور ایمانی تعلق کو اتنا مستحکم کرنا ہے کہ ان کا مسئلہ دعا میں ہمیں اس طرح یاد آئے جس طرح دعا کرتے وقت ہمیں اپنے مسائل یاد آتے ہیں۔

*****

صوفی جمیل الرحمٰن عباسی
ناظمِ شعبۂ تحقیق و تصنیف، فقہ اکیڈمی

سید الطائفہ سے طائفۂ منصورہ تک

بیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں میں جب برطانیہ روس، فرانس، اٹلی، جاپان جیسی بڑی طاقتوں کا اتحاد محوری طاقتوں کو شکستِ فاش سے دوچار کر کے جرمنی اور ترکی جیسی بڑی حکومتوں سے من مانی شرطیں نہ صرف منوا رہا تھا بلکہ اپنی پسند کے ادارے (انجمنِ اقوامِ عالم) بنا کر اپنی شرائط کو قانونی حیثیت بھی دے رہا تھا۔ قوموں اور ملکوں کی تقدیر کے فیصلے کیے جا رہے تھے۔ سلطنتِ عثمانیہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو چکی تھی۔ اہلِ عرب، انگریزوں کے حلیف اور ترکوں کے رقیب بن کر خلافت کے باغی بن چکے تھے۔ ان حالات میں کہ بڑی بڑی فوجیں اور بڑے بڑے جرنیل انگریز کے سامنے پست حوصلہ ہو کر ہتھیار ڈال چکے تھے شام کے علاقے جَبلہ کی ایک مسجد کا امام اور مدرسے کا استاد، بلند حوصلگی سے ہتھیار اٹھانے کی تیاری کر رہا تھا۔ محمد عزالدین القسّام، عراق سے جبلہ منتقل ہونے والے، قادری سلسلے کے ایک خانوادے کے چشم و چراغ اور جامعۃ الازہر کے فارغ التحصیل تھے۔ لیبیا پر اطالوی قبضے (۱۹۱۱ء) کے خلاف آپ نے شام میں رہ کر آواز اٹھائی اور مجاہدین کے لیے امداد ارسال کرنے کا اہتمام کیا۔ جنگِ عظیم اول کے دوران جب عرب خلافتِ عثمانیہ سے برسرِپیکار و بغاوت تھے، آپ ادارۂ خلافت کے وفادار بن کر طاغوت کے خلاف کھڑے تھے، آپ کا نعرہ تھا:

یا عرب و یا إسلام قوموا کلکم علی الطغیان
یا رحیم و یا رحمن انصر مولانا السلطان

”اے اہلِ عرب! اے اہلِ اسلام! سب مل کر حملہ آور طاقتوں کے خلاف کھڑے ہو جاؤ۔ اے خدائے رحیم و رحمٰن، ہمارے آقا سلطانِ عثمانی کی مدد فرما“۔

عربوں نے آپ کی آواز پر کان نہ دھرے بلکہ غدارِ ملت، نام کے شریفِ مکہ وہاشمی، حسین بن علی کی راہ چلے۔ ۱۹۱۸ء میں جب فرانس نے شام پر قبضہ کر لیا تو عزالدین قسام نے وہاں عمر البیطار کے تعاون سے فرانسیسیوں کے خلاف جہادی تحریک کھڑی کر دی۔ یہاں تک کہ جنگِ میلسون (۱۹۲۰ء) میں یوسف العظمہ کے ساتھ مل کر دادِ شجاعت دی۔ یوسف کی شہادت اور لشکر کی شکست کے بعد آپ فلسطین منتقل ہو گئے جہاں انگریز کا قبضہ مکمل ہو چکا تھا۔ آپ جنگ تو ضرور ہارے تھے لیکن حوصلہ نہیں، اس لیے کہ یہ راہ ہی وہ ہے کہ جس میں ''ہارے بھی تو بازی مات نہیں'' تو آپ بغیر کسی پچھتاوے کے راہِ وفا پہ گامزن رہے:

راہِ وفا میں ہر سو کانٹے دھوپ زیادہ سائے کم
لیکن اس پر چلنے والے خوش ہی رہے پچھتائے کم

''شکست خوردگی کے بعد حوصلہ نہیں ہوا'' ایک عام خیال ہے جس کی تغلیط کرتے ہوئے آپ نے فلسطین میں جہادی تحریک کی بنیاد ڈالی۔ اگر آپ بھی شکست تسلیم کر لیتے اور جہاد کے لیے کھڑے نہ ہوتے تو شاید مدتِ مدید کوئی جہاد کا نام نہ لیتا لیکن آپ نے وقتی پسپائی کو شکست تسلیم نہ کیا:

اوجھل سہی نگاہ سے ڈوبا نہیں ہوں میں
اے رات ہوشیار کہ ہارا نہیں ہوں میں

اگرچہ آپ فلسطینی جہاد کی ابتدا ہی میں شہید ہو گئے لیکن امت میں جہاد فی سبیل اللہ کا احیا کر گئے:

بِنا کردند خوش رسمے، بخون و خاک غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

''انھوں نے خون اور مٹی میں لتھڑ کر ایک خوب صورت رسم وطریقے کی بنیاد ڈال دی، خدا رحمت کرے ایسے نیک فطرت عاشقانِ الٰہی پر''۔

عزالدین قسام خوش فہم نہیں بلکہ حقیقت شناس انسان تھے اور اپنے کام کی نوعیت سے باخبر تھے، چنانچہ آپ فرمایا کرتے تھے: ''اہم بات یہ نہیں کہ ہمیں فتح ہوتی ہے یا نہیں بلکہ سب سے اہم بات یہ ہے کہ ہم اپنی امت اور آنے والی نسلوں تک جہاد کا پیغام پہنچانا چاہتے ہیں''۔ محمد حسن شُرّاب نے شہید کے اس قول

کے تحت لکھا ہے یعنی وہ جہاد فی سبیل اللہ کی ایک زندہ مثال قائم کرنا چاہتے تھے تاکہ لوگ یہ نہ گمان کریں کہ دورِ صحابہ و دورِ تابعین کے ختم ہونے سے جہاد بھی ختم ہو گیا تھا اور بعد کے مسلمان اس مشکل کام کو جاری نہ رکھ سکے۔[1] فتح یا شکست ان کے ہاں موضوعِ بحث ہی نہ تھی کہ انھیں تو جہاد کو زندہ رکھنا تھا اور اگلی نسل تک اس کا ذوق و شوق منتقل کرنا تھا، اسی لیے آپ کا نعرہ تھا: هذا جِهَادٌ نَصْرٌ أو اِسْتِشْهادٌ یہ جہاد جاری ہے یا تو مدد آجائے اور فتح نصیب ہو جائے یا شہادت نصیب ہو جائے۔ تو آپ اس جہاد فی سبیل اللہ کے ''سلسلۃ الحدید'' کی ایک کڑی تھے جسے رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کی بعثت سے شروع ہو کر قیامت تک جاری رہنا تھا۔ اس تصور کو سامنے رکھیں تو کون ہے جو شیخ شہید کی کامیابی کا اعتراف نہ کرے کہ جهاد نصر أو استشهاد کا نعرہ آج فلسطین کے بچے بچے کی زبان پر ہے۔ سید الطائفہ عز الدین القسام اور ان کے نقشِ قدم پہ چلنے والے طائفۂ منصورہ کے کام کی اہمیت اس وقت تک واضح نہیں ہو سکتی جب تک تسلسلِ جہاد کی روایات نہ پڑھ لی جائیں: «اَلْجِهَادُ مَاضٍ مُنْذُ بَعَثَنِي اللهُ إِلَى أَنْ يُقَاتِلَ آخِرُ أُمَّتِي الدَّجَّالَ». (سنن ابی داؤد) ''جہاد میری بعثت سے جاری ہے اور رہے گا یہاں تک کہ میری امت کا آخری حصہ دجال سے جنگ کرے گا''۔ ایک حدیث میں فرمایا گیا ہے: «لَا تَزَالُ طَائِفَةٌ مِنْ أُمَّتِي يُقَاتِلُونَ عَلَى الْحَقِّ ظَاهِرِينَ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ». (مسلم) ''میری امت کا ایک گروہ ہو گا جو حق پر گامزن رہ کر قیامت تک جہاد کرتا رہے گا''۔ الجامع الصحيح للسنن والمسانيد کے مولف نے بخاری، مسلم، ترمذی، ابوداؤد، ابنِ ماجہ اور مسندِ احمد کے مختلف طرق جمع کیے ہیں جس میں اس گروہ کی مختلف صفات کا بیان ہے: «قَاهِرِينَ لِعَدُوِّهِمْ مَنْصُورِينَ لَا يَضُرُّهُمْ مَنْ خَذَلَهُمْ أَوْ خَالَفَهُمْ (إِلَّا مَا أَصَابَهُمْ)، لَا يُبَالُونَ مَنْ خَذَلَهُمْ، وَلَا مَنْ نَصَرَهُمْ، حَتَّى يَأْتِيَ أَمْرُ اللهِ تَبَارَكَ وَتَعَالَى، وَيَنْزِلَ عِيسَى بْنُ مَرْيَمَ – عليه السلام – وَهُمْ ظَاهِرُونَ عَلَى النَّاسِ حَتَّى يُقَاتِلَ آخِرُهُمُ الْمَسِيحَ الدَّجَّالَ وَهُمْ أَهْلُ الشَّامِ (بِبَيْتِ الْمَقْدِسِ وَأَكْنَافِ بَيْتِ الْمَقْدِسِ)» ''وہ

---

[1] عز الدين القسام شيخ المجاهدين في فلسطين، محمد محمد حسن شراب، دار القلم، دمشق، ۲۰۰۰ء، ص: ۱۰۴

اپنے دشمنوں پر غالب ہوں گے، اللہ کی طرف سے ان کی مدد کی جائے گی اور انھیں نقصان نہ دے سکے گا (اپنوں میں سے) کوئی بے وفائی کرنے والا اور (غیروں میں سے) کوئی مخالفت کرنے والا، سوائے اس کے کہ جو ان پر آزمائشیں آئیں۔ وہ اسی حال پر رہیں گے یہاں تک کہ اللہ کا حکم آجائے گا اور عیسیٰ ابنِ مریم علیہ السلام نزول فرمائیں گے اور وہ لوگوں پر غالب رہیں گے یہاں تک کہ ان کا آخری گروہ مسیحِ دجال سے جہاد کرے گا اور وہ اہلِ شام ہوں گے اور وہ بیت المقدس اور اس کے اطراف میں لڑیں گے"۔

آج کل یہ اشکال پیش آتا ہے کہ مجاہدین کو فتح نہیں ہو رہی بلکہ وہ شکست پر شکست کھائے جا رہے ہیں تو اس کا جواب بھی مندرجہ بالا الفاظ میں موجود ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ جب مجاہدین کی جماعت کو اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے "منصور" اور "قاہرون" اور "ظاہرین" قرار دیا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم انھیں شکست خوردہ قرار دیں بلکہ چاہیے کہ ہم اپنے معیارِ فتح پر نظرِ ثانی کریں۔

اس ضمن میں دو اعتبار سے غور کرنے کی ضرورت ہے: فتح و شکست کا اعتبار درمیانی معرکوں پر نہیں ہوتا بلکہ حتمی نتائج پر ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر روس اور امریکا دونوں کو افغانستان میں شکست کا سامنا کرنا پڑا جبکہ افغانیوں کو فتح نصیب ہوئی ہے لیکن درمیانی مراحل میں اگرچہ برطانیہ و امریکا نے کتنے معرکے سر کیے تھے اور افغانیوں کو بہت سارے نقصانات اٹھانے پڑے تھے لیکن آخری نتیجے کے اعتبار سے فتح افغانیوں اور شکست فرنگیوں کا مقدر بنی۔ اسی طرح جنگ میں ویت نامیوں کو امریکا کے ہاتھوں نقصان تو بہت اٹھانا پڑا لیکن آخر کار فتح انھی کی ہوئی اور امریکیوں کو ہیلی کاپٹروں پر بھاگنا پڑا۔ اسی طرح آخری فتح فلسطینیوں ہی کی ہوگی۔ جہاں تک بات ہے یہودی مظالم اور عربوں کی مظلومیت کی تو یہ ایک آزمائش ہے جس کا فتح و شکست سے تعلق نہیں، اسی لیے حدیثِ بالا میں اللہ کی مدد و نصرت اور اہلِ حق کے غلبے کے بعد یہ الفاظ آئے ہیں: «إِلَّا مَا أَصَابَهُمْ» "سوائے اس کے کہ جو مصائب ان پر آئیں"۔ ہم دینی طور پر جانتے ہیں کہ مصائب لازمۂ حیات اور ذریعۂ نجات ہیں اور تاریخی طور پر بھی یہی ثابت ہے۔

طائفۂ منصورہ کے ناقابلِ شکست ہونے کو اس تقابل سے سمجھیں کہ مصر اور اردن دونوں امن میں ہیں جبکہ فلسطینی مار کھا رہے ہیں تو کیا اردن و مصر شکست خوردہ ہیں یا فلسطینی، جواب آسان ہے، جو لڑنے میں جُتا

ہوا ہے آخر وہی جیتا ہوا ہے اس لیے کہ کبھی نہ کبھی اس کی فتح کے امکان ہیں، چاہے بیس سال بعد سہی۔ لیکن جس نے امن قائم کرکے آسان تعلقات اختیار کر لیے اس کے ہارنے میں کوئی شبہہ نہیں۔ سود و زیاں کی مزید بات کریں تو اسرائیل کی یہ شکست کیا تھوڑی ہے کہ مجاہدین کی طرف سے اس کے تباہ شدہ ٹینک اور مردار فوجی دکھائی دیے جا رہے ہیں جبکہ فلسطینی تباہی کا ثبوت تباہ شدہ اسپتال اور عام شہریوں کی لاشیں، کچھ بھی شرم ہو تو کیا یہ کافی نہیں کہ جن اسرائیلی سویلین کے مارے جانے کا ڈرامہ رچایا گیا تھا تحقیق سے پتا چلا وہ تو ان کے اپنے ہیلی کاپٹروں کی فائرنگ سے مرے تھے۔ اسرائیل اور اس کے عرب دوستوں کے لیے یہ تھوڑا ماتم ہے کہ پیار کی پینگیں پوری بڑھی بھی نہیں تھیں کہ فلسطینیوں نے وہ رسی ہی کاٹ ڈالی اور مجبوراً تعلقات کا انقطاع کرنا پڑا۔ یہ کیا کم ہے کہ مجاہدین عربوں کو تگنی کا ناچ نچانے والی موساد کی آنکھوں میں دھول جھونکنے میں کامیاب رہے اور اسرائیل کے مصنوعی ذہانتوں کے تشکیل کردہ دفاعی نظام کو درہم برہم کر کے رکھ دیا۔ اسرائیل کے فوجی و معاشی نقصان کے علاوہ ان کا جانی نقصان بھی کم نہیں ہوا اور یہ کہ بہت عرصے سے فلسطینی یک طرفہ کارروائیوں میں مارے جاتے تھے، اب بھی مرے ہیں لیکن مار کر۔ اور سب سے بڑا جو فرق ہے وہ یہ کہ ان کے مردار جہنمی ہیں اور ہمارے مرحومین شہید اور جنتی!

بہر حال حتمی فتح فلسطینیوں ہی کی ہوگی چنانچہ احادیث میں اس کی بشارتیں موجود ہیں: «تُقَاتِلُكُمُ اليَهُودُ فَتُسَلَّطُونَ عَلَيْهِمْ، ثُمَّ يَقُولُ الحَجَرُ يَا مُسْلِمُ هَذَا يَهُودِيٌّ وَرَائِي، فَاقْتُلْهُ». (مسلم)
”یہود تمھارے خلاف لڑائی کریں گے اور تمھیں ان پر غلبہ دے دیا جائے گا پھر (تم انھیں قتل کرو گے) یہاں تک کہ ایک ایک پتھر کہے گا کہ اے مسلمان یہ یہودی میرے پیچھے چھپا ہے آؤ اسے قتل کرو“۔

ایک لطیف اشارہ اس روایت میں یہ ہے کہ چڑھائی کرنے والے یہودی ہوں گے مطلب یہ کہ مسلمان بیت المقدس میں موجود ہوں گے اور یہود باہر سے حملہ آور ہوں گے یعنی یہود کے موجودہ مظالم بیت المقدس سے مسلمانوں کو بے دخل کرنے میں ناکام ہوں گے۔ ایک حدیث میں ذرا وضاحت ملتی ہے، آپ ﷺ اہلِ عرب کے بارے میں فرماتے ہیں: «جُلُّهُمْ بِبَيْتِ الْمَقْدِسِ وَإِمَامُهُمْ رَجُلٌ صَالِحٌ».

(ابنِ ماجہ) ”ان کا ایک بڑا حصہ بیت المقدس میں ہوگا اور ان کا امام ایک نیک شخص ہوگا“۔ اسی روایت میں آتا ہے: «قَالَ عِيسَى عَلَيْهِ السَّلَامُ: اِفْتَحُوا الْبَابَ، فَيُفْتَحُ، وَوَرَاءَهُ الدَّجَّالُ مَعَهُ سَبْعُونَ أَلْفَ يَهُودِيٍّ، كُلُّهُمْ ذُو سَيْفٍ مُحَلًّى وَسَاجٍ». ”عیسیٰ علیہ السلام کہیں گے کہ دروازہ کھول دو پس دروازہ کھولا جائے گا۔ اس کے پیچھے ستر ہزار یہودی ہوں گے جو سبز چادریں اوڑھے اور مزین تلواریں سونتے ہوں گے“۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان بیت المقدس میں ہوں گے اور حملہ آور باہر سے آئیں گے۔ اسی حدیث میں آگے چل کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ہاتھوں دجال کے قتل کا ذکر آتا ہے۔ وہاں بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھی بیت المقدس میں موجود ہوں گے اور یہاں سے نکل کر بیرونی حملہ آوروں کا مقابلہ کریں گے: «فَيُدْرِكُهُ عِنْدَ بَابِ اللُّدِّ الشَّرْقِيِّ، فَيَقْتُلُهُ، فَيَهْزِمُ اللهُ الْيَهُودَ، فَلَا يَبْقَى شَيْءٌ مِمَّا خَلَقَ اللهُ يَتَوَارَى بِهِ يَهُودِيٌّ إِلَّا أَنْطَقَ اللهُ ذَلِكَ الشَّيْءَ، لَا حَجَرَ، وَلَا شَجَرَ، وَلَا حَائِطَ، وَلَا دَابَّةَ، إِلَّا الْغَرْقَدَةَ، فَإِنَّهَا مِنْ شَجَرِهِمْ، لَا تَنْطِقُ، إِلَّا قَالَ: يَا عَبْدَ اللهِ الْمُسْلِمَ هَذَا يَهُودِيٌّ، فَتَعَالَ اقْتُلْهُ». ”عیسیٰ علیہ السلام اسے یعنی دجال کو لُد کے مشرقی دروازے کے پاس پکڑ لیں گے اور اسے قتل کر دیں گے، پھر اللہ تعالیٰ یہودیوں کو شکست دے گا اور یہودی اللہ تعالیٰ کی مخلوقات میں سے جس چیز کی بھی آڑ میں چھپے گا، خواہ وہ درخت ہو یا پتھر، دیوار ہو یا جانور، اس چیز کو اللہ تعالیٰ بولنے کی طاقت دے گا اور ہر چیز کہے گی: اے اللہ کے مسلمان بندے! یہ یہودی میرے پیچھے چھپا ہوا ہے، اسے آکر قتل کر دے، سوائے ایک درخت کے جس کو غرقد کہتے ہیں، یہ یہودیوں کے درختوں میں سے ایک درخت ہے، یہ نہیں بولے گا“۔ احادیث کا یہ وہ فہم ہے جو مختلف علمائے کرام نے پیش کیا ہے۔ استاذ سعید حوّی اپنی کتاب الأساس في السنة وفقهها میں فلسطین میں مسلمانوں کی حکومت کے بارے میں لکھتے ہیں:

والظاهر أن ذلك سابق على نزول المسيح عليه السلام، لأن المسيح يأتي إلى القدس وهي بيد المسلمين ويخرج منها إلى الدجال فيقتله بباب لدّ، وأكثر جند الدجال من اليهود القادمين معه من الخارج بدليل الحديث الصحيح: «يخرج مع الدجال سبعون

ألفـًا من يهود أصفهان عليهم الطيالسة». ”یہ ظاہر ہے کہ مسلمانوں کی یہ حکومت نزولِ عیسیٰ علیہ السلام سے پہلے قائم ہو چکی ہو گی۔ کیونکہ جب عیسیٰ علیہ السلام قدس میں تشریف لائیں گے تو شہر مسلمانوں کے ہاتھ میں ہو گا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام یہیں سے نکل کر دجال کا پیچھا کریں گے اور بابِ لُد پر اسے قتل کریں گے اور دجال کی اکثر فوجیں خارج ہی سے آئیں گی۔ جیسا کہ حدیث میں فرمایا گیا کہ دجال کے ساتھ اصفہان کے ستر ہزار یہودی نکلیں گے جن پر سبز چادریں ہوں گی“۔ استاد ایک جگہ لکھتے ہیں: الظاهر أن الحديث في خلافة تكون عاصمتها القدس، وإلى القدس يذهب المسيح عليه السلام بعد نزوله في دمشق، وهذا يشير إلى أن فلسطين وقتذاك بيد المسلمين، وأن دولة اليهود الحالية ذاهبة منتهية. ”حدیث میں مذکورہ خلافت کا دار الخلافہ قدس ہو گا اور دمشق میں نزول فرمانے کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام اسی شہر کا رخ کریں گے اس میں اشارہ ہے کہ اس وقت فلسطین مسلمانوں کے ہاتھ میں ہو گا اور اِس وقت یہاں قابض یہودی ریاست ختم ہو کر ملیامیٹ ہو چکی ہو گی“۔

طائفۂ منصورہ کے غلبے کے ساتھ صرف یہود کی شکست نہ ہو گی بلکہ ان کی پشت پناہ یورپی بدمعاش ریاستیں بھی شکست و ریخت کا مزہ چکھیں گی اور ﴿فَشَرِّدْ بِهِمْ مَنْ خَلْفَهُمْ﴾ ”تتر بتر کر دو جو اِن کے پیچھے ہیں“ کی شان ظہور پذیر ہو گی۔ دن، مہینا اور سال ہم بتا نہیں سکتے کہ یہ ہمیں بتایا نہیں گیا لیکن اتنا ہم کہتے ہیں کہ یہ لازماً ہو کر رہے گا۔ اگر ہم قسم اٹھا کر کہیں تو یقینی بات ہے کہ ہماری قسم جھوٹی نہیں ہو گی۔ اس کا ہونا اتنا یقینی ہے جتنا ہمارا لکھنا اور آپ کا پڑھنا!! اور یقین کیونکر نہ ہو کہ اس کی خبر صحیح حدیث میں موجود ہے۔ یہ حدیثِ پاک امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے مستدرک میں روایت کی اور امام ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے صحیح قرار دیا۔ علامہ ناصر الدین البانی رحمۃ اللہ علیہ نے سلسلة الأحاديث الصحيحة، میں چار نمبر کے تحت بعض دوسری کتابوں کے حوالے سے بھی یہ حدیث نقل کی ہے: حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما اپنی لکھی ہوئی احادیث میں سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا: «أَيُّ الْمَدِينَتَيْنِ تُفْتَحُ أَوَّلًا الْقُسْطَنْطِينِيَّةُ أَوِ الرُّومِيَّةِ؟». ”قسطنطنیہ اور رومیہ، ان دو شہروں میں سے کون سا شہر پہلے فتح ہو گا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «مَدِينَةُ هِرَقْلَ تُفْتَحُ أَوَّلًا»

''ہِرَقل کا شہر پہلے فتح ہو گا''۔ ہم جانتے ہیں کہ ہِرَقل، رسول اللہ ﷺ کا ہم عصر بازنطینی بادشاہ (قیصر) تھا۔ ہرقل کے شہر سے مراد اس کا پایہ تخت قسطنطنیہ ہے۔ چنانچہ راویِ حدیث بیان کرتے ہوئے آخر میں یہ الفاظ بڑھاتے تھے کہ يَعْنِي الْقُسْطَنْطِينِيَّةَ ''شہرِ ہَرقل سے مراد قسطنطنیہ ہے''۔ اس شہر کا ایک نام بیزنطہ بھی تھا اور مسلمانوں کے ہاتھوں فتح (۸۵۷ھ/۱۴۵۳ء) کے بعد اس کا نام استنبول رکھا گیا۔ رومیہ سے مراد شہرِ روم ہے جیسا کہ علامہ ناصر الدین البانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کے ذیل میں لکھا ہے: ''کتاب معجم البلدان کے مطابق رومیہ، شہرِ روم ہی کا ایک نام ہے جو آج کل اٹلی کا دار الحکومت ہے۔ شہر ہرقل یا قسطنطنیہ کی فتح عثمانی خلیفہ محمد الفاتح کے ہاتھوں ہوئی اور یہ واقعہ نبیِ اکرم ﷺ کے خبر دینے کے آٹھ سو سے زیادہ سال کے بعد پیش آیا اور دوسری فتح بھی اللہ کے حکم سے ظاہر ہوگی اور اس کا ظہور لازمی ہے''۔

نبیِ کریم ﷺ کی یہ پیش گوئی آپ کی دیگر پیش گوئیوں کی طرح لازماً پوری ہوگی۔ اگرچہ بظاہر حالات حوصلہ افزا نہیں لیکن قسطنطنیہ کی فتح کو یاد رکھیں اور سوچیں کہ جب مسلمان تاتاریوں کے ظلم و ستم کا نشانہ بنے جارہے تھے تو کون سوچ سکتا تھا کہ یہ امت دوبارہ سر اٹھانے کے قابل ہو کر ایک سپر پاور کے قدیم پایۂ تخت کو فتح کر سکے گی۔ لیکن چشمِ فلک نے دیکھا کہ ہمارے رسول ﷺ کی دی ہوئی خبر سچ ثابت ہوئی اور مسلمانوں نے شہرِ قیصر یعنی قسطنطنیہ فتح کر لیا۔ پس اسی طرح ایک دن آئے گا کہ اٹلی کا پایۂ تخت روم بھی مسلمانوں کے ہاتھوں فتح ہو گا۔ اب سوچیے کہ جب اٹلی فتح ہو گا تو کیا اس کا پڑوسی فرانس مسلمانوں کی قدم بوسی سے محروم رہنا گوارا کرے گا۔ ہرگز نہیں بلکہ وہ بھی مسلمانوں کے ہاتھوں مغلوب ہو کر رہے گا اور اس طرح فتحِ روم پورے یورپ کی فتح کا پیش خیمہ ثابت ہوگی۔ اس بڑی فتح کی بشارت احادیث میں ایک دوسرے انداز سے بھی بیان کی گئی ہے۔ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں: «إِنَّ اللهَ زَوَى لِي الْأَرْضَ فَرَأَيْتُ مَشَارِقَهَا وَمَغَارِبَهَا، وَإِنَّ أُمَّتِي سَيَبْلُغُ مُلْكُهَا مَا زُوِيَ لِي مِنْهَا». (مسلم) ''بے شک اللہ نے میرے لیے زمین کو سکیڑ دیا، پس میں نے اس کے مشرق و مغرب دیکھ لیے اور بے شک میری امت کی حکومت ان تمام علاقوں پر قائم ہوگی جو مجھے لپیٹ کر دکھائے گئے''۔

ایک دوسری حدیث میں آتا ہے: «لَيَبْلُغَنَّ هَذَا الْأَمْرُ مَا بَلَغَ اللَّيْلُ وَالنَّهَارُ وَلَا يبقى بَيْتُ مَدَرٍ وَلَا وَبَرٍ إِلَّا أَدخَلَهُ اللهُ هَذَا الدّينَ بِعِزِّ عَزِيزٍ أَوْ بِذُلّ ذَلِيلٍ عِزًّا يُعِزُّ اللهُ بِهِ الْإِسْلَامَ وَذُلّا يُذِلُّ بِهِ الْكُفْرَ». (مسندِ احمد) ”جہاں بھی رات و دن کا سلسلہ قائم ہے وہاں تک یہ دین پہنچے گا، نہ اینٹ گارے کا کوئی مکان بچے گا اور نہ اونٹ کے بالوں کا خیمہ مگر اللہ اس میں اپنے دین کو داخل کرے گا چاہے کسی عزت والے کو عزت دے کر یا کسی ذلیل کی ذلت کے ساتھ، عزت وہ کہ جس کے ساتھ اللہ اسلام کو عزت دے گا اور ذلت وہ کہ جس کے ساتھ اللہ کفر (اور اہلِ کفر) کو ذلیل کرے گا“۔ پس فلسطین اور پھر پوری دنیا میں مسلمانوں کو فتح نصیب ہونے والی ہے جس کا کوئی ٹائم فریم احادیث میں نہیں دیا گیا۔ البتہ اس سے پہلے ہم ایک وقتی آزمائش سے گزر رہے ہیں جس میں ہمارے لیے اجرِ عظیم کا موقع ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «عِظَمُ الْجَزَاءِ مَعَ عِظَمِ الْبَلَاءِ وَإِنَّ اللهَ إِذَا أَحَبَّ قَوْمًا ابْتَلَاهُمْ، فَمَنْ رَضِيَ فَلَهُ الرِّضَا، وَمَنْ سَخِطَ فَلَهُ السُّخْطُ». (سننِ ابنِ ماجہ) ”اجرِ عظیم تو بڑی آزمائش کے ساتھ ہی ملتا ہے۔ اور جب اللہ کسی قوم سے محبت کرتا ہے تو اسے آزماتا ہے، پس جو اس پر راضی رہتا ہے اس کے لیے اللہ کی رضا ہوتی ہے اور جو آزمائش پر ناراض ہوتا ہے اسے اللہ کی ناراضی ملتی ہے“۔

*****

ابنِ انشاؔ

دیوارِ گریہ

ایک دیوارِ گریہ بناؤ کہیں
یا وہ دیوارِ گریہ ہی لاؤ یہیں
اب جو اس پار بیت المقدس میں ہے
تاکہ اس سے لپٹ
اردن و مصر کے، شام کے
ان شہیدوں کو یک بار روئیں
ان کے زخموں کو اشکوں سے دھوئیں
وہ جو غازہؔ میں لڑ کر
وہ جو سیناؔئی کے دشت میں بے اماں
وحشی دشمن کی توپوں کا ایندھن بنے
جن پہ گِدھوں کے لشکر جھپٹتے رہے
وہ جو مرتے رہے، وہ جو کٹتے رہے
نعرہ تکبیر کا اپنے لب پر لیے
کلمۂ طیّبہ کا وظیفہ کیے

آج جب چار دن چار راتوں کے بعد
ایک خونخوار سورج
صبحِ فردا کا سورج لبِ بام آیا
تو یہ آنکھوں نے دیکھا...
وہ جو آنکھوں نے دیکھا
بھول جاؤ اسے، بھول جاؤ کہیں
ایک دیوارِ گریہ بناؤ کہیں

وہ یہودی کہ مقہور و مغضوب ہو کر
اتنی صدیوں سے آوارہ و بے وطن تھا
رونے آتا تھا دیوارِ گریہ کے نیچے
دھونے آتا تھا اشکوں سے دامانِ ماضی
آج اس کے قلم رو
شہرِ حیفاؔ سے تا راسِ تیراؔن ہے
اس کی افواج تیز
صورتِ رَست خیز
خیمہ زن بر سوئیز

اور اہلِ عرب

جن کے اجداد نے
شرق سے غرب تک
شہسواری بھی کی، تاجداری بھی کی
شہر و صحرا میں آوارہ و بے وطن ہیں
حیفۃ و جافہ و ناصرہ کے مکیں
سالہا سال سے ہے مکاں سر فشاں
دشت بھی غیر کا، شہر بھی غیر کا
بحر بھی غیر کا

اے خداوندِ افلاکیاں خاکیاں
کیا عرب کو بھی آوارہ ہونا پڑے گا
یعنی صدیوں تلک
یونہی دیوارِ گریہ پر رونا پڑے گا؟

ایک دیوارِ گریہ بناؤ کہیں
آج یاروں کو روؤ رلاؤ کہیں
اپنے دشمن تو ملعون و ناخوب ہیں
ہم تو یاروں کی یاری سے مجبوب ہیں
ایک بھبکی سے دشمن کی جو ڈھیر ہے
وہ اگر شیر ہے کاغذی شیر ہے

ایک جانب وہ طیارہ بردار تھے
جن پہ مغرب کے بمبار اسوار تھے
وہ تو اڑتے رہے اور جھپٹتے رہے
آگے بڑھتے رہے پیچھے ہٹتے رہے
رو کا یاروں کو اک فکرِ انجام نے
بیڑے یاروں کے دیکھا کیے سامنے

آئے بمبار جو کارواں کارواں
ان کی یلغار سے تھا سیاہ آسماں
ان کی زد میں عرب کے سجیلے جواں
جن کے نیزوں نے جیتا تھا آدھا جہاں
جن کی تاریخ فتحیں، سرافرازیاں
کوئی دم میں ہوئے اس طرح بے نشاں
سینۂ دشت تھا خون اور ہڈیاں
وہ بھی جھلسا دیا نارِ نیپام نے
بیڑے یاروں کے دیکھا کیے سامنے

جن سے دل کو وفا کی امیدیں بہت
جن کے وعدے بہت تھے وعیدیں بہت
بیٹھے لفظوں کے راکٹ چلایا کیے
یا بیانوں کے بم آزمایا کیے
دھمکیوں کے میزائل اڑایا کیے
کوئی گرتوں کو آیا مگر تھامنے؟

بیڑے یاروں کے دیکھا کیے سامنے

آج سینائی کی مسجدیں بے اذاں
آج سینائی میں عیدِ صیہونیاں
روحِ قبلہ تپاں درد کی آگ میں
ہو رہا ہے چراغاں سناگاگ میں

مضطرب مضطرب روحِ جبریل ہے
سوق در سوق غولِ سرائیل ہے
جورِ دجال ہے، شورِ فریاد ہے
یہ قیامت ہے یا محض افتاد ہے؟

کوئی دن کے لیے
قاہرہ کے شبینہ کلب کے حسینو!
اپنے جلوے نہ اتنے نمایاں کرو

کوے بیروت وبصرہ کے بے آستینو!
اپنے غمزوں کو اتنا نہ ارزاں کرو

شیخِ عالی مقام!
باز کچھ روز کنجِ قفس میں رہیں

شاہِ ذی احترام!
تجھ کو ناموسِ امت کی قسمیں رہیں

اے عرب کے عوام!
ہاں رقابت کے جذبات بس میں رہیں

ورنہ قطرہ یہ آلِ سرائیل کا
بحرِ ظلمات بن کر بپھر جائے گا
ایک عالم کو غرقاب کر جائے گا

وہ تو فوجوں کے اڈے بنایا کریں
آپ رونق حرم کی بڑھایا کریں
ان کا مقصد جہانِ عرب پر بزن
آپ کی ترکتازی کی حد ہے یمن
وہ مسخر کریں ارض و افلاک کو
آپ کے مورچے ریڈیو ریڈیو
آپ تسبیح و جام و مئے ارغواں
وہ سپاہی، زن و بچہ، پیر و جواں
آپ اونٹوں پہ محمل سجاتے ہوئے
وہ نئے اسلحے آزماتے ہوئے
آپ سمجھے کہ یہ روز کا کھیل ہے
ان کی نظروں میں تو آپ کا تیل ہے
آپ کی کشت ہے

آپ کا شہر ہے
آپ کا دشت ہے
آپ کی نہر ہے

دیکھ بیت المقدس کی پرچھائیاں
اجنبی ہوگئیں جس کی پہنائیاں
ہر طرف پرچمِ نجمِ داؤد ہے
راہ صخرا کے گنبد کی مسدود ہے
رفعتِ آخریں عالمِ پست کی
منزلِ اولیں تا سما جست کی
سجدہ گاہِ عمرؓ، مسجدِ پاک میں
آج خالی مصلے، اٹے خاک میں
ہر طرف فوجِ دجالِ ملعون ہے
منزل و سوق و بازار میں خون ہے

"میں نہ لوٹوں گا، مجھ کو نہ آواز دو
جب تلک ملک میرا نہ آزاد ہو"
قول ہارا تھا جس مردِ بے باک نے
ہاں اسے بھی پناہ دی تری خاک نے
وہ کہ جوہر تھا شمشیرِ اسلام کا
ایک ہندی محمد علی نام کا
آج یوروشلم تو جو پامال ہے
روحِ آزاد کا اس کی کیا حال ہے؟

یا اخی! یا اخی!
رو چکا، اور کاہے کو روتا ہے تو
تیرے رب کا تو فرمان لَا تَقْنَطُوْ!
کس کی تاریخ ہے بے غم و ابتلا
کربلا بھی ترے دین کا مرحلا
جس جگہ دھوپ ہے، اس جگہ چھاؤں ہے
آ دکھائیں تجھے، تیری دلجوئی کو
دور مشرق میں احرارِ ہنوئی کو
ان کا دشمن شکستوں سے بے حال ہے
ان کو لڑتے ہوئے بیسواں سال ہے
یہ بھی ملحوظ رکھ، تو جو دل تنگ ہے
یہ بھی ان کی ہے، وہ بھی تری جنگ ہے

آج دشمن کو گر کامراں جانیے
اس کو اک عارضی امتحاں جانیے
جنگ میں گام دو گام ہٹتے بھی ہیں
آگے بڑھنے کو پیچھے پلٹتے بھی ہیں

آ کہ ان قاتلوں، وحشیوں مجرموں
غاصبوں اور ان سب کے آقاؤں کو

وہ جو سونے کے بچھڑوں کی پوجا کریں
سات ساگر کے اس پار سے جو سدا
تار سازش کے بیٹھے ملایا کریں
ساری دنیا میں آشوب لایا کریں
ان کے اپنے گناہوں کے سنگِ گراں
کر کے زیبِ گلو
آج عقبہ کی کھاڑی میں غرقاب کر دیں
تاکہ عمّان و مکہ بھی محفوظ ہوں
تاکہ لاہور و ڈھاکہ بھی محفوظ ہوں
تاکہ اور اہلِ دنیا بھی محفوظ ہوں

اور پھر ان کے پسماندگاں کے لیے
ایک دیوارِ گریہ بنائیں کہیں
جس پہ مل کے یہ آنسو بہائیں کہیں

*****

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم

اسرائیلی جنگی جرائم

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم کے خطبۂ جمعہ سے انتخاب

آج ہم سب ایسے پر آشوب دور سے گزر رہے ہیں جس میں طرح طرح کے فتنے، مسائل اور پریشانیاں تقریبًا ہر انسان اور مسلمان کو درپیش ہیں۔ عالمی سطح پر بھی، ملکی سطح پر بھی اور انفرادی زندگی میں بھی۔ اس وقت عالمی سطح پر فلسطین میں جو کچھ ہو رہا ہے، کسی سے مخفی نہیں۔ اسرائیل کی وحشیانہ بمباری نے غزہ کو تہس نہس کر کے رکھ دیا ہے۔ براہِ راست شہری عمارتوں پر گولے برسانے کا سلسلہ متواتر جاری ہے۔ ہر چند گھنٹوں کے بعد کسی مسلمان یا فلسطینی آبادی کے علاقے پر بمباری کی جاتی ہے۔ دنیا دیکھ رہی ہے کہ اس بمباری میں بلا امتیاز مرد، عورتیں اور بچے سب شہید ہو رہے ہیں اور ہزاروں فلسطینی حالیہ بمباری میں شہید ہو چکے ہیں۔ جنگ کا بین الاقوامی قانون یہ ہے کہ شہری آبادی پر بمباری کرنا قانونًا منع ہے اور یہ جنگی جرائم میں شمار ہوتا ہے۔ پھر ایسے بم برسانا جس سے آگ لگے، مثلاً فاسفورس بم، بین الاقوامی قوانین کے تحت ممنوع ہے۔ اسپتالوں اور عبادت گاہوں پر بمباری قانونًا منع ہے۔ یہ قانون جو بین الاقوامی طور پر بنایا گیا، اس کے بنانے والوں کو تو بہت بعد میں ہوش آیا۔ در اصل نبیِ کریم ﷺ کی تشریف آوری سے پہلے جو جنگیں ہوئی تھیں، ان میں کوئی اخلاقی قدر موجود نہیں تھی، کوئی پابندی نہیں تھی، دشمن ہے تو اس کو جس طرح چاہو مارو، جس طرح چاہو اس کو قتل کرو۔ عورت ہو یا مرد، بچہ ہو یا بڑا، بالغ ہو یا نابالغ ہو، لڑنے والا ہو یا نہ ہو، ان سب کو ایک لاٹھی سے ہانکا جاتا تھا۔ دنیا کی تاریخ میں پہلی بار جنابِ نبی سرورِ دوعالم ﷺ نے جنگ کے قواعد مقرر فرمائے۔ لہٰذا جو لشکر بھی آپ روانہ فرماتے اس کو یہ ہدایت دی جاتی تھی کہ خبردار کسی عورت، بچے، بوڑھے اور عبادت کرنے والے کو نہ مارنا، چاہے وہ عبادت اپنے مذہب کے مطابق کر رہا ہو۔ کلیسا کے اندر کوئی عبادت کر رہا ہے

تو اس کو بھی مارنے کی اجازت نہیں۔ پہلی بار دنیا کی تاریخ میں رحمت اللعالمین ﷺ نے جنگ کے قواعد مرتب فرمائے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ان قواعد کی پوری پیروی فرماتے تھے۔ اگر لڑائی کے دوران کوئی عورت سامنے آ گئی جو لڑائی میں شریک نہیں ہے تو ہاتھ رک جاتا تھا، کوئی بوڑھا آ جاتا تھا تو ہاتھ رک جاتا تھا، کوئی عبادت گزار آ جاتا تھا تو جنگ کے جوش و خروش کے باوجود ہاتھ رک جاتا تھا۔ یہ قوانین تاریخِ انسانی میں سب سے پہلے نبیِ کریم ﷺ نے وضع فرمائے، بعد میں بین الاقوامی قوانین بنے۔ لیکن کیسے بنے کہ وہ صرف بڑی بڑی طاقتوں کو تحفظ دینے کے لیے ہیں۔ غزہ کی صورتِ حال سب پر عیاں ہے کہ بچوں کو مارا جا رہا ہے، عورتوں کو مارا جا رہا ہے، اسپتالوں پر حملے کیے جا رہے ہیں، مسجدوں اور کلیساؤں پر حملے ہو رہے ہیں۔ کسی کا ہاتھ کٹا ہوا ہے تو کسی کا پیر۔ جبکہ وہاں لوگوں کے شوقِ شہادت کا یہ حال ہے کہ بچے نوجوان پندرہ، سولہ سال کے، وہ بڑے ذوق شوق سے اپنے ہاتھوں پر نام لکھوا رہے ہیں، کہ جب بمباری میں ہم کہیں ملبے کے نیچے ملیں گے اور ہماری لاش سامنے آئے گی تو یہ پتا چل جائے گا کہ فلاں شخص ہے۔ اور ان بچوں کے اوپر بمباری ہو رہی ہے جن کے لیے بجلی بند ہے، پانی بند ہے، جن کے لیے پانی کا ہر قطرہ روک دیا گیا ہے۔ سب کھلی آنکھوں کے سامنے ہو رہا ہے۔ بین الاقوامی قوانین اور عالمی انسانی حقوق کے علم بردار کہتے ہیں کہ ہم اسرائیل کے ساتھ کھڑے ہیں۔

رسولِ کریم ﷺ کے ارشاد کے مطابق دنیا کے کسی بھی خطے میں کسی مسلمان بھائی پر ظلم ہو رہا ہو تو ہر مسلمان کے دل میں اس کی تڑپ ہونی چاہیے۔ مسلمانوں کو ایک جسم قرار دیا، جیسے ایک جسم میں کسی ایک عضو کو تکلیف ہوتی ہے تو سارا جسم متاثر ہوتا ہے۔ ہماری مشکل یہ ہے کہ میں اور آپ عام آدمی ہیں اور ہم بے چین ہیں، غمگین ہیں، صدمے سے دوچار ہیں، پریشان ہیں، لیکن ساتھ ہی ان کے لیے کوئی راستہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس بے چینی کو دور کرنے کا کیا راستہ ہو۔ کیونکہ نہ ہم میں طاقت ہے اور نہ ہم جنگی امور کو جانتے ہیں اور نہ کوئی جنگی تربیت لیے ہوئے ہیں۔ نہ ہمارے پاس ایسے وسائل ہیں کہ ہم وہاں تک پہنچ سکیں۔ اور اگر پہنچ بھی جائیں تو جا کر سوائے اس کے کہ ان کے لیے مسئلہ بنیں، ہم ان کی کوئی مدد نہیں کر سکتے، کیونکہ ہمیں جنگ کرنی نہیں آتی۔ آج کی جنگ تلوار اور تیر کی جنگ نہیں ہے وہ ٹیکنالوجی کی جنگ ہے، جس سے ہم واقف نہیں۔

لہٰذا ہم یہاں بیٹھے ہوئے ہیں، سوائے غم زدہ اور رنجیدہ ہونے کے، کوئی کام اور کوئی راستہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا۔ زیادہ سے زیادہ ہمارے اور آپ کے بس میں یہ ہے کہ ظاہری اسباب میں اپنی حکومتوں کو، اپنے برسرِاقتدار لوگوں کو، جن کے پاس فوجی طاقت ہے، انھیں متوجہ کریں کہ وہ فلسطین کے لیے اپنا کردار ادا کریں۔ آج پوری مغربی دنیا متحد ہوکر فلسطینیوں کو مٹانے کی کوشش میں ہے۔ اس موقعے پر اگر مسلمان آپس میں متحد ہوکر کوئی موقف اختیار کریں اور اس جنگ میں مداخلت کریں تو اسرائیل کا نام ونشان مٹ سکتا ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ ہم اور ہمارے جتنے مسلمان ملک ہیں، مراکش سے لے کر انڈونیشیا تک سب خاموش بیٹھے ہیں۔ خاموش اس معنیٰ میں کہ حمایت میں بیان بھی دیا، یہ بھی کہہ دیا کہ بین الاقوامی قوانین کی خلاف ورزی ہو رہی ہے، یا یوں کہہ دیا کہ یہ ظلم بند کرو، لیکن کوئی عملی قدم ابھی تک نظر نہیں آرہا۔ اس کی وجہ سے عوام اور زیادہ پریشان ہوتے ہیں۔ ایک طرف عالمی سطح پر یہ حالات ہیں اور دوسری طرف ملک کی اندرونی مسائل کتنے شدید ہیں۔ ہر شخص معاشی طور پر پریشان ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس موقعے پر کیا کرنا چاہیے؟ ہمارے پاس اقتدار کی باگ ڈور نہیں، یہ وسائل نہیں کہ خود جاکر اپنے مظلوم بھائیوں کی مدد کرسکیں۔ تو اس موقعے پر گزارش یہ ہے کہ جب بھی کوئی برائی آئے یا مصیبت، شریعت کا تقاضا یہ ہے کہ جس شخص کے اختیار میں جو کچھ ہے اُس کے مطابق وہ مصیبت کو دور کرنے کے لیے کام کرے۔ اس کے ذمے فرض ہے کہ وہ اپنی استطاعت کے مطابق کام کرے اور ہر شخص اپنا فرضِ منصبی اپنی جگہ پر ادا کرے۔ مثال کے طور پر مظلوم فلسطینیوں کے لیے ہمارے اختیار میں ہے کہ ہم ان مصیبت زدہ، ستم رسیدہ بھائیوں کی کچھ مالی معاونت کریں۔ اس کا سلسلہ ہم نے شروع کیا ہے اور الحمدللہ امداد پہنچ رہی ہے لیکن دھیرے دھیرے، اگر ہمارے بس میں یہ ہے تو ان کی مدد کریں۔

دوسرا یہ کہ ایسے موقعے پر اللہ جل جلالہ سے لو لگائیں۔ قرآنِ کریم نے ایک جگہ بڑا معنیٰ خیز لفظ استعمال کیا ہے: ﴿ففروا إلى الله﴾ ”اللہ تعالیٰ کی طرف بھاگو“۔ بھاگنے کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اللہ کی طرف بھاگیں، پریشانیاں لاحق ہیں اور آپ اس کی وجہ سے رنجیدہ ہیں اور سمجھ میں کچھ نہیں آرہا ہے کیا کریں، کیا نہ کریں۔ تو بھاگ کر اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹ آئیے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کی پناہ میں چلے جائیے۔ اللہ تعالیٰ

سے دعا کیجیے کہ یہ مشکلات حل ہوں۔ لیکن زبان پر دعا ہے اور دماغ کہیں اور ہے اس طریقے سے دعا نہیں ہوتی، لوگ دعا پڑھتے ہیں مانگتے نہیں۔ دعا پڑھنے کی چیز نہیں ہے مانگنے کی چیز ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ سے اس طرح مانگیں جس طرح کوئی بھکاری مانگتا ہے۔ چند لمحات باری تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضر ہوکر گزاریں کہ یا اللہ ہم اس مصیبت میں پھنس گئے ہیں، ان مشکلات کو حل کرنے والا آپ کے سوا کوئی اور نہیں۔ لا حول ولا قوۃ الا باللہ کے کیا معنی ہیں؟ کسی میں طاقت نہیں ہے سوائے اللہ کے، کسی میں قوت نہیں ہے سوائے اللہ کے، اس کو پڑھ کر اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کریں۔ ہم صرف تبصرے کرتے رہتے ہیں کہ فلاں جگہ یہ ہوگیا، فلاں جگہ یہ ہوگیا اور وقت اس پر ضائع کرکے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع نہیں کرتے۔ کرنے کا کام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوں۔ کچھ عرصہ آزمائش بھی ہوتی ہے اس کے بعد دعا کا اثر ظاہر ہوتا ہے۔ حضرت یونس علیہ السلام نے مچھلی کے پیٹ میں دعا کی تو فوراً ہی ان کو نہیں نکال لیا گیا۔ تین دن مچھلی کے پیٹ میں رہے اور ان اندھیریوں اور اس گھناؤنی صورتِ حال میں جہاں نہ کھانے کو کچھ میسر ہے نہ پینے کو، تین دن گزارنا تین سال قید سے بھی زیادہ سخت تھا۔ تو انھیں آزمایا گیا، تین دن گزارو اور پھر ہمیں پکارو! تب اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَ نَجَّيْنَاهُ مِنَ الْغَمِّ﴾ ”ہم نے ان کو اس گھٹن سے نجات دے دی“۔ اس کے بعد فرمایا: ﴿وَكَذٰلِكَ نُنجِي الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ ”اسی طرح ہم مومنوں کو نجات دے دیتے ہیں“۔ مطلب یہ ہے کہ جب بھی بندہ اس جذبے کے ساتھ مانگے گا جس جذبے کے ساتھ سے حضرت یونس علیہ السلام نے مانگا تھا: ﴿لَا إِلَهَ إِلَّا أَنْتَ سُبْحَانَكَ إِنِّي كُنْتُ مِنَ الظَّالِمِينَ﴾ تو اللہ تعالیٰ نجات دے گا۔ اور اگر پھر بھی نجات مقدر میں نہ ہو تو اللہ پر بھروسا رکھیں، جو اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہے اس پر راضی رہیں، یہ ہے ایک مسلمان کے کرنے کا کام۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی توفیق عطا فرمائے۔

* * * * *

مفتی ابولبابہ شاہ منصور دامت برکاتہم

بیت المقدس کے اہم مقامات

مؤرخین کا کہنا ہے کہ جس طرح بیت المقدس کی فتح حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا کارنامہ ہے، اس طرح اس کی شاندار تعمیر کا اعزاز اموی خلفا کو حاصل ہے۔ بعد ازاں سلاطینِ اسلام اس کی دیکھ بھال، تعمیر و مرمت اور تزئین و آراستگی اور اضافات کرتے رہے۔ حدودِ حرم میں واقع مسجد کے ہال کا طول ۶۰۰ گز اور عرض ۷۰۰ گز ہے۔ اس ہال اور برآمدے کی تعمیر نہایت خوب صورت، پر تکلف اور شاندار ہے۔ چھت جن ستونوں پر کھڑی ہے، یہ اعلیٰ قسم کے سنگِ مرمر کے ہیں اور ان کے درمیان کی محرابوں اور مسجد کے گنبد کے اندرونی حصے پر نہایت عمدہ نقش و نگار اور طلائی کام کیا گیا ہے۔ مسجد کے گرد مضبوط فصیل ہے۔ مؤرخین کا اتفاق ہے کہ مسجدِ اقصیٰ کی روزِ اوّل سے جو حدود تھیں آج بھی وہ انھی حدود پر قائم ہے، ان میں کمی بیشی نہیں ہوئی۔ مسجدِ اقصیٰ کا اطلاق اس پورے قطعے پر ہوتا ہے جس کے گرد یہ فصیل موجود ہے، لیکن کبھی اس خاص حصے کو بھی مسجدِ اقصیٰ کہہ دیتے ہیں جو اس چار دیواری کے اندر نماز کے لیے مخصوص ہے۔ فصیل میں سے اندر داخل ہونے کے چودہ دروازے ہیں، ان میں سے دس دروازے آج بھی زیرِ استعمال ہیں، جبکہ چار دروازے سلطان صلاح الدین ایوبی رحمۃ اللہ علیہ نے حفاظتی نقطۂ نظر سے بند کروا دیے تھے۔ مسجد کے آخر میں کشادہ برآمدہ ہے۔ برآمدے میں سات دروازے ہیں۔ اس کے آگے وسیع صحن ہے، اس صحن میں مختلف چھوٹی چھوٹی عمارتیں ہیں جن میں یادگار کے طور پر تعمیر کیے گئے قبے، چبوترے، اذان کے مینارے، پانی کی سبیلیں، کنویں، مدرسے اور محرابی دروازے ہیں۔ ان عمارتوں میں سب سے بڑی اور نمایاں عمارت چٹان والے گنبد کی عمارت ہے جس کا تفصیلی تعارف آگے آئے گا۔

دیوارِ براق

یہ حرم کے جنوب مغرب میں ہے۔ اس کی لمبائی ۴۷ میٹر اور بلندی ۱۷ میٹر ہے۔ روایات میں ہے کہ حضور صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے معراج کی رات یہاں اپنی سواری کو باندھا تھا۔ اس مناسبت سے اسے دیوارِ براق کہتے ہیں۔ یہاں مسلمانوں نے حرم کی فصیل کے ساتھ مسجدِ براق کے نام سے ایک مسجد بھی تعمیر کی تھی، اس کے ساتھ خانقاہ اور وقف جائیدادیں بھی تھیں۔ یہودیوں نے یہاں غاصبانہ قبضہ کر کے مکانات گرانے کے ساتھ مسجد بھی منہدم کر دی اور وسیع ہموار احاطے کو اپنی عبادت کے لیے مخصوص کر لیا۔ وہ اس دیوار کو ہیکلِ سلیمانی کا باقی ماندہ حصہ سمجھتے ہیں اور یہاں آکر روتے دھوتے اور دیوار کی درزوں میں درخواستیں لکھ لکھ کر رکھتے ہیں۔ اس دیوار کو انھوں نے دیوارِ گریہ کا نام دے رکھا ہے اور اس پر ملکیت کا دعویٰ جتاتے رہتے ہیں۔

سنہرا گنبد

یہ مسجدِ اقصیٰ کے صحن میں مسجد کے ہال سے ۵۰۰ میٹر کے فاصلے پر ایک اونچے چبوترے پر قائم ہے۔ اس کو ''قبۃ الصخرۃ'' کہتے ہیں۔ قبہ کے معنیٰ گنبد اور صخرہ کے معنی چٹان کے ہیں۔ یہ قبہ صحنِ حرم میں قدرے اونچی جگہ موجود ایک قدرتی چٹان پر تعمیر کیا گیا ہے، اس لیے اسے ''قبۃ الصخرۃ'' یعنی چٹان کا گنبد کہتے ہیں۔ یہ عمارت مثمن الاضلاع (آٹھ پہلوؤں والی) ہے۔ اس کا ہر پہلو ۶۶ فٹ طویل ہے، اندرونی قطر ۱۹۲ فٹ اور قبے کے قاعدے کا قطر ۶۶ فٹ ہے۔ یہ قبہ ۹۹ فٹ بلند اور لکڑی کا بنا ہوا ہے، جس پر باہر کی طرف سونے کا رنگ چڑھا ہوا پیتل اور سیسا لگایا گیا ہے اور اندر کی طرف گچ کا استر کیا گیا ہے، جس میں خوب صورت سنہری کام اور پر تکلف آرائش و زیبائش کی گئی ہے۔ اس کی تعمیر کا آغاز ۶۶ھ مطابق ۶۸۵ء میں اموی خلیفہ عبد الملک بن مروان نے کیا اور تکمیل اس کے بیٹے ولید بن عبد الملک کے ہاتھوں ۷۲ھ مطابق ۶۸۱ء میں ہوئی۔ مشہور ہے کہ بنی امیہ نے اس کی تعمیر پر مصر کے خراج سے حاصل ہونے والی سات سال کی آمدنی خرچ کی۔ موجودہ عمارت ترک سلاطین سلطان عبد الحمید اور سلطان عبد العزیز کے عہد کی مرمت کردہ ہے۔ چنانچہ دیواروں کی بیرونی مینا کاری، خوب صورت رنگین شیشوں کی ۳۸ کھڑکیاں اور اندازِ تزئین سب مخصوص ترکی

طرز کا ہے۔ عمارت کے باہر چاروں طرف خوب صورت پتھروں پر سورۂ بنی اسرائیل اور سورۂ یٰسین کی آیات خط طغرا میں دلفریب انداز میں تحریر کی گئی ہیں۔ یہ آیات سلطان عبدالحمید ثانی نے تحریر کروائی تھیں، کھڑکیوں کی بناوٹ میں اعلیٰ درجے کی حسنِ ترتیب اور بہترین جالی دار کام کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔

چٹان اور غار

یہ قبہ (سنہرا گنبد) جس چٹان پر قائم ہے وہ انسان کے سینے کے برابر اونچی، ۵۶ فٹ لمبی، ۴۲ فٹ چوڑی اور تقریباً نیم دائرے کی غیر منظم شکل ہے۔ اس کا مشرقی پہلو منحنی اور ڈھلوان اور مغربی پہلو اونچا اور بلند تر ہے۔ یہ چٹان دراصل یروشلم میں پائی جانے والی سرمئی رنگ کی چٹانوں کے سلسلے کا حصہ ہے اور غیر تراشیدہ شکل میں سالہاسال سے یہاں رکھی ہوئی ہے۔ گیارہویں صدی عیسوی میں جب القدس پر عیسائیوں کا قبضہ ہوگیا تو شکم پرست عیسائی پادریوں کی ایک مذموم جھلک دیکھنے میں آئی۔ یہاں متعیّن بڑے پادریوں نے انجیل کو بیچ کھانے کی طرح یہ کاروبار شروع کیا کہ یہاں آنے والے عیسائی زائرین کو چٹان کے ٹکڑے ہم وزن سونے کے عوض فروخت کرنا شروع کر دیے۔ صلیبی حکمرانوں کو اس کی اطلاع ملی تو انھیں اس بدعنوانی کے روکنے کا سوائے اس کے کوئی راستہ نظر نہیں آیا کہ اس چٹان کو سنگِ مرمر کی سلوں سے ڈھک دیں، کیونکہ متعصب اور دنیا پرست پادریوں کی حرام خوری کو روکنا ان کے بس میں نہیں تھا۔ تقریباً ۸۰ سال کے وقفے کے بعد جب سلطان صلاح الدین ایوبی رحمۃ اللہ علیہ نے بیت المقدس فتح کیا تو قبے کے گنبد سے صلیب اتارنے اور عیسائیوں کے دیگر نشانات مٹانے کے ساتھ ان سلوں کو بھی ہٹا دیا۔ اس چٹان کے نیچے ایک قدرتی غار ہے، جس میں تقریباً ستر آدمی سما سکتے ہیں۔ یہ غار مربع شکل کا ہے، جس کا ہر ضلع تقریباً ساڑھے چار میٹر لمبا اور چھت تین میٹر اونچی ہے۔ چھت میں تقریباً ایک میٹر چوڑا ایک شگاف ہے۔ اس غار میں گیارہ سیڑھیاں اترنے کے بعد ایک محرابی دروازے کے ذریعے داخل ہوا جاتا ہے، یہ محرابی دروازہ سنگِ مرمر کا بنا ہوا ہے، غار کے فرش پر بھی سنگِ مرمر بچھا ہوا ہے۔ اس غار میں دو محرابیں ہیں، دائیں طرف والی محراب کے سامنے ایک چبوترہ ہے جسے عوام مقامِ خضر کہتے ہیں اور شمال کے چبوترے کو باب الخلیل کہا جاتا ہے۔

مسجد کے ہال میں

مسجد کے قبلے والی دیوار میں ایک بڑا محراب ہے جسے ''محرابِ داؤد'' کہتے تھے، اب ''محرابِ عمر'' کہتے ہیں۔ محراب کے ساتھ ایک منبر تھا جسے ناصر الاسلام والمسلمین سلطان صلاح الدین ایوبی رحمۃ اللہ علیہ حلب سے لائے تھے۔ اس منبر کی اس وقت پوری دنیا میں نظیر نہ تھی۔ اسے در اصل سلطان نور الدین زنگی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی نگرانی میں اس امید پر بنوایا تھا کہ اسے بیت المقدس کی فتح کے بعد اس کے محراب کے ساتھ نصب کیا جائے گا۔ آخر کار ان کے جانشین اور وارث سلطان صلاح الدین ایوبی رحمۃ اللہ علیہ نے ان کی یہ امید پوری کر دکھائی اور القدس کو فتح کر کے اس منبر کو یہاں نصب کرنے کا اعزاز حاصل کیا۔ ۱۹۶۹ء میں یہودیوں کی طرف سے مسجدِ اقصیٰ میں آگ لگانے کا جو ہولناک سانحہ پیش آیا، اس میں اس نایاب منبر کا اکثر حصہ بھی جل گیا۔ ہال کے مغربی جانب لوہے کا ایک جنگلا ہے، اس میں ''محرابِ معاویہ'' کے نام سے ایک محراب ہے۔ مشرقی جانب مستطیل شکل کا حصہ مسجد کے دوسرے حصے سے ممتاز نظر آتا ہے، یہ در حقیقت مسجدِ اقصیٰ کا وہ قدیم حصہ ہے جہاں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پہلے پہل مسجد تعمیر کی تھی، اسی وجہ سے اسے ''جامعِ عمر'' کہتے ہیں، اس میں ایک چھوٹا سا محراب ہے۔ جامعِ عمر سے شمال کی طرف ایک خوب صورت جگہ ہے جسے ''ایوانِ عزیز'' کہتے ہیں۔ ایوانِ عزیز سے شمالی جانب ایک اور چھوٹا سا لیکن نہایت خوب صورت محراب ہے اسے ''محرابِ زکریا'' کہتے ہیں۔ اس کی لمبائی ۶ میٹر اور چوڑائی ۶ میٹر ہے۔

اب آیئے! صحنِ مسجد میں واقع جا بجا بکھری خوب صورت عمارتوں پر ایک نظر ڈالتے ہیں، تاکہ اس ورثے کی یاد اور مذاکرہ ہمارے دل میں اسے واپس لینے کی دھن پیدا کر دے۔

مدرسے

حرمِ قدسی کے شمال اور مغرب میں جو فصیل ہے، اس کے ساتھ ساتھ طویل و عریض برآمدے ہیں۔ ان میں نچلی اور اوپر کی منزل میں درس گاہیں اور طلبہ کے کمرے تھے۔ ان میں سے کچھ کو مختلف مسلمان امرا یا ان کی بیگمات نے ایصالِ ثواب کے لیے تعمیر کیا۔ ان کے ساتھ مختلف چھوٹے بڑے کمرے بھی طلبہ کی رہائش

کے لیے تعمیر کیے گئے تھے۔ مشہور مدرسے یہ ہیں: مدرسہ غازیہ، مدرسہ کریمیہ، مدرسہ باسطیہ، مدرسہ طولونیہ، مدرسہ عثمانیہ وغیرہ۔ آج یہاں چند ایک چھوٹے مکاتب ہیں، باقی سب میں حسرت ویاس کے وہ مناظر ہیں جن سے دیکھنے والے کا کلیجہ کٹتا ہے۔ مغربی برآمدے میں مدرسہ خاتونیہ نام کی درس گاہ کے باہر ایک حجرے میں برِّصغیر کے مشہور خطیب اور رہنما مولانا محمد علی جوہر کی قبر ہے۔ روایت ہے کہ انھوں نے آزاد زمین میں دفن ہونے کے لیے ہندوستان واپس جانے سے انکار کر دیا، لیکن انھیں کیا خبر تھی کہ وہ انگریز سے ہندوستان کی آزادی کے لیے جدوجہد کرتے رہیں گے اور گوری چمڑی والا مکار فطرت والا مسلمانوں کا یہ دشمن مسلمانوں کے ترکِ جہاد کی وجہ سے القدس کو بھی اپنی سرپرستی میں یہودیوں کے حوالے کر دے گا۔

قبے

یہ خوب صورت قبے تدریس، ذکر وعبادت کے لیے جاے خلوت، یا تاریخی یادگاروں کے طور پر تعمیر کیے گئے تھے اور آج تک مسجدِ اقصیٰ کے صحن کی خوب صورتی اور رونق میں اضافہ کر رہے ہیں۔ ان قبوں کو مختلف حکمرانوں نے مختلف اغراض کے تحت تعمیر کروایا۔ مسجدِ اقصیٰ کی طائرانہ تصویر کو غور سے دیکھنے سے یہ اس کے صحن میں تراشیدہ موتیوں کی طرح بکھرے نظر آتے ہیں۔ ان میں سب سے مشہور قبۃ المعراج ہے جس پر یہودی فوجیوں کی برسائی گئی گولیوں کے نشانات موجود ہیں۔ یہ قبہ آنحضرت ﷺ کے آسمانوں پر تشریف لے جانے کے عظیم واقعے کی یادگار میں تعمیر کیا گیا۔ اس کے علاوہ قبۃ السلسلۃ، قبۃ النحویۃ، قبۃ یوسف اور قبۃ الشیخ خلیلی مشہور ہیں۔

چبوترے

یہ چبوترے گرمیوں میں نماز اور درس وتدریس اور علمی مذاکروں کے لیے تعمیر کیے گئے تھے۔ یہ صحن کے فرش سے ذرا اونچے اور مربع ومستطیل دونوں طرح کے ہوتے تھے۔ انھیں خوب صورت پتھروں سے تعمیر کیا جاتا تھا اور اکثر قبلے کی جانب محراب نما دیوار بھی تعمیر کی جاتی تھی۔ ان میں سے زیادہ تر حرمِ قدسی کے مغربی صحن

میں واقع ہیں، کیونکہ وہاں درخت زیادہ تھے، ان کے سائے میں بیٹھنے کی یہ جگہیں بنائی جاتی تھیں۔ یہ چبوترے زیادہ تر عثمانی دور میں تعمیر کیے گئے۔ ان کی کل تعداد چوبیس ہے، مشہور کے نام یہ ہیں: بصیری کا چبوترہ، کرک کا چبوترہ، سلطان ظاہر کا چبوترہ۔

مینارے

بیت المقدس میں اذان کے لیے چار مینارے تھے جو شمالی اور مغربی جانب تھے، کیونکہ شہر کی آبادی اس طرف تھی۔ مسجدِ اقصیٰ چونکہ قدیم القدس شہر کے جنوب مشرقی کنارے میں نسبتاً اونچی جگہ واقع ہے، اس لیے اس کے جنوب اور مشرق میں آبادی نہ تھی۔ اب آخری دور میں یہاں رہائشی تعمیرات ہوئی ہیں۔ حرمِ قدسی کی فضا سے لی گئی تصویر کو دیکھنے سے یہ بات بخوبی سمجھ میں آجاتی ہے۔ یہ چاروں مینار ممالیک کے دور میں تعمیر کیے گئے اور آج تک دور سے مسجد کی علامت کے طور پر دیکھے جاتے ہیں۔ یہ مینارے مسجد کے چار دروازوں کے ساتھ تعمیر کیے گئے تھے، اس مناسبت سے انھیں باب المغاربہ کا مینارہ، باب السلسلۃ کا مینارہ، باب الغوانمہ کا مینارہ اور باب الاسباط کا مینارہ کہا جاتا ہے۔

سبیلیں

خادمینِ حرم نے نمازیوں اور زائرین کی سہولت کے لیے پانی کا بہت عمدہ انتظام کیا تھا، جس کی وجہ سے مسجد کی حدود میں جا بجا میٹھا اور ٹھنڈا پانی کنوؤں، سبیلوں اور حوضوں میں وافر مقدار میں پایا جاتا تھا۔ حرم شریف میں ۲۵ کنویں تھے جن میں سے سترہ مسجدِ اقصیٰ کی مرکزی عمارت کے قریب اور آٹھ سنہرے گنبد والی عمارت کے آس پاس تھے۔ نو سبیلیں اس کے علاوہ تھیں، کأس الفوارۃ (پیالے والا فوارہ) نامی ایک خوب صورت حوض مسجد کے مرکزی دروازے کے بالکل سامنے تھا۔ اسے سلطان سیف الدین ایوبی نے ۵۸۹ھ میں تعمیر کروایا تھا۔ یہ حوض مسجد کے مرکزی دروازے کے بالکل سامنے کی طرف سے لی گئی تصویروں میں نمایاں نظر آتا ہے۔ شہر کے چند مشہور میٹھے چشموں کا پانی بھی نالیوں کے ذریعے مسجد تک پہنچایا گیا تھا۔

دھوپ گھڑیاں اور تہ خانہ

مسجدِ اقصیٰ میں دو دھوپ گھڑیاں تھیں جو اوقات نماز پہچاننے کا کام دیتی تھیں۔ ایک مسجد کے بالکل سامنے اور ایک چٹان والے گنبد کی دیوار پر۔

اس کے علاوہ مسجد کے مرکزی ہال کے نیچے ایک تہ خانہ بھی ہے جسے صلیبیوں نے اپنے قبضے کے دور میں گھوڑوں کا اصطبل بنا رکھا تھا اور اسے ''اصطبلِ سلیمان'' کے نام سے پکارتے تھے۔ یہ تہ خانہ ستونوں پر کھڑا ہے، اسے ''قدیم اقصیٰ'' بھی کہتے ہیں۔ آخری دور میں مسجدِ اقصیٰ کے ایک کمرے میں اسلامی نوادرات بھی رکھے گئے ہیں، جن کا تاریخی اشیا کے شوقین ذوق و شوق سے دیدار کرتے ہیں۔

*****

ماخذ: حضرت مفتی ابولبابہ شاہ منصور صاحب دامت برکاتہ کی کتاب ''اقصیٰ کے آنسو'' کے مضامین ''القدس کے نام'' سے منتخب موضوعات کو معمولی تغیر کے بعد شامل کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر رؤف پاریکھ
معروف ادیب، محقق اور ماہرِ لسانیات

فلسطین اور پاکستانی اُردو ادب

یہ کہنا درست ہے کہ فلسطین کا مسئلہ خالصتاً انسانی ہے اس لیے ہر دردمند شخص کے دل میں فلسطینیوں کے لیے ہمدردی ہے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ فلسطین کی پراسرار اور مقدس سرزمین اپنے مذہبی عناصر کی وجہ سے بھی مسلمانوں کے لیے کشش رکھتی ہے۔ اس سرزمین کو کئی انبیاعلیہم السلام کی آخری آرام گاہ بھی کہا جاتا ہے۔ مسلمانوں کا قبلۂ اول بھی وہیں ہے اور اللہ کے آخری نبی اور آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم اسی ارضِ مقدس سے اپنے سفرِ معراج پر تشریف لے گئے تھے۔ پھر سیاسی اور تاریخی لحاظ سے دیکھا جائے تو فلسطینی عوام جس سرزمین پر صدیوں سے بس رہے تھے وہاں مغربی استعمار نے سراسر ناانصافی اور ظلم سے انیس سو اڑتالیس میں اسرائیل نامی ایک یہودی ریاست قائم کردی۔ فلسطینی جو کل تک اکثریت میں تھے اقلیت میں بدل دیے گئے۔ ہزاروں فلسطینی اپنی زمینوں سے، گھروں سے نکال دیے گئے، دربدر ہوگئے، کس مپرسی کا شکار ہوگئے۔ لیکن اسرائیل کی مغربی حمایت جاری رہی اور آج تک جاری ہے۔

اگرچہ ان وجوہات کی بنا پر مغربی ممالک میں بھی کچھ حلقوں میں فلسطینیوں کے لیے ہمدردی پائی جاتی ہے۔ فلسطین کے عوام کی جدوجہدِ آزادی پاکستان کے عوام کے لیے بھی اہم ہے کیونکہ نہ صرف آل انڈیا مسلم لیگ نے پاکستان بننے سے پہلے فلسطین کے حق میں قرارداد منظور کی تھی بلکہ پاکستان بننے کے بعد بھی ملّی طور پر ہم اسے عالمِ اسلام کا ایک مسئلہ سمجھتے آرہے ہیں۔ سفارتی اور سیاسی میدان سے ہٹ کر اگر ادبی لحاظ سے دیکھا جائے تو پاکستان کے اہلِ قلم نے فلسطین کے مسئلے کو اپنی تخلیقی تحریروں میں ابتدا ہی سے پیش کیا ہے۔ اردو کے اکثر و بیشتر اہلِ قلم اپنی شاعری اور نثر کے ذریعے فلسطینیوں پر ہونے والے مظالم کو بھی اجاگر کرتے رہے ہیں اور اپنی تحریروں سے انھوں نے فلسطینیوں کی حمایت جاری رکھی ہے۔ ان میں سے کچھ کا مختصر

ذکر پیش ہے۔ مختصر اس لیے کہ یہ موضوع بہت بسیط و عریض ہے اور اس موضوع پر دو کتابیں لکھی جا چکی ہیں، ایک فتح محمد ملک کی: فلسطین اردو ادب میں اور دوسری محمد افتخار شفیع کی: اردو ادب اور آزادیِ فلسطین۔ چنانچہ ان کتابوں کی مدد سے یہاں کچھ مختصر احوال ہی پیش کیا جا سکتا ہے۔

یہ خیال رہے کہ ترقی پسند اور غیر ترقی پسند دونوں مکاتبِ فکر کے اہلِ قلم نے اپنے اپنے نقطۂ نظر سے فلسطین کو اپنی تحریروں کا موضوع بنایا۔ ترقی پسندوں کے لیے فلسطین کے مسئلے کی اہمیت یہ تھی کہ اس کی آزادی کی تحریک چلانے والی تنظیم الفتح سوشلسٹ اور روسی افکار اور امداد کے زیرِ اثر تھی اور وہ اسے انسانی نقطۂ نظر سے دیکھتے تھے۔ جبکہ کچھ لکھنے والے مسلم قومیت اور ملی جذبات کے زیرِ اثر تحریکِ آزادیِ فلسطین کے حامی رہے۔ کچھ لوگ جو نہ ترقی پسند تھے اور نہ مسلم قومیت کے حامی، وہ جدیدیت اور سیکیولر خیالات کے زیرِ اثر فلسطین کی حمایت کرتے رہے۔ آج کل تحریکِ آزادی حماس زیادہ زور و شور سے چلا رہی ہے۔ وہ دینی جذبے سے بھی سرشار ہے جبکہ الفتح کا اثر و رسوخ امریکا اور اسرائیل سے مفاہمانہ تعلقات، کیمپ ڈیوڈ معاہدے اور اوسلو مذاکرات کے بعد کم ہو گیا ہے۔ اگرچہ محمود عباس صدر ہیں لیکن وہ یاسر عرفات کے جانشین ہیں اور اُنھیں کی طرح تحریک مذہبی جذبات پر نہیں چلاتے۔

اردو شاعری میں فلسطین

اردو ادب میں فلسطین کے مسئلے کا ذکر تو قیامِ پاکستان سے قبل ہی سے ملتا ہے جب علامہ اقبال نے ”ضربِ کلیم“ کی نظم ”شام و فلسطین“ میں اس کو موضوع بنایا۔ فلسطین کی سرزمین پر یہودیوں کے حق اور اس ضمن میں تاریخی وابستگی کے دعوے کو علامہ نے یوں مسترد کیا:

ہے خاکِ فلسطیں پہ یہودی کا اگر حق
ہسپانیہ پر حق نہیں کیوں اہلِ عرب کا

لیکن اقبال یہ بھی جانتے تھے کہ مغرب یہودیوں کے معاشی جال میں پھنسا ہوا ہے اس لیے مسلمانوں کو انگریزوں یا لیگ آف نیشن جیسی عالمی تنظیموں سے کچھ نہیں ملے گا اور کہا کہ:

تری دوا نہ جنیوا میں ہے نہ لندن میں
فرنگ کی رگِ جاں پنجۂ یہود میں ہے

انیس سو اڑ تالیس میں ہونے والی عرب اسرائیل جنگ میں عربوں کی شکست کے بعد عربوں میں مایوسی اور دل شکستگی کے آثار تھے لیکن یہ لاوا اندر ہی اندر پک رہا تھا اور بعض تجزیہ نگاروں کا خیال ہے کہ کچھ عرصے بعد مصر میں جو تبدیلی جمال عبدالناصر کی قیادت میں رونما ہوئی اس میں عرب دنیا کی اس بے چینی کا بھی ہاتھ تھا، بعدازاں پوری عرب دنیا میں انقلاب کے نعرے گونجنے لگے۔

اگرچہ انیس سو سڑسٹھ کی عرب اسرائیل جنگ میں عربوں کی شکست نے جہاں عربوں اور عام مسلمانوں میں مایوسی اور بے بسی کا احساس پیدا کیا وہاں خود عربی اور فلسطینی ادب میں مسئلۂ فلسطین کو اجاگر کرنے کی ایک نئی لہر اٹھی اور ہمارے ہاں اردو ادب میں بھی اہلِ قلم نے اس درد کو محسوس کیا۔ مثلاً ن م راشد نے اپنی طویل نظم ”دل مرے صحرا نوردِ پیر دل“ (جو ان کے مجموعے لا برابر انسان میں شامل ہے) ”آگ“ اور ”صحرا“ اور ”ریگ“ کی تشبیہات اور علامات کے ذریعے ایمائی انداز میں فلسطین کے مسئلے کو پیش کیا۔ کہتے ہیں:

ریگ جب اٹھتی ہے تو اُڑ جاتی ہے ہر فاتح کی نیند
ریگ کے نیزوں سے زخمی سب شہنشاہوں کے خواب
ریگ اے صحرا کی ریگ
مجھ کو اپنے جاگتے ذرّوں کے خوابوں کی نئی تعبیر دے

فیض احمد فیض یوں تو ترقی پسند تھے اور ان کو مذہب کی بنیاد پر نہیں بلکہ انسانی ہمدردی کی بنیاد پر فلسطین سے ہمدردی تھی لیکن اپنے قیامِ بیروت کے عرصے میں اور الفتح کے سربراہ یاسر عرفات سے براہِ راست تعلق کے نتیجے میں انھوں نے فلسطین کے حالات اور اس کے زخم زخم جسم کو بذاتِ خود بھی دیکھا (فلسطینی رہنما یاسر عرفات بھی سیکیولر اور سوشلسٹ خیالات کے حامل تھے) اور فلسطین اور اہلِ فلسطین کے لیے گہرا دکھ ان کی شاعری میں ابھرا جو ان کی متعدّد نظموں میں دیکھا جاسکتا ہے۔ اپنی نظم سرِ وادیِ سینا میں فیض نے جہاں اسرائیلی جارحیت کے خلاف آواز بلند کی وہاں مسلمان حاکموں اور عرب دنیا کے بعض

بڑوں کو ''مفتیِ دیں'' کہہ کر ان کی مصلحت پسندی کو حکمت کا نام دینے پر بھی طنز کیا اور اسے ایک طرح سے جارح کی تائید قرار دیا۔ کہتے ہیں:

اب رسمِ ستم حکمتِ خاصانِ زمیں ہے
تائیدِ ستم مصلحتِ مفتیِ دیں ہے

ان کے علاوہ کئی شعرا نے فلسطینیوں کے لیے آواز بلند کی، مثلاً احمد ندیم قاسمی، حبیب جالب، نعیم صدیقی، ابنِ انشاء، ظہیر کاشمیری، ضمیر جعفری، احمد فراز، ادا جعفری، شہزاد احمد، محمود شام، یوسف ظفر، خار غزنوی، اصغر ندیم سید اور دیگر کے شعرا نے مسجدِ اقصیٰ کی پامالی، معصوم بچوں کی شہادت اور مسلمان حکم رانوں کے زبانی جمع خرچ پر بہت پُر تاثیر نظمیں لکھیں۔ انشا کی ایک نظم دیوارِ گریہ سے چند مصرعے ملاحظہ کریں جن میں ہنوئی (یعنی ویت نام) کی علامت کے ذریعے اپنے عرب بھائیوں کو پیغام دیا گیا ہے کہ ہمت نہ ہارنا، ویت نامی بھی بیس سال سے امریکا سے لڑ رہے ہیں:

یا اخی یا اخی
آدکھائیں تجھے تیری دل جوئی کو
دور مشرق میں احرارِ ہنّوئی کو
ان کا دشمن شکستوں سے بے حال ہے
ان کو لڑتے ہوئے بیسواں سال ہے

اردو نثر میں فلسطین

اردو نثر میں بھی فلسطین کا مسئلہ اور اہلِ فلسطین کی حالتِ زار کا ذکر ملتا ہے۔ مثلاً انتظار حسین یوں تو جدیدیت کے حامی ہیں لیکن فلسطین کا ذکر کرتے ہیں، گو اپنے اساطیری یا داستانی انداز میں علامات اور کنایات کی مدد سے ہی سہی۔ انتظار صاحب کا افسانہ '' کانا دجال'' دراصل اسرائیلی فوجی جرنیل موشے دایان کی علامت ہے۔ موشے دایان نے عرب اسرائیل جنگ میں مسلمانوں کو بہت نقصان پہنچایا تھا اور روایت کے مطابق کانا دجال

ایک فتنہ ہے۔ افسانے کا اختتام کچھ یوں ہوتا ہے کہ پورا گھر جو عرب اسرائیل جنگ کی خبروں اور مسلمانوں کی فتح اور بیت المقدس کی آزادی کا منظر ہے اور اباجان پوچھتے ہیں کہ کیا ہوا۔ لیکن جب خبر آتی ہے کہ مسلمانوں نے ہتھیار ڈال دیے تو اباجان کا سر شرم سے جھک جاتا ہے۔ اس موضوع پر انتظار حسین کا دوسرا افسانہ ”شرم الحرم“ ہے جس کے کردار دو صحافی ہیں جو ریڈیو قاہرہ سے خبریں سن کر ان کا انگریزی ترجمہ کرتے ہیں۔ لیکن یروشلم کے سقوط کی خبر پر ایک کردار گریہ کرتا ہے اور اپنا عمامہ زمین پر پھینک دیتا ہے۔ عمامہ جو عرب دنیا میں عزت کی علامت ہے خاک میں گرنا اس ذلت اور شکست کی علامت ہے جو عربوں کو اسرائیل کے ہاتھوں اٹھانی پڑی۔ اس میں بھی موشے دایان اور اس کے کانا دجال ہونے کا ذکر ہے۔ اس افسانے میں انتظار حسین نے مسلمانوں پر طنز بھی کیا ہے کہ جس طرح دجال کا خاتمہ کرنے کے لیے عیسیٰ علیہ السلام تشریف لائیں گے اسی طرح مسلمان بھی موشے دایان کے خاتمے کے لیے کسی معجزے کے منتظر ہیں۔ جن لکھنے والوں نے اردو افسانے میں فلسطین کو موضوع بنایا ان میں قرۃ العین حیدر، قدرت اللہ شہاب، مظہر الاسلام، سمیع آہوجہ، خالد سہیل، انور خواجہ، جمیل احمد عدیل، وغیرہ شامل ہیں۔ یہاں تفصیل دینا ممکن نہیں۔

اردو سفرنامے کو دیکھیں تو قدرت اللہ شہاب اور مستنصر حسین تارڑ نے اس موضوع پر اپنے سفرنامے میں اظہار خیال کیا ہے۔ اردو میں تراجم کی روایت اس لحاظ سے بھرپور ہے کہ اس میں مختلف اور متنوع موضوعات قاری کے ذہن کو وسعت بخشتے ہیں اور ان موضوعات میں فلسطین بھی شامل ہے۔ جن مترجمین نے فلسطینی ادب سے فکشن کے تراجم کیے ان میں محمد حمید شاہد، آصف فرخی، امجد طفیل، مسعود اشعر، کشور ناہید وغیرہ شامل ہیں۔ فلسطینی شاعری کے تراجم میں محمد کاظم نے اپنا کمال دکھایا۔ ان کے علاوہ کشور ناہید، امجد اسلام امجد، انور زاہدی، اسما رشید، منو بھائی اور بعض دیگر لکھنے والوں نے فلسطینی شاعری اور اس کے ذریعے اہلِ فلسطین کے خیالات اور جذبات ہم تک پہنچائے۔

* * * * *

صوفی جمیل الرحمٰن عباسی
ناظمِ شعبۂ تحقیق و تصنیف، فقہ اکیڈمی

مسئلۂ فلسطین کلامِ اقبال کی روشنی میں

اقبال نے شاعر کو قوم کے لیے دیدۂ بینا قرار دیا ہے۔ اس حیثیت سے علامہ نے ہمارے جسدِ ملّی کے گھاؤ ''مسئلۂ فلسطین'' کا درد محسوس کر کے اپنی شاعری میں اس حادثے کے اسباب و علاج پر کلام کیا ہے۔ اگرچہ یہ حادثہ ایک خاص تاریخ کو پیش آیا لیکن ہر حادثے کی طرح وقت نے برسوں اس کی پرورش کی تھی اور ہم زوال کی اس کھائی میں گرنے کے لیے گویا تیار بیٹھے تھے:

شیاطینِ مُلوکیّت کی آنکھوں میں ہے وہ جادو
کہ خود نخچیر کے دل میں ہو پیدا ذوقِ نخچیری

ذوقِ نخچیری سے سرشار، شکار بننے کے لیے بے تاب عالَمِ اسلام ایک بے بال و پر کبوتر کی طرح ''تھا اور ہے'' جسے بڑی شان سے ''تل بھون'' کر تھالی میں سجا دیا گیا ہو اور ''مہذب یورپ'' اس کی تکا بوٹی کرنے کو تیار! یہ صورتِ حال ایک حدیثِ مبارکہ میں بیان کی گئی: ''قریب ہے قومیں تمھارے خلاف یوں ایک دوسرے کو دعوت دیں گی جیسے کھانے والے ایک دوسرے کو تھالی کی طرف بلاتے ہیں''۔

علامہ نے ہماری یہ کیفیت اپنی نظم ابوالعلاء مَعَرّی میں بیان کیا ہے۔ جب مَعَرّی کو بھنا ہوا مرغ، رکابی میں رکھ کر پیش کیا گیا تو، چونکہ وہ ہمارے ''مہذب یورپیوں'' سے زیادہ مہذب تھا تو اس نے اپنے اعلانیہ اصول ''ممانعتِ گوشت'' کی پابندی کرتے ہوئے اسے کھانے سے انکار کیا اور یوں مخاطب ہوا:

افسوس، صد افسوس کہ شاہیں نہ بنا تُو
دیکھے نہ تری آنکھ نے فطرت کے اشارات

تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے
ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

مسلمان کبوتر کی طرح فطرت کے اشاروں کے ساتھ تاریخ و شریعت کو بھی بھول بیٹھے کہ جب ہم طاقت ور تھے تو بیت المقدس کی چابیاں دست بدست ہمیں پیش کی گئی تھیں اور پھر جب ہم نے شریعت کا جنگی قوت مہیا رکھنے اور اللہ کے دشمنوں کو ڈرائے رکھنے کا حکم ٹال دیا تو ضعف کے سبب غیروں کی تُرکتازیوں کا شکار ہو گئے۔ نظم ''غرۂ شوال یا ہلالِ عید'' (۱۹۱۲ء) میں بھی علامہ نے ہماری زبوں حالی کا نوحہ کیا ہے:

سازِ عشرت کی صدا مغرب کے ایوانوں میں سن
اور ایراں میں ذرا ماتم کی تیاری بھی دیکھ
چاک کر دی ترکِ ناداں نے خلافت کی قبا
سادگی مسلم کی دیکھ، اوروں کی عیاری بھی دیکھ

پہلے شعر میں یورپ کی معیشت اور صنعت و حرفت کی ریل پیل کا ذکر ہے اور ایران کی صفتِ ماتم سے مراد اس کا سیاسی انتشار، بے سروسامانی اور اقوامِ مغرب کے ہاتھوں شکست و ریخت ہے۔ یاد رہے کہ یہ وہ زمانہ تھا جب محمد علی شاہ قاچاری کی حکومت کے خاتمے (۱۹۰۹ء) کے بعد عدم استحکام کے شکار ایران کے کچھ علاقوں پر برطانیہ و روس نے قبضہ کر لیا تھا جو ۱۹۲۵ء تک چلتا رہا۔

دوسرے شعر میں خلافت کی منسوخی کا ذکر ہے جو اگرچہ ۱۹۲۴ء میں کمال اتاترک کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ لیکن اس کی شروعات ۱۹۰۹ء میں، آخری بااختیار عثمانی خلیفہ سلطان عبدالحمید ثانی کی معزولی سے ہو چکی تھی۔ اقبال نے یہ کام کرنے والوں کو نادان قرار دیا کہ انھوں نے خاتمہ خلافت کی بنیاد رکھ کر اسلامی وحدت کا خاتمہ کر دیا۔ عیاری سے مراد عالمی صیہونی تنظیم، یہودی فرقہ دونمہ اور عالمی طاقتوں مثلاً فرانس اور برطانیہ کی سازشیں ہیں جو انھوں نے سلطان عبدالحمید خان کے خلاف کی تھیں کیونکہ وہ فلسطین میں یہودی آبادکاری کے سخت خلاف تھے اور سادگی مسلمانوں مثلاً ارکانِ انجمنِ اتحاد و ترقی وغیرہ کے اس عالمی سازش کا حصہ بننے کو کہا گیا ہے۔

اس ضرر رساں سادگی میں عرب بھی کچھ پیچھے نہ تھے جب انھوں نے پہلی جنگِ عظیم (۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۸ء) میں خلافتِ عثمانیہ سے بغاوت کرتے ہوئے اتحادیوں کے ستونِ اعظم برطانیہ سے معاہدے کیے۔ ایک طرف شریفِ مکہ حسین بن علی الہاشمی نے برطانیہ کے ساتھ دوستی کی۔ اس کی فوجیں نہ صرف عرب میں ترکوں کے خلاف لڑیں بلکہ شام کے محاذ پر بھی باغی عربوں نے ترکوں کے خلاف انگریزوں کے شانہ بشانہ جنگ لڑی۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ شریفِ مکہ کا تعلق مشہور تاریخی اسلامی خانوادے بنوہاشم سے تھا چنانچہ اقبال نے اس کی مذمت میں یہ شعر کہا:

بیچتا ہے ہاشمی ناموسِ دینِ مصطفیٰ
خاک وخوں میں مل رہا ہے ترکمانِ سخت کوش

اسی نام نہاد شریف کے بیٹے کا ذکر، سنوسی تحریک کے تیسرے مجاہد راہنما ادریس السنوسی کے پیغام کے حوالے سے اقبال نے کیا ہے:

کیا خوب امیرِ فیصل کو سَنّوسی نے پیغام دیا
تو نام ونسب کا حجازی ہے پر دل کا حجازی بن نہ سکا

سادگی کی ایک مثال آلِ سعود ہیں جو اگرچہ ایک عرصے سے عثمانیوں کے خلاف برسرِپیکار اور آمادۂ بغاوت تھے لیکن جب امیرِ نجد ملک عبدالعزیز آلِ سعود نے ۲۶، دسمبر ۱۹۱۵ء کو حکومتِ برطانیہ کے ساتھ 'سر پَرَ کسی کا کس' کے ذریعے ''معاہدۂ دارین'' کیا تو اس سے علاقے میں انگریزوں کے مفادات کے تحفظ اور عثمانیوں کے مفادات کے ضیاع کے ساتھ عرب ترک خلیج میں فیصلہ کن اضافہ ہوا۔ عربوں اور ترکوں کی باہمی عداوت کا تجزیہ اقبال نے بہت خوبصورتی کے ساتھ اپنی نظم دامِ تہذیب (ضربِ کلیم) میں بیان کیا ہے:

اقبال کو شک اس کی شرافت میں نہیں ہے
ہر ملتِ مظلوم کا یورپ ہے خریدار

اس شعر میں اقبال نے طنزیہ انداز میں یورپ کی مزعومہ شرافت کا ذکر کیا ہے کہ جس نے عربوں کو مظلومیت کی پٹی پڑھا کر ترکوں کے خلاف کیا۔ لفظِ خریدار کے استعمال سے علامہ نے اشارہ کیا کہ ہمدردی جتلا کر پھوٹ

پیدا کرنا یورپ کی اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے ایک چال ہوتی ہے۔

یہ پیرِ کلیسا کی کرامت ہے کہ اس نے
بجلی کے چراغوں سے منور کیے افکار

عیسائیت نے عالمِ اسلام کو مغرب کی ٹیکنالوجی کی مدد سے مفتوح کر کے نظریاتی و علمی طور پر مغلوب کیا۔ ''بجلی کے چراغ'' میں جدید ذرائعِ ابلاغ کی طرف اشارت کے ساتھ یہ بھی ہے کہ ان کے افکار کی روشنی حقیقی نہیں بلکہ ان کی تہذیب ''جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری'' ہے۔

جلتا ہے مگر شام و فلسطیں پہ مرا دل
تدبیر سے کھلتا نہیں یہ عقدۂ دشوار

شاعر نے یہاں شام و فلسطین کے حالات پر اپنے دلی رنج و غم کے ساتھ اعتراف کیا ہے کہ یہ ایسا پیچیدہ معاملہ ہے کہ اس کے حل کی کوئی تدبیر عقل میں نہیں آتی۔ کمزور فریق مسلمان اپنی سچی عقیدت اور یہود اپنی طاقت کے سبب اس خطے سے دست بردار ہونے کو تیار نہیں تو اب انسانی تدبیر کی سطح پر اس کا حل سمجھ نہیں آتا، ہاں آسمانی تدبیر یا خدائی تقدیر کے مطابق ہی یہ قضیہ مسلمانوں کی فتح پر منتج ہو کر حل ہو گا جیسا کہ احادیث میں اس کی اخبار موجود ہیں۔

ترکانِ جفا پیشہ کے پنجے سے نکل کر
بیچارے ہیں تہذیب کے پھندے میں گرفتار

یعنی عرب بغاوت کرتے ہوئے اپنے تئیں ترکوں کے مزعومہ ظلم و ستم سے تو آزاد ہوئے لیکن یورپی اقوام کے غلام بن بیٹھے جنھوں نے انھیں ایسی تہذیب سے روشناس کرایا کہ سیاسی اور ثقافتی ہر دو اعتبار سے وہ مبتلائے آزار ہو گئے۔ عربوں کی گرفتاریِ تہذیب و تعذیب کو علامہ نے نظم یورپ اور سوریا (ضربِ کلیم) میں بیان کیا:

فرنگیوں کو عطا خاکِ سوریا نے کیا
نبیِّ عفت و غم خواری و کم آزاری

سوریا یعنی بلادِ شام پیغمبروں کی سرزمین تھی۔ نبی عفت سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں جن کے شاگردوں کے ذریعے یورپ آسمانی ہدایت سے واقف ہوا۔ حضرت کی تعلیمات میں ہمدردی اور ایذا رسانی سے بچنے پر بہت زور تھا۔ لیکن یورپ ان صفات سے محروم رہا۔

صلہ فرنگ سے آیا ہے سوریا کے لیے
مے و قمار و ہجومِ زنانِ بازاری

اس احسان کا یورپ نے یہ صلہ دیا کہ اس نے بے رحمی اور قتل و غارت گری سے اس علاقے پر قبضہ کیا اور یہاں بے دینی، جوا، جسم فروشی اور شراب نوشی کو فروغ دیا۔

اگلے دو اشعار میں جنگِ عظیم اول کے بعد کی صورتِ حال کا ذکر ہے۔ جب ترکوں کی شکست کے بعد شام فرانس اور فلسطین برطانیہ کو دے دیا گیا:

رِندانِ فرانسیس کا مے خانہ سلامت
پُر ہے مے گل رنگ سے ہر شیشہ حلَب کا

مطلب یہ کہ فرانسیسی شراب خوروں کو سلامتی (فتح) ملی تو انھوں نے (شام اور اس کے شہر) حلب پر قبضہ جما لیا۔ یہ شہر جو کبھی شیشہ سازی میں مشہور تھا۔ تو فرانسیسی قابضین نے اس صنعت (اور دوسرے وسائل) پر قبضہ جما کر انھیں اپنی خراباتی تہذیب کے فروغ کے لیے استعمال کیا۔

۱۹۱۷ء میں برطانیہ نے بال فور ڈیکلریشن جاری کیا جس کی رو سے فلسطین میں یہودی قومی ریاست کا قیام عمل میں لایا جانا تھا۔ اس کے بعد تیس سال یہ علاقے فرنگی تسلط میں رہے جس کے تحت یہاں یہودی آباد کاری جاری رکھی گئی۔ اس کی دلیل یہ دی جاتی تھی کہ کسی دور میں یہاں یہودی آباد رہے ہیں تو اگلے شعر میں علامہ نے اس بھونڈی دلیل کا الزامی جواب یہ دیا کہ:

ہے خاکِ فلسطیں پہ یہودی کا اگر حق
ہسپانیہ پر حق نہیں کیوں اہلِ عرب کا

مطلب یہ کہ اگر یہ اصول ہے کہ کوئی قوم کسی علاقے کو فتح کر لے تو ہمیشہ کے لیے اس کا ہو جاتا ہے تو اس اصول کی رو سے تو ہسپانیہ (سابقہ اندلس) مسلمانوں کو ملنا چاہیے کہ انھوں نے کم و بیش آٹھ سو سال یہاں حکومت کی تھی لیکن تم نے مسلمانوں سے اندلس لے کر عیسائیوں کو دے دیا۔ اس کا مطلب ہے کہ تم اس اصول کو نہیں مانتے بلکہ ایک بہانے کے طور پر اسے استعمال کرتے ہو اور تم دہرا معیار رکھتے ہو۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ فرنگی قبضے کی وجہ اقتصادی ہے لیکن علامہ کے خیال میں ان کے قبضے کی یہ وجہ نہیں ہے بلکہ اصل وجہ کچھ اور ہے:

مقصد ہے ملوکیتِ اِنگلیس کا کچھ اور
قصہ نہیں نارنج کا یا شہد و رطب کا

اِنگلیس یعنی انگریز کے شام پر قبضے کی وجہ کچھ اور ہے۔ نارنگی، شہد اور کھجور وغیرہ ان کے قبضے کی وجہ نہیں ہیں۔ بلکہ اس کی وجہ مذہبی ہے۔ اور وہ یہودیوں کا آلۂ کار بن کر ان کے مذہبی مقصد ''عظیم صہیونی ریاست کی تشکیل'' کو پورا کرنا چاہتے ہیں۔

علامہ نے اپنی نظم ''فلسطینی عرب سے'' میں اس مسئلے کے حل کی طرف اشارے کیے ہیں:

زمانہ اب بھی نہیں جس کے سوز سے فارغ
میں جانتا ہوں وہ آتش ترے وجود میں ہے

علامہ عربوں میں ان کی روایتی جولانی اور جوش و ولولے کی موجودگی کا اقرار کرتے ہوئے اس کو استعمال میں لانے کی طرف اشارا کر رہے ہیں۔

تری دوا نہ جنیوا میں ہے، نہ لندن میں
فرنگ کی رگِ جاں پنجۂ یہود میں ہے

جنیوا، اشارہ ہے اقوامِ متحدہ (انجمنِ اقوامِ عالم) کی طرف اور لندن اشارہ ہے مغربی حکومتوں کی طرف۔ جبکہ رگِ جاں سے مراد یورپ و امریکہ کی سیاست یا معیشت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان ملکوں کی سیاست اور انتظامی عہدوں کے علاوہ صنعت و حرفت اور خصوصاً عالمی مالیاتی نظام پر یہودی قابض ہیں۔ اس لیے کوئی

ملک و ادارہ یہاں تک کہ اقوامِ متحدہ بھی اسرائیل کے مفادات کے خلاف جانے کا خطرہ مول نہیں لیتا۔ اس لیے ان حکومتوں اور اداروں سے امید رکھنا کہ وہ ہمارے مسائل اور خصوصاً مسئلۂ فلسطین حل کرائیں گی ایک بھولپن کے سوا کچھ نہیں۔ پس چاہیے کہ اپنی خودداری اور اپنے جذبۂ ایمانی سے کام لیتے ہوئے ذاتی کوششوں سے اپنے مسائل حل کرنے کی طرف توجہ کی جائے۔

سُنا ہے میں نے غلامی سے اُمتوں کی نجات
خودی کی پرورش و لذّتِ نمود میں ہے

علامہ اس شعر میں ملتِ اسلامیہ کو مغرب اور یہود کی غلامی سے نکلنے کا طریقہ بتاتے ہیں جس کے دو حصے ہیں: پہلا علمی وفکری یعنی خودی کی پرورش ہے۔ یعنی انسان اپنے نظریے و ایمان کو مضبوط رکھے۔ اپنے مقصدِ تخلیق، کائنات میں اپنے مقام، اپنی صلاحیتوں اور ذمے داریوں سے واقفیت حاصل کرے۔ دوسرا کام جو عملی نوعیت کا ہے وہ "لذتِ نمود" (اظہار کی لذت) ہے۔ اس سے اپنی ایمانی و مادی صلاحیتوں کو بروے کار لانا مراد ہے۔ یعنی اپنی ذمے داریوں کی ادائی کو صرف آرزؤں اور تمناؤں تک محدود نہ رکھا جائے بلکہ ان کو عمل میں لایا جائے۔ نظریے کو زیرِ عمل لانا علامہ اقبال کے ہاں ایک بڑا تصور ہے جو ان کے کلام میں جابجا دیکھا جا سکتا ہے، مثلاً:

یہ گھڑی محشر کی ہے تو عرصۂ محشر میں ہے
پیش کر غافل عمل کوئی اگر دفتر میں ہے
ندرتِ فکر و عمل کیا شے ہے ذوقِ انقلاب
ندرتِ فکر و عمل کیا شے ہے، مِلّت کا شباب

بہر حال اس مختصر نظم کا سبق یہ ہے کہ اقوام متحدہ میں قرار دادیں پیش کرنے سے اور مغربی طاقتوں کو درخواستیں پیش کرنے سے مسئلۂ فلسطین و شام حل نہ ہو گا بلکہ اس کے لیے اسلامی اصول و نظریے کے تحت جدوجہد اور جہاد کرنا ہو گا۔

چونکہ یہ جہاد اتحاد کے بغیر ممکن نہیں اس لیے علامہ نے جابجا اس طرف متوجہ کیا ہے۔ ہم جاوید نامہ

کی نظم دین ووطن کے ابتدائی دو شعر پیش کر کے اپنی بات کو مکمل کرتے ہیں:

لُردِ مغرب آن سراپا مکر و فن
اہلِ دیں را داد تعلیمِ وطن
او بفکرِ مرکز و تو در نفاق
بگزر از شام و فلسطین و عراق

یعنی مغرب کے لارڈ جو سراپا مکر و فریب ہیں، انھوں نے مسلمانوں کو وطنیت کی تعلیم دی جس کے نتیجے میں مسلمان باہم پھٹے ہوئے ہیں جبکہ خود یورپ باہم متحد ہے جیسا کہ یورپی یونین اور نیٹو وغیرہ۔ تو اقبال کہتے ہیں کہ اے مسلمانو! اب تم بھی اپنے اپنے ملکوں مثلاً شام و فلسطین و عراق سے آگے بڑھو اور امت کے نام پر باہم اتحاد پیدا کرو۔ حقیقت یہ ہے کہ "اسلامی دولتِ مشترکہ" یا "مسلم یونین" کی جتنی ضرورت اقبال کے دور میں تھی آج اس سے کئی گنا بڑھ چکی ہے۔ لیکن اس کے لیے تنظیمی ہیئت سے زیادہ فکری وحدت کی ضرورت ہے۔ اللہ ہمیں سمجھ و عمل کی توفیق عطا کرے۔

* * * * *

فیض احمد فیضؔ

سرِ وادیِ سینا

پھر برق فروزاں ہے سرِ وادیِ سینا
پھر رنگ پہ ہے شعلۂ رخسار حقیقت
پیغامِ اجل دعوتِ دیدار حقیقت
اے دیدۂ بینا
اب وقت ہے دیدار کا دم ہے کہ نہیں ہے
اب قاتلِ جاں چارہ گرِ کلفتِ غم ہے
گلزارِ ارم پرتوِ صحرائے عدم ہے
پندارِ جنوں
حوصلۂ راہِ عدم ہے کہ نہیں ہے
پھر برق فروزاں ہے سرِ وادیِ سینا، اے دیدۂ بینا
پھر دل کو مصفا کرو، اس لوح پہ شاید
مابینِ من و تو نیا پیماں کوئی اترے
اب رسمِ ستم حکمتِ خاصانِ زمیں ہے
تائیدِ ستم مصلحتِ مفتیِ دیں ہے
اب صدیوں کے اقرارِ اطاعت کو بدلنے
لازم ہے کہ انکار کا فرماں کوئی اترے

*****

وسعت اللہ خان

فلسطین اور لاتوں کے بھوت

انتیس نومبر کو اقوامِ متحدہ کے تحت فلسطینیوں سے یکجہتی کا عالمی دن منایا جا رہا ہے۔ یہ فیصلہ اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی نے انیس سو ستتر میں کیا۔ عجیب بات ہے کہ اسی جنرل اسمبلی نے انتیس نومبر انیس سو سینتالیس کو فلسطین کی دو حصوں میں تقسیم کی قرار داد بھی منظور کی تھی جو اس المیے کا پیش خیمہ بنی جس نے اب تک فلسطین کی چار نسلیں نگل لیں اور لاکھوں کو در بدر کر دیا۔ اس اعتبار سے انتیس نومبر کا دن یومِ یکجہتیِ فلسطین کہلانا عجیب سا بھی لگتا ہے اور انشاء اللہ خان انشؔا کا یہ مصرع بھی یاد آتا ہے کہ: ”وہی ذبح بھی کرے ہے، وہی لے ثواب الٹا“۔ اس دن کی مناسبت سے کہنے کو بے شمار باتیں ہیں مگر فوری المیہ سات اکتوبر کو جنوبی اسرائیل میں حماس کی کارروائی کے بعد سے اس تاثر کا پھیلایا جانا ہے کہ جیسے چھے اکتوبر تک سب بھلا چنگا تھا اور اگلے دن اچانک سے حماس کو کسی باولے کتے نے کاٹ لیا۔ یہی بات اقوامِ متحدہ کے سیکریٹری جنرل انتونیو گوتریس کے منھ سے نکل گئی کہ جو کچھ ہو رہا ہے، وہ خلا میں نہیں ہوا بلکہ اس کا ایک پس منظر ہے تو اسرائیل نے سیکریٹری جنرل کو ہی اس عہدے کے لیے نااہل قرار دینے کا فتویٰ دے دیا۔

فلسطینیوں کی جدوجہد نے گزشتہ ایک صدی میں عزالدین قسام سے یاسر عرفات تک کئی تاریخ ساز رہنما پیدا کیے، مگر سات اکتوبر کی مناسبت سے اب تک دو ہی نام سامنے آئے ہیں جنھیں اسرائیلی پہلی فرصت میں مٹا دینا چاہتے ہیں۔ حماس کے عسکری بازو کے سربراہ محمد زیاف جن کی اہلیہ، تین سالہ بچی اور نوزائیدہ بیٹا اسرائیل کے گزشتہ حملوں میں جاں بحق ہوئے۔ جبکہ حماس کے سیاسی بازو کے سربراہ اور غزہ میں مقیم سب سے اہم رہنما یحییٰ السنوار، انھوں نے انیس سو اٹھاسی تا دو ہزار گیارہ تئیس برس اسرائیلی جیلوں میں گزارے۔ ان کا بچپن خان یونس کے پناہ گزین کیمپ میں گزرا۔ ان کے دادا اور والد کو خاندان سمیت اشقلیہ کے اس گاؤں سے ۱۹۴۸ء کے

نکبہ کے دوران مسلح اسرائیلی جتھوں نے کھدیڑا تھا، جہاں سمندر پار سے لا کر یہودی آبادکاروں کو بسایا گیا۔ یہ گاؤں غزہ کی خاردار باڑ کے پیچھے سے صاف صاف دیکھا جا سکتا ہے۔ اس پس منظر کو بھوگنے کے سبب ہی محمد زیاف اور یحییٰ السنوار اور ان جیسے سیکڑوں ہزاروں فلسطینی اس نتیجے پر پہنچے کہ یہ ممکن ہی نہیں کہ لاتوں کے بھوت باتوں سے مان جائیں۔ جس ریاست کی بنیاد فلسطینیوں کی لاشوں پر رکھی گئی اسے عدم تشدد کی افادیت پر محض دلائل سے قائل نہیں کیا جا سکتا۔ ہو سکتا ہے کہ کل کلاں محمد زیاف اور یحییٰ السنوار بھی اسرائیل کے ہاتھوں قتل ہو جائیں۔ تاہم فلسطینی مزاحمتی تحریک کسی ایک یا دو تین شخصیات کے گرد گھومتی تو کبھی کی ختم ہو چکی ہوتی۔ مگر اسرائیل کا تاریخی و نسلی احساسِ جرم اس تحریک کے لیے کھاد اور اپنوں اور غیروں کی بین الاقوامی بے حسی اس درخت کے لیے آب ہے۔ پچھلی ایک صدی میں اس تحریک کے پتے کتنی بار جھاڑے جا چکے ہیں۔ شاخیں اور تنا کئی بار کٹ چکا ہے۔ مگر اس درخت کی جڑیں اپنی ہی زمین میں کم بخت اتنی پیوست اور صدیوں پر پھیلی ہوئی ہیں کہ ہر نئے حملے کے بعد پہلے سے بھی زیادہ برگ و بار آ جاتا ہے۔ جس گروہ کو مسلسل ایک صدی سے تابڑ توڑ حملوں کا سامنا ہو اور جسے اپنی نسلی بقا کے لالے پڑے ہوں، بھلا اس سے زیادہ امن کون چاہے گا۔

یہ سیاست کا فطری اصول ہے کہ اگر امن و آشتی کی بات کرنے والی اوّلین قیادت کی تکلیف دھیان سے سننے کے بجائے اس قیادت کو ہی ختم کر دیا جائے تو اس کی جگہ لینے والی قیادت کم لچکدار ہوتی ہے۔ اور اگر اس سے بھی معاملات شرافت سے طے نہ ہوں تو پھر اس قیادت کی جگہ لینے والے پہلے سے زیادہ انتہا پسند ہوتے ہیں۔ کل تک اسرائیل یاسر عرفات کو دہشت گرد سمجھتا تھا۔ آج ان کی جگہ زیادہ سخت گیر حماس نے لے لی ہے۔ اور جب وہ نسل جوان ہو گی جس نے سات اکتوبر کے بعد سے اپنے اردگرد اپنے ہم عمروں کی لاشوں کے انبار دیکھ لیے ہیں تو وہ نسل اتنی انتہا پسند ہو گی کہ اسرائیل آج کی حماس کو ایک اعتدال پسند تنظیم سمجھ کر وقت ہاتھ سے نکلنے پر کفِ افسوس ملتا نظر آئے گا۔ چونکہ اسرائیل خود دہشت گردی کے خمیر سے اٹھا ہے، اس لیے تمام تر طاقت و ذہانت کے باوجود اسے حریف کے ہاتھ میں شاخِ زیتون نظر نہیں آ سکتی۔ پی ایل او نے انیس سو بانوے میں بندوق رکھ کے جو شاخِ زیتون لہرائی، اسے اسرائیل نے کمزوری جانا اور نتیجہ سب کے سامنے ہے۔ بقول ابراہام ماسلو: ”جب ہاتھ میں بس ہتھوڑا ہو تو ہر مسئلہ کیل نظر آتا ہے“۔ غزہ میں حماس کے رہنما یحییٰ السنوار جنھیں

امریکا نے دو ہزار پندرہ میں عالمی دہشت گردوں کی فہرست میں ڈال دیا اور اسرائیل بھی انھیں سات اکتوبر کی یلغار کا سرغنہ سمجھ کے ان کا سر چاہتا ہے۔ انھی یحییٰ السنوار نے اکتوبر دو ہزار اٹھارہ میں اسرائیلی اخبار 'یودھیوت آہرونوتھ' اور اطالوی اخبار 'لاری پبلیکا' کو پہلی بار کوئی انٹرویو دیتے ہوئے کہا تھا کہ: ''جنگ سے کسی کو کچھ حاصل نہ ہوگا۔ ہمیں دو ہزار سات سے جاری ناکہ بندی سے پہلے بھی مسلسل جارحیت کا سامنا تھا۔ کبھی اس کی شدت میں کمی اور کبھی تیزی آجاتی ہے۔ حماس اتنی احمق نہیں کہ اپنے سے کئی گنا طاقت ور دشمن کو جنگ کی دعوت دے۔ اگر اسرائیل ہمیں شکست دے بھی دے تو یہ شکست بھی اسرائیل کے مفاد میں نہیں ہوگی۔ ہم آخر کیوں جنگ چاہیں گے۔ ایک غلیل والا ایک ایٹمی طاقت کو کیوں للکارے گا؟ مگر وہ ہمارے ساتھ منصفانہ امن نہیں چاہتے، بلکہ ہم سے جان چھڑا کے ہماری زمین چاہتے ہیں۔ ہم نے پرامن جدوجہد کر کے بھی دیکھ لیا۔ فلسطینی اتھارٹی کے ساتھ اسرائیل نے کیا کیا۔ ان سے معاملات طے کرنے کے بجائے انھیں محتاج اور زر خرید غلام سمجھ لیا۔ خود ہم غزہ کی باڑ ختم کروانے کے لیے دو ہزار سترہ سے ہر ہفتے باڑ کے سامنے کھڑے ہو کر احتجاج کرتے ہیں مگر بدلے میں ہمیں گولیوں کی بارش، لاشیں اور زخمی ملتے ہیں۔ نتیجہ کیا نکلے گا۔ ایک جنگ ایسی ہوگی کہ علاقے کا حلیہ بدل جائے گا۔ کیا آپ یہی چاہتے ہیں''۔ اور اس انٹرویو کے پانچ برس بعد حماس نے سات اکتوبر کو اسرائیل کے تمام تر سراغ رساں نیٹ ورک کو توڑ تاڑ کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔ مگر مشکل یہ ہے کہ شکست خوردگی سے جنم لینے والی بمباری سے بس انسان ختم ہوتے ہیں تو ان کی جگہ ایک اور پیڑھی لے لیتی ہے۔ نظریہ اور ہمت ختم کرنے والا بم اب تک نہ بن سکا۔ حیف صد حیف!!

بشکریہ روزنامہ ایکسپریس

* * * * *

ماخذ: https://www.humsub.com.pk/531695/wusatullah-khan-1168/

مولانا عبدالغفور صدیقی
استاذ فقہ اکیڈمی

آزادیِ فلسطین کی جدو جہد

قیامِ حماس سے آغازِ طوفان الاقصیٰ تک

فلسطین میں اسلامی جہادی تحریکوں کا آغاز

لبنان سے انخلا اور شام سے تعلقات منقطع ہونے کے بعد فلسطینی تحریکوں میں مایوسی پیدا ہوگئی۔ اردن نے ۱۹۷۰ء میں اپنی سرزمین سے ان عسکری تنظیموں کو بے دخل کر دیا تھا۔ جبکہ دوسری جانب مصر بھی اسرائیل سے معاہدے کے بعد اپنی پالیسی تبدیل کر چکا تھا۔ ان حالات میں بعض رہنماؤں کے پُرامن تصفیے اور دو ریاستی نظریے کی وجہ سے مزید مایوسی پھیل گئی اور ان تنظیموں کی مسلح جدوجہد ماند پڑنے لگ گئی۔ دراصل ان تحریکوں کے طریقِ کار کی وجہ سے بہت پہلے سے ان کے مستقبل پر سوالیہ نشان موجود تھا۔ متعلقہ عرب ممالک کے داخلی معاملات میں مداخلت، باہمی اختلافات، فلسطین سے باہر عسکری کارروائیاں ان کے لیے انتہائی نقصان دہ ثابت ہوئیں۔ اس کے علاوہ عرب قوم پرستی، سوشلسٹ اور سیکیولر نظریات کی وجہ سے ان تنظیموں نے فکری انتشار کو جنم دیا اور بعض قائدین کا مشکوک کردار بھی ایک بڑی مصیبت تھا۔ میدانِ جنگ کے سپاہی اخلاص و وفا کے باوجود ناہموار نظریے کی وجہ سے بے یقینی کا شکار تھے۔ ان تنظیموں کی وجہ سے فلسطین سے باہر عرب ممالک میں فلسطینیوں کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا۔ عرب ممالک بھی ان تنظیموں کو اپنی باہمی کشمکش میں مفادات کے لیے خوب استعمال کرتے رہے۔ مزاحمت کے اس پورے دور میں ایک ایسی اسلامی تحریک کا خلا تھا جو اسلامی خطوط پر آزادیِ فلسطین کی جدو جہد کرے، فلسطین میں اس کی جڑیں مضبوط ہوں اور فلسطین کے اندر رہ کر یہودیوں کا مقابلہ کرے۔ کیونکہ فلسطین کے عام مسلمان نہ تو

سوشلسٹ تھے اور نہ ہی سیکیولر بلکہ عرب قوم پرستی بھی ان کے لیے ثانوی حیثیت رکھتی تھی۔ سب سے پہلے وہ راسخ العقیدہ بنیاد پرست مسلمان تھے، جن کا ایمان تھا کہ اسلام فلسطین کی شناخت ہے۔ اور وہ اپنے آبا کی قربانیوں کو بھی اسی پیرائے میں دیکھتے تھے۔ ۱۹۴۸ء تک تیس سالہ جہاد اسی عقیدے کے تحت ہی تو ہوا تھا، اس دور میں تو ہزار کوششوں کے باوجود عالمی فیصلہ ساز فلسطین کے عامتہ الناس میں کسی نیشنلسٹ یا سوشلسٹ تحریک کو پذیرائی نہ دلوا سکے تھے۔

مسجدِ اقصیٰ کے امام شیخ اسعد تمیمی ۱۹۷۰ء کے آس پاس اسلامی تحریکی فکر کا آغاز کر چکے تھے۔ وہی اسلامی جہادی تنظیموں کے قیام کے اصل محرک بھی تھے۔ ان کی اسلامی اصولوں پہ مبنی جدوجہد کی دعوت اور مقبوضہ فلسطین کے اندر یہودیوں کا مقابلہ کرنے پر اصرار کے نظریے نے الفتح کی نچلی سطح کی قیادت کو بھی شدید متاثر کیا تھا۔ شیخ یعقوب قریشی اور شیخ ابوطیر نے اس فکر کو مزید پروان چڑھایا۔ ۱۹۷۳ء میں شیخ احمد یاسین نے المجامع الإسلامية کے نام سے ایک رفاہی ادارہ قائم کر کے اس فکر کو خوب جلا بخشی۔ شیخ عبداللہ نمرود درویش نے اسی نظریے پر ۱۹۷۹ء میں اسرۃ الجہاد نامی تنظیم مقبوضہ فلسطین کے اندر قائم کی جس سے جہادی جذبات کو خوب فروغ ملا۔ (۱) اور اسی فکر پر آگے چل کر فلسطین میں دو بڑی اسلامی تحریکیں اٹھیں جو چالیس سال کے بعد آج بھی نہ صرف قائم ہیں بلکہ ظلم و جبر کی طویل تاریخ کے باوجود پہلے سے زیادہ مستحکم و منظم ہیں اور فلسطینی عوام ان کو اپنی امنگوں کی حقیقی ترجمان سمجھتے ہوئے ان کی نصرت کو اپنا شرعی اور قومی فریضہ سمجھتے ہیں۔

حركة الجهاد الإسلامي في فلسطين کا قیام

۱۹۸۱ء میں غزہ کے فتحی شقاقی نے اس تنظیم کی بنیاد رکھی۔ جبکہ نامور عالمِ دین اور اسلامی مبلغ، امام عزالدین قسام مسجد کے خطیب شیخ عبدالعزیز عودۃ اس کے روحانی پیشوا اور مربّی ٹھہرے۔ اسلامی جہاد کے

---

(۱) اگرچہ شیخ ۱۹۸۱ء میں گرفتاری اور تشدد کے بعد اپنے سابقہ نظریات کے حوالے سے کافی مضمحل ہو چکے تھے، لیکن ان کی ابتدائی دور کی دعوت اور جدوجہد اسلامی تحریکوں کے قیام میں انتہائی اہم ثابت ہوئی۔

مختصر نام سے معروف فلسطین میں یہ انتہائی دائیں بازو کی اسلامی عسکری و سیاسی تنظیم ہے۔ القدس بریگیڈ اسی تحریک کا مسلّح ونگ ہے۔ اس تنظیم کا نظریہ یہ ہے کہ دریائے اردن سے بحرِ روم تک کا پورا علاقہ فلسطین ہے۔ اس کے ایک انچ سے بھی دست برداری از روے شریعت حرام ہے۔ اس سرزمین پر صہیونی وجود باطل ہے۔ اور اس سرزمین کے کسی بھی حصے پر باطل وجود کو تسلیم کرنا حرام ہے۔ یہ تنظیم ایک آزاد اسلامی فلسطینی ریاست کے قیام پر یقین رکھتی ہے۔ یہ تنظیم اسرائیل سے ہونے والے تمام معاہدوں کو مسترد کرتی ہے۔ یہ تنظیم فلسطینی اتھارٹی PNA کے قیام کو اسرائیلی سازش اور فلسطینی پارلیمینٹ میں شرکت کو ناجائز سمجھتی ہے۔ یہ اخوانی فکر سے متاثر ہے لیکن اپنے فیصلوں اور پالیسیوں میں خود مختار ہے۔ امریکہ اسرائیل اور تمام یورپی ممالک نے اس تنظیم کو دہشت گرد کو قرار دیا ہے۔

حماس کا قیام

پہلی انتفاضہ کے دوران اہلِ عزیمت کی ایک تنظیم حركة المقاومة الإسلامية في فلسطين (حماس) کے نام سے فلسطین میں قائم ہوئی۔ فلسطین کے باہمت عالمِ دین شیخ احمد یاسین اس کے روحانی پیشوا اور بانی تھے۔ شیخ عبد العزیز رنتیسی اور شیخ محمود الزہار بھی اس کے بانیوں میں سے ہیں۔ یہ تنظیم الاخوان المسلمون سے نظریاتی وابستگی رکھتی ہے اور شیخ عزالدین قسام رحمۃ اللہ علیہ کی تحریکِ جہاد کو اپنی جدوجہد کا منہج سمجھتی ہے۔ تحریکِ حماس فلسطین کی آزادی کو قرآنی وعدہ سمجھتے ہوئے اس کے لیے پر عزم ہے۔ حماس کے نزدیک جہاد کا مقصد اسلامی مملکت کا قیام ہے۔ اور یہ نہر سے بحر تک کے اسلامی فلسطین کو اپنی منزل قرار دیتی ہے۔ یہ تنظیم ۱۹۶۷ء کی سرحدوں کو قبول نہیں کرتی بلکہ عارضی جنگ بندی لائن قرار دیتی ہے۔ یہ تنظیم فلسطینی عوام کے مفاد کے لیے فلسطینی قومی اتھارٹی سے تعاون کرتی ہے اور انتخابات میں بھی شریک ہوتی ہے۔ اسرائیل سے ہونے والے تمام معاہدوں کو حماس مسترد کرتی ہے۔ اسرائیل امریکہ اور یورپی ممالک نے اس تنظیم کو بھی دہشت گرد قرار دیا ہے، اس تنظیم کے تحت کئی رفاہی اور سماجی شعبے بھی قائم ہیں۔

پہلی انتفاضہ: الانتفاضۃ الحجارۃ (۱۹۸۷۔ ۱۹۹۳ء)

جدوجہدِ آزادی کی تاریخ میں اپنی نوعیت کی یہ منفرد عوامی تحریک دسمبر ۱۹۸۷ء میں غزہ سے شروع ہوئی جب ایک اسرائیلی فوجی نے ٹرک کے ذریعے ایک کار میں سوار چار نہتے فلسطینیوں کو کچل کر شہید کر دیا۔ اس بربریت میں سات فلسطینی شدید زخمی بھی ہوئے۔ شہدا کے جنازوں کے ساتھ اس واقعے پر احتجاج شروع ہوا جو بہت جلد پورے غزہ میں پھیل گیا۔ اسرائیلی فوجیوں نے نہتے مظاہرین پر براہِ راست گولیاں برسائیں جس سے صورتِ حال مزید گمبھیر ہوگئی اور دیکھتے ہی دیکھتے تمام فلسطینی عوام نے بغاوت کر دی۔ یہ خالص عوامی تحریک تھی اور نہتے عوام کی، طاقت ور فوج کے خلاف طویل عرصے تک استقامت سے جاری رہنے والی منفرد تحریک تھی۔ یہ تحریک بغیر کسی منصوبہ بندی کے شروع ہوئی۔ فلسطینیوں نے اسرائیل میں ملازمت پر جانے سے انکار کر دیا۔ سول نافرمانی شروع ہوئی۔ فلسطینیوں نے ٹیکس کی ادائی بند کر دی اور تمام اسرائیلی مصنوعات کا بائیکاٹ کر دیا۔ اس تحریک کو دبانے کے لیے تشدد کا ہر حربہ استعمال کیا گیا۔ لیکن جس قدر تشدد بڑھتا گیا یہ تحریک بھی بے قابو ہوتی گئی۔ پتھر اس تحریک کا اہم ہتھیار رہا جس نے اسرائیلی ریاست کے چھکے چھڑا دیے۔ تکبیر و تہلیل کے نعروں سے مسلح فلسطینیوں نے نہ صرف یہودی بستیوں کو روندا بلکہ فوجی مراکز پر بھی بلاخوف و خطر چڑھ دوڑے۔ اسرائیلی پولیس تو پہلے مرحلے میں ہی ناکام ہوگئی تھی۔ جس کے بعد خصوصی دستے اور سرحدی فوج کو تمام فلسطینی علاقوں میں تعینات کیا گیا لیکن اس سے فلسطینی جذبے کو شکست نہ دی جا سکی۔ یہ تحریک ۱۹۹۳ء کے اوسلو معاہدے تک چھے سال تواتر سے جاری رہی۔ اسرائیل نے نقب کے صحرا میں اذیت ناک خصوصی جیلیں قائم کر کے ایک لاکھ سے زیادہ لوگوں کو گرفتار کیا۔ مرکزِ اطلاعاتِ فلسطین کے مطابق اس تحریک کے دوران دو ہزار کے قریب فلسطینی شہید ہوئے جن میں پانچ سو کے قریب معصوم بچے تھے۔ ستر ہزار فلسطینی اسرائیلی تشدد سے زخمی ہوئے جن میں چالیس فیصد ہمیشہ کے لیے معذور ہوئے۔ فلسطینیوں کے کئی ہزار گھروں کے علاوہ بڑے پیمانے پر کھیت کھلیان اور املاک بھی تباہ کر دی گئیں۔ دو سو کے قریب یہودی اس تحریک میں قتل ہوئے۔

فلسطینیوں کی جرأت و عزیمت

اس تحریک کے دوران فلسطینی مسلمان نوجوانوں نے تاریخ میں اپنی جرأت و عزیمت کے انمٹ نقوش ثبت کیے۔ ۱۹۸۹ء میں اسلامی جہاد کے رکن عبدالہادی غانم نے بغیر اسلحے کے حیرت انگیز طریقے سے ایک بھری بس تباہ کر دی جس میں دو کینیڈین اور ایک امریکی سمیت سترہ یہودی ہلاک ہوئے۔ ۱۹۹۰ء میں غزہ کے اندر نوجوانوں کا ایک گروہ کیل کانٹے سے لیس یہودی فوجیوں پر جھپٹ پڑا اور گردن دبوچ کر دو فوجی جہنم واصل کر دیے۔ اسی دور میں بہت سے نوجوان ایسے ہی شاہین کی طرح دشمن پر جھپٹتے ہوئے شہید ہو گئے۔ یہ فلسطینیوں کا جذبہ تھا کہ یہودیوں نے گھٹنے ٹیکتے ہوئے مغربی کنارے اور غزہ پر مسلمانوں کو خود مختاری دینے کا وعدہ کیا۔ اسی تحریک کے دوران ۱۹۸۸ء اور ۱۹۹۱ء میں تیونس کے اندر موساد نے خصوصی خفیہ آپریشن میں ابوجہاد خلیل وزیر اور صلاح خلف شہید کر دیے۔ یہ دونوں رہنما اسرائیلی ریاست کے خلاف مسلح جدوجہد کے بانی تھے۔ اس انتفاضہ نے مسئلۂ فلسطین کو چند سالوں کے سکوت کے بعد ایک بار پھر بین الاقوامی منظر نامے پر خوب نمایاں کر دیا۔

اردن کی دست برداری

جولائی ۱۹۸۸ء میں اُردن نے مغربی کنارے سے انتظامی اور قانونی طور پر علیحدگی کا باضابطہ اعلان کر دیا۔ پی ایل او کے سربراہ یاسر عرفات نے اس خلا کو پُر کرنے کے لیے فوری طور پر مشرقِ وسطیٰ میں ایک بین الاقوامی امن کانفرنس منعقد کرنے کا مطالبہ کیا۔

فلسطین کی آزادی کا اعلان

۱۵، نومبر ۱۹۸۸ء کو الجزائر کے پائن پیلس ہال میں قومی کونسل کے اجلاس کے دوران پی ایل او نے فلسطین کی آزادی کا اعلان کر دیا۔ اس اعلانِ آزادی کی بنیاد اقوامِ متحدہ کی اس قرارداد پر رکھی گئی جس میں فلسطین کو ایک عرب اور یہودی ریاست میں تقسیم کرنے کا کہا تھا۔ مغربی کنارے اور غزہ کے ساتھ ساتھ مشرقی بیت المقدس کو اس ریاست کا دار الحکومت قرار دیا گیا۔ یہ اعلانِ آزادی مشہور شاعر محمود درویش نے

لکھا اور اس پر یاسر عرفات، زیاد عبد الفتاح، سلیم الزعنون اور محمود عباس سمیت پی ایل او کے تمام رہنماؤں نے دستخط کیے، الجزائر کے فوجی بینڈ نے فلسطین کا قومی ترانہ گایا۔

بین الاقوامی ردِّعمل

امریکہ نے یہ اعلان تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اور عرفات کو نیویارک میں اقوامِ متحدہ کے اجلاس میں شرکت کی اجازت بھی نہ دی۔ مگر اسی سال جنیوا کے اجلاس میں ۱۵۰ ممالک نے پی ایل او کے حالیہ فیصلوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے ایک قرارداد کا مطالبہ کیا جس میں بین الاقوامی امن کانفرنس میں پی ایل او کی شرکت پر اصرار کیا گیا۔ ۸۴ ممالک نے اس فلسطینی ریاست کو تسلیم کر لیا جبکہ ۲۰ ممالک نے مشروط طور پر تسلیم کرنے پر رضامندی ظاہر کی۔

فلسطینی مجاہدین کا ردِّعمل

اسلامی جہاد اور حماس نے پی ایل او کی جانب سے ایسی فلسطینی ریاست کو مسترد کرتے ہوئے تمام فلسطینی سرزمین پر ایک اسلامی فلسطینی ریاست کے قیام کے لیے اپنی جدوجہد جاری رکھنے کا اعلان کیا۔ جبکہ پی ایف ایل پی سمیت دیگر تمام تنظیموں نے بھی پی ایل او کی اس آزاد ریاست کا منصوبہ مسترد کیا۔

فلسطین اسرائیل مذاکرات: میڈرڈ سے اوسلو تک

کویت کے مسئلے پر شروع ہونے والی عراق اور عرب امریکہ جنگ ختم ہوتے ہی امریکی صدر جارج بش سینیر کی خواہش پر ۳۰، اکتوبر ۱۹۹۱ء کو ایک کثیر الجہتی امن کانفرنس میڈرڈ امن کانفرنس کے نام سے اسپین کے دارالحکومت میڈرڈ میں منعقد ہوئی جس میں امریکی صدر کے علاوہ روسی صدر گورباچوف بھی شریک ہوا۔ عرب اسرائیل تنازعے کے ساتھ ساتھ انتفاضہ کی وجہ سے فلسطین میں انتہائی کشیدہ حالات کے پیشِ نظر فلسطین اسرائیل تنازعے کو بھی اس کانفرنس کے ایجنڈے میں شامل کیا گیا۔ یاسر عرفات کی قیادت میں قائم پی ایل او نے اس کانفرنس کا خیر مقدم کیا جبکہ عام فلسطینی مسلمانوں اور تمام جہادی تحریکوں نے اس کانفرنس

کو مسترد کر دیا۔ اسرائیل نے مستقل فلسطینی وفد کے بجائے اس کانفرنس میں شرکت کے لیے اردن کے ساتھ مشترکہ فلسطینی وفد تشکیل دینے کا مطالبہ کیا جو مان لیا گیا۔ اسی طرح اسرائیلی وزیرِاعظم اسحاق شامیر نے پی ایل او کے کسی رہنما کی شرکت کے ساتھ ساتھ غزہ، مغربی کنارہ اور مشرقی یروشلم کے علاوہ کسی بھی علاقے سے تعلق رکھنے والی سیاسی شخصیت کی شرکت کو بھی یکسر مسترد کر دیا۔ اس طرح اس کانفرنس میں شرکت کے لیے جو فلسطینی وفد تشکیل دیا گیا وہ غزہ سے تعلق رکھنے والے حیدر شفیع اور بیت المقدس کے فیصل حسینی پر مشتمل تھا جو اردن کے ساتھ مشترکہ وفد کا حصہ تھے۔ یہ حضرات بظاہر پی ایل او سے سیاسی تعلق نہیں رکھتے تھے لیکن اس کانفرنس میں شرکت کے دوران تیونس میں قائم پی ایل او کے دفتر سے مستقل رابطے میں رہے۔ اس کانفرنس میں اسرائیلی وزیرِاعظم اسحاق شامیر نے فلسطین کے متعلق انتہائی ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کیا اور تمام تر حالات کی خرابی کا ذمے دار فلسطینیوں کو قرار دیا۔ اس کانفرنس کے بعد اسرائیل اور متعلقہ عرب ممالک کے درمیان واشنگٹن اور ماسکو میں مذاکرات ہوئے جو نتیجہ خیز ثابت نہ ہو سکے۔

خفیہ رابطے

امن کانفرنس کے دوران فلسطینی نمائندوں نے بھی اردن کے ساتھ مل کر اسرائیلی نمائندوں سے ملاقات کی اور تھوڑے عرصے بعد اسرائیل کے ساتھ براہِ راست، مستقل خفیہ رابطے شروع کر دیے۔ اس کانفرنس کے دوران اسرائیل کی طرف سے پی ایل او کی شدید مخالفت کو اگر بعد کے دو سالہ خفیہ مذاکرات اور اوسلو معاہدے کے تناظر میں دیکھا جائے تو یہی لگتا ہے کہ یہ اسرائیل کی طرف سے پی ایل او کو فلسطینی عوام کے درمیان قابلِ اعتبار بنانے کا ایک حربہ تھا۔ کیونکہ حقیقت یہ تھی کہ پی ایل او کے رہنما بالخصوص جناب یاسر عرفات اسرائیل سے رابطے میں تھے اور اس کانفرنس کے بعد بھی اسرائیل سے خفیہ مذاکرات ہوتے رہے۔ ۱۹۹۲ء میں صدر بُش کے بعد آنے والے صدر بل کلنٹن کی قیادت میں یہ رابطے اور مضبوط ہوئے جو آخر اوسلو معاہدے پر منتج ہوئے۔

اوسلو معاہدہ ۱۳، ستمبر ۱۹۹۳ء

یہ معاہدہ فلسطین لبریشن آرگنائزیشن (پی ایل او) اور اسرائیل کے درمیان طے پایا جس پر ۱۳، ستمبر ۱۹۹۳ء کو وائٹ ہاؤس کے صحن میں امریکی صدر کلنٹن کی موجودگی میں پی ایل او کے سربراہ یاسر عرفات اور اسرائیلی وزیرِاعظم اسحاق رابن نے دستخط کیے۔ اس معاہدے کو اوسلو کا نام اس لیے دیا گیا کہ اس سے پہلے تمام خفیہ مذاکرات ناروے کے دارالحکومت اوسلو میں ایک یہودی تھنک ٹینک کی میزبانی میں ہوئے۔ اس معاہدے کی رو سے پی ایل او نے اسرائیلی ریاست کو تسلیم کر لیا جبکہ اسرائیل نے بھی پی ایل او کو فلسطین کی واحد نمائندہ جماعت کے طور پر قبول کر لیا۔ اس معاہدے کے تحت پی ایل او نے مسلح جدوجہد کو ترک کرنے اور اپنے منشور میں موجود ایسی تمام شقوں کو حذف کرنے کا عزم کیا۔ پی ایل او نے فلسطین کے اٹھتر فیصد علاقے پر اسرائیلی ریاست کو باضابطہ تسلیم کر لیا۔ اسرائیل نے غزہ اور مغربی کنارے سے پانچ سال کے اندر اپنی افواج کے انخلا کا وعدہ کیا۔ اسرائیل نے اپنی مرکزی کونسل کے تحت غزہ اور مغربی کنارے پر فلسطینیوں کی خود مختار حکومت قائم کرنے کے حق کو تسلیم کیا اور اس کے لیے فلسطینیوں کی قانون ساز کونسل کے قیام کا بھی وعدہ کیا۔

فلسطینیوں کا ردِّ عمل

فلسطین کے عوام نے اس معاہدے کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ جہادی تحریکوں نے اس معاہدے کو سنگین غداری قرار دیتے ہوئے نئے سرے سے منظم عسکری کارروائیوں کا آغاز کر دیا۔ فلسطین کی قوم پرست اور سوشلسٹ جماعتوں نے بھی اس معاہدے کو مسترد کر دیا۔ اسرائیل کی لیبر اور لیکوڈ پارٹیوں میں بھی اس معاہدے پر شدید اختلاف ہوا۔ اسرائیلی پارلیمنٹ میں اس معاہدے پر ووٹنگ میں پچاس ووٹ اس معاہدے کی مخالفت میں ڈالے گئے جبکہ اس کے حق میں ساٹھ ووٹ دیے گئے۔ اس معاہدے میں مشرقی بیت المقدس، یہودی بستیوں اور پناہ گزینوں کی واپسی جیسے اہم مسائل کو آئندہ کے "جامع" مذاکرات پر چھوڑ دیا گیا۔ یہ معاہدہ دراصل انتفاضہ تحریک کی صورت میں فلسطینی عوام کے غیظ و غضب کو ٹھنڈا کر کے اسرائیلی ریاست کو مستحکم کرنے کی یہودی سازش تھی۔ اس معاہدے نے الفتح تنظیم کو بھی آزادی کی ایک بڑی تحریک سے ایک چھوٹی میونسپل حکومت میں بدل دیا۔

تیس سالہ جہادی دور کا آغاز

اس معاہدے کے بعد فلسطینی مسلمانوں نے یہودیوں کے خلاف وسیع پیمانے پر عسکری کارروائیوں کا آغاز کر دیا جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انتہائی منظم اور اسرائیل کے لیے تباہ کن ثابت ہوئیں۔ فدائی حملوں، بم دھماکوں اور گوریلا حملوں میں نِت نئے طریقوں کے ساتھ فلسطینی مجاہدین صف آرا ہوئے۔ باہم اتحاد وایثار اور اللہ تعالیٰ کی خصوصی مدد ونصرت سے آج اس عظیم جہاد کو تیس سال ہو گئے ہیں لیکن کوئی ایک دن بھی مسلمانوں کی کسی مزاحمتی کارروائی سے خالی نہیں رہا۔ اوسلو معاہدے کی صورت میں مسئلۂ فلسطین کو ہمیشہ کے لیے دفن کرنے کا خواب دیکھنے والوں کو کبھی سکھ کا سانس نصیب نہیں ہوا۔ ان مسلمانوں کی عظیم قربانیوں کی بدولت آج فلسطینی مجاہدین اسرائیلی تباہی کا واضح پیغام بن چکے ہیں۔ ظلم وتشدد کا ہر حربہ اور اسلحے و ٹیکنالوجی کی ہر قوت خدائی طاقت پر غیر متزلزل یقین رکھنے والے اس عظیم طائفے کے جذبۂ آزادی کے سامنے بے معنیٰ ہے۔

ابراہیم مسجد میں نمازیوں کا قتلِ عام

۲۵، فروری ۱۹۹۴ء کو الخلیل شہر کی مسجد کو اس وقت مسلمانوں کے خون سے بھر دیا گیا جب مسلمان فجر کی نماز ادا کر رہے تھے۔ اسرائیلی افواج کے تعاون سے یہودی دہشت گرد نے نمازیوں کی صفوں پر اندھا دھند فائرنگ کی جس سے تیس نمازی موقعے پر شہید ہو گئے اور ایک سو پچاس سے زیادہ شدید زخمی ہو گئے۔ مسجد کا ہال مسلمانوں کے خون سے بھر گیا۔ تحریکِ حماس کے عسکری ونگ القسام بریگیڈ نے اس قتلِ عام کا انتقام لینے کا اعلان کر دیا۔

اس تحریک کے اہم واقعات

عفولہ بس اسٹیشن حملہ: القسام کے مجاہدین نے فدائی حملہ کر کے یہاں دس یہودیوں کو ہلاک اور ساٹھ کو زخمی کر دیا۔

الخضیرہ بس اسٹیشن حملہ: یہاں بھی القسام کے جانبازوں کی طرف سے فدائی حملہ کیا گیا جس میں چھے یہودی

ہلاک اور تیس زخمی ہوئے۔ ۱۹۹۴ء کے سال مجاہدین کے پچاس سے زیادہ حملے میڈیا میں رپورٹ ہوئے جن میں سینکڑوں یہودی ہلاک ہوئے۔ بیش تر حملے قابض افواج پر ہوئے۔ اس سال تل ابیب میں ایک بڑے حملے میں بائیس یہودی مارے گئے۔

بیتِ لید فدائی آپریشن ۱۹۹۵ء: اسرائیل کے ساحلی علاقے نتانیا کے قریب بیتِ لید کے اس علاقے میں اسلامی جہاد کے فدائیوں نے بالکل نئی تکنیک سے یہودی فوج کے ایک خصوصی دستے کو نشانہ بنایا۔ پہلے ایک فدائی نے فوجیوں میں گھس کر اپنے آپ کو دھماکے سے اڑا دیا جس سے کئی فوجی ہلاک ہوئے۔ اس دوران دوسرے فدائی نے اپنے آپ کو چھپا لیا۔ جب فوج کا دستہ زخمیوں اور لاشوں کو اُٹھانے کے لیے آیا تو دوسرے فدائی نے بھی دھماکا کر دیا۔ اس کارروائی میں پچیس اسرائیلی فوجی ہلاک اور ستر زخمی ہوئے۔ دونوں فدائیوں نے اسرائیلی فوج کی وردیاں پہن رکھی تھیں۔ اسی سال کفر داروم میں حماس کے حملے میں آٹھ یہودی مارے گئے۔ ۱۹۹۵ء کے اس سال میں چار فدائی دھماکوں کے علاوہ کئی بم دھماکے اور مسلح حملے رپورٹ ہوئے۔ اسی سال نتانیا اور تل ابیب میں اسلامی جہاد کے حملوں میں پینتیس یہودی ہلاک ہوئے۔

پہلے صدارتی اور پارلیمانی انتخابات ۱۹۹۶ء

اوسلو معاہدے کے بعد ۱۹۹۶ء میں پہلی بار انتخابات منعقد ہوئے۔ الفتح نے ان انتخابات میں کامیابی حاصل کی۔ پارلیمانی انتخابات میں الفتح نے اٹھاسی میں سے پچپن نشستوں پر کامیابی حاصل کی جبکہ صدارتی انتخابات میں یاسر عرفات ستاسی فیصد ووٹ لے کر صدر منتخب ہوئے۔

حماس اور اسلامی جہاد کے خلاف کریک ڈاؤن

الفتح کی حکومت قائم ہوتے ہی حماس اور اسلامی جہاد کو ختم کرنے کے لیے شدید کریک ڈاؤن شروع ہوا۔ مغربی کنارے میں ان دو تنظیموں کی سرگرمیوں پر پابندی لگا دی گئی۔ تمام بڑے رہنما گرفتار کر لیے گئے۔ غزہ میں پولیس سربراہ یوسف نصر نے مظالم کی حد کر دی۔ اس نے حماس کے محمود الزہار سمیت تمام اہم رہنماؤں کو

گرفتار کرکے شدید تشدّد کا نشانہ بنایا۔ اسلامی جہاد اور حماس کے کارکنوں سے اسلحہ جمع کرنے کے لیے گھر گھر تلاشی مہم شروع کی گئی۔

مزاحمتی کارروائیاں (۱۹۹۶۔۲۰۰۰ء)

الفتح کی جہاد دشمن سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ مجاہدین کا جہاد اور اسرائیل کا فساد بھی جاری رہا۔ ۱۹۹۶ء کے آغاز پر اسرائیل نے ایک خصوصی ٹیکنالوجی کے ذریعے حماس کے عسکری ونگ کے رہنما یحییٰ عیاش کو شہید کردیا۔ اس پر حماس کے عسکری ونگ القسام بریگیڈ کے حملوں سے اسرائیل لرز اُٹھا۔ سب سے پہلے یافا بس روٹ کے اسٹیشن کو نشانہ بنایا گیا۔ یروشلم کے قریب اس مقام کو ایک ہفتے میں دوبار نشانہ بنایا گیا جس میں پچاس یہودی ہلاک ہوئے۔ صرف دس دنوں کے دوران اسلامی جہاد اور حماس نے اسرائیلی دار الحکومت میں چار حملے کیے جن میں پچاس سے زیادہ اسرائیلی ہلاک اور دو سو پچاس سے زیادہ زخمی ہوئے۔ تل ابیب کے مشہور ڈیز نگوف شاپنگ مال اور نائٹ کلب نشانہ بنے۔ اکثر حملوں کی منصوبہ بندی محمد الضیف نے کی جو آج بھی اسرائیل کے لیے دہشت کی سب سے بڑی علامت ہیں۔ اسی سال غزہ کے ایک حملے میں تین اسرائیلی فوجی ہلاک ہوئے۔

۱۹۹۷ء کا سال بھی یہودیوں کے لیے انتہائی مہلک ثابت ہوا۔ اس سال جون میں ماہین یہودا مارکیٹ پر حملے میں اٹھارہ یہودی ہلاک اور پچاس زخمی ہوئے۔ تل ابیب کے کیفے اپروپو پر ہونے والے حملے میں پانچ یہودی ہلاک اور پچاس زخمی ہوئے۔ ستمبر میں بن یہودا اسٹریٹ یروشلم کے حملے میں پانچ یہودی ہلاک اور بیس زخمی ہوئے۔ ان کے علاوہ تقریباً بیس چھوٹے حملے رپورٹ ہوئے۔

۱۹۹۸ء میں بھی یہودی، مسلمان مجاہدین کے حملوں کی زد میں رہے۔ کفر داروم میں حماس کے بم دھماکوں میں کئی یہودی ہلاک ہوئے۔ جبکہ یروشلم میں اسرائیلی افواج پر ایک حملے میں تین فوجی ہلاک ہوئے۔ اس سال بن یہودا اسٹریٹ میں بھی دھماکا ہوا۔ جبکہ غزہ میں مسلح حملوں میں پانچ یہودی فوجی مارے گئے۔

۱۹۹۹ء کے سال طبریہ میں ایگڈ کمپنی کی بس کو نشانہ بنایا گیا جس میں کئی یہودی ہلاک ہوئے۔ جبکہ حیفا بس اسٹیشن پر دھماکوں میں بھی کئی یہودی مارے گئے۔ غزہ میں دو یہودی فوجیوں کو ایک دھماکے میں ہلاک کیا گیا۔

تل ابیب کے ایک دھماکے میں دو یہودی ہلاک اور پانچ زخمی ہوئے۔ ۲۰۰۰ء میں غزہ، ماہین یہودا مارکیٹ، کفر داروم، مین خضیرہ سٹریٹ اور ماہولا سمیت کئی علاقے بم حملوں اور فدائی دھماکوں کا نشانہ بنے۔

کیمپ ڈیوڈ مذاکرات

اسرائیلی وزیرِاعظم ایہود باراک اور فلسطینی رہنما یاسر عرفات کے درمیان یہ مذاکرات جولائی ۲۰۰۰ء کو کیمپ ڈیوڈ میں صدر بل کلنٹن کی میزبانی میں ہوئے۔ ان مذاکرات کا مقصد ان معاملات کی حتمی حیثیت کا تصفیہ تھا جو اوسلو معاہدے میں طے پائے تھے۔ یہ مذاکرات ۱۱ سے ۲۵ جولائی تک ہوئے لیکن مشرقی بیت المقدس، مہاجرین کی واپسی اور یہودی بستیوں کے معاملے پر ایہود باراک کے سخت موقف کی وجہ سے کامیاب نہ ہوسکے۔ اوسلو معاہدے کے بعد فلسطین میں پیدا ہونے والے حالات اور عرفات کی اپنی شخصیت متنازع بن جانے کے بعد خود عرفات کے لیے بھی تمام اسرائیلی مطالبات تسلیم کرنا ناممکن تھا۔ چنانچہ یہ مذاکرات بغیر کسی معاہدے کے بے نتیجہ ختم ہوگئے۔

دوسری انتفاضہ: الاقصیٰ انتفاضہ (۲۰۰۰۔۲۰۰۵ء)

ستمبر ۲۰۰۰ء میں آریئل شارون نے لیکوڈ پارٹی کے رہنماؤں کے ساتھ مسجدِ اقصیٰ کا دورہ کیا۔ اس دورے میں پارٹی رہنماؤں کے علاوہ اس کے ساتھ تقریباً ایک ہزار مسلح اہلکار تھے جنھوں نے اس موقعے پر حرم شریف کے کمپاؤنڈ میں واقع مقامِ معراج یعنی قبۃ الصخرۃ اور اس کے احاطے کو یہودی حصہ قرار دیا اور اس کی توہین کرتے ہوئے اس پر دھاوا بول دیا۔ اس سے مسلمان انتہائی غضب ناک ہوئے اور نعرے بازی اور احتجاج کرنے لگے۔ بدفطرت یہودی کیل کانٹے سے لیس ہو کر ان معصوموں پہ پل پڑے۔ نہتے مظاہرین پر گولیاں برسائیں اور آنسو گیس کا بے دریغ استعمال کیا۔ اس تشدّد سے دس فلسطینی شہید اور دو سو پچاس سے زیادہ زخمی ہوئے۔ اس سے حالات مزید سنگین ہوگئے۔ اس واقعے کے دوسرے دن اسرائیلی سپاہیوں نے معصوم فلسطینی بچے محمد الدرّہ کو گولیوں سے بھون کر اس آگ پر مزید تیل چھڑ کا تو پورا فلسطین اس

آگ سے بھڑک اٹھا۔ جس نے آئندہ چار سال تک اس سرزمین کو یہودیوں کے لیے جہنم بنائے رکھا۔ گزشتہ انتفاضہ میں تو فلسطینیوں کا واحد ہتھیار پتھر تھا لیکن اس بار ان کا اپنا جسم بھی سب سے خوفناک ہتھیار تھا جس سے بم باندھ کر وہ یہودی ایوانوں کو لرزاتے رہے۔ اور ان کا ساتھ دینے کے لیے ان کے وہ بہادر مجاہدین بھی تھے جنھوں نے پچھلے سات سال سے یہودی نفسیات کو اپنی دہشت سے مغلوب کر دیا تھا۔ یہودی بربریت ان کو ان کے بچوں سمیت ٹینکوں اور توپ خانوں سے اڑاتی رہی۔ ان کی پاکیزہ عصمتیں پامال ہوتی رہیں لیکن انھوں نے کبھی بھی سر جھکا کر اپنی عزیمت کی عظیم تاریخ کو دھندلا نہیں ہونے دیا۔ بلکہ اپنی استقامت و شجاعت سے اپنی اگلی نسلوں کے لیے آزادی کے نئے چراغ روشن کرتے رہے۔

اس انتفاضہ میں متحرک تنظیمیں

دیگر تنظیموں کے ساتھ اس بار ایک نیا نام ''الاقصیٰ شہدا بریگیڈ'' بھی اس انتفاضہ میں سامنے آیا۔ اس عسکری تنظیم کو الفتح کا عسکری بازو ہی سمجھا جاتا تھا کیونکہ اس کے سربراہ رائد الکرمی یاسر عرفات کے انتہائی قریبی ساتھی تھے۔ اس عسکری تنظیم نے اس انتفاضہ کے دوران اسرائیلیوں پر بہت سے حملے کیے اور اس کا قیام بھی اسی انتفاضہ کے دوران عمل میں لایا گیا۔ اس کے علاوہ الفتح فالکنز تنظیم نے بھی کئی کارروائیاں کیں۔ یہ بھی الفتح کا عسکری ونگ تھا۔

دورانِ انتفاضہ یہودیوں پر ہونے والے مشہور حملے

انتفاضۂ اقصیٰ کے ان چار سالوں میں فلسطینی مجاہدین نے اسرائیلی فوج اور اسرائیل میں دیگر ممالک سے آکر آباد ہونے والے یہودیوں پر تباہ کن حملے کیے۔ یہ چار سالہ حملے فلسطین میں یہودیوں پر تاریخ کے سب سے ہولناک حملے تھے۔ فلسطینی مجاہدین کی فدائی کارروائیوں، بم دھماکوں اور مسلح حملوں میں اسرائیلی فوج اور آبادکار یہودیوں کی بڑی تعداد ہلاک ہوئی۔ دار الحکومت تل ابیب اور حیفا سمیت متعدّد اہم شہروں میں متعدّد عسکری تنصیبات، پارک، نائٹ کلب، سیاحتی مراکز، شاپنگ مال، اسٹیشنز اور ہوٹلوں کو نشانہ بنایا

گیا۔ اہم بات یہ ہے کہ اس دوران فلسطین میں آباد قدیم یہودیوں اور ان کی املاک سے فلسطینیوں نے کوئی تعرض نہیں کیا۔ فلسطینیوں کے یہ ہولناک حملے اسرائیلی افواج اور فلسطین میں آباد ہونے والے یہودیوں تک محدود رہے۔ ان چار سالوں کے چند مشہور حملے یہ ہیں:

عبرانی یونیورسٹی حملہ ۲۰۰۱ء: یروشلم میں قائم اس یہودی یونیورسٹی پر حماس کے عسکری ونگ القسام کے حملے میں دس یہودی ہلاک اور سو زخمی ہوئے۔

ڈولفن نائٹ کلب حملہ: تل ابیب میں ساحلِ سمندر پر واقع فحاشی کے اس بڑے مرکز پر مجاہدین کے فدائی حملے میں چھبیس یہودی ہلاک اور ایک سو پچاس زخمی ہوئے۔ یہ اس سال کا سب سے خوفناک حملہ تھا۔

بنیامینیہ ٹرین اسٹیشن: یہاں مجاہدین نے اسرائیلی فوج کو نشانہ بنایا۔ تین اسرائیلی فوجی ہلاک اور چھے زخمی ہوئے۔

سبارو ریسٹورنٹ آپریشن: القدس میں واقع اس ہوٹل کو القسام کے فدائیوں نے نشانہ بنایا جس میں اسرائیلی فوجیوں سمیت اٹھارہ یہودی ہلاک اور ایک سو تیس زخمی ہوئے۔

بن یہودا اسٹریٹ یروشلم: یہ اسرائیلی فوج پر ہونے والے بڑے حملوں میں سے ایک ہے۔ یروشلم کے اس علاقے میں حماس کے دو فدائیوں نے یکے بعد دیگرے خود کو دھماکے سے اڑادیا، جس کے بعد ایک اور طاقت ور بم دھماکا ہوا۔ اس حملے میں پندرہ اسرائیلی فوجیوں سمیت پینتیس یہودی ہلاک اور دو سو زخمی ہوئے۔ حماس نے ان حملوں کو کمانڈر ابوہنود شولی کا انتقام قرار دیا جن کو چند دن قبل اسرائیلی افواج نے شہید کیا تھا۔ ۲۰۰۱ء میں فدائی حملوں سمیت پچاس کے قریب دھماکوں اور مسلّح حملوں میں سینکڑوں یہودی ہلاک ہوئے۔

۲۰۰۲ء میں بھی فدائی حملوں اور بم دھماکوں سے اسرائیل لرزتا رہا۔ اس سال اسرائیلی میڈیا کے مطابق پچاس سے زیادہ حملے ہوئے۔

میگڈو جنکشن دھماکا: یہ اسلامی جہاد کے مجاہدین کا فدائی حملہ تھا جب انھوں نے شمالی اسرائیل کے اس علاقے میں بارود سے بھری گاڑی اسرائیلی فوجی کانوائے سے ٹکرادی۔ اس حملے میں اسرائیلی دفاعی فورس کے پندرہ فوجی ہلاک اور پینتالیس زخمی ہوئے۔

ایگڈ بس حملہ: القدس میں یہودی بس پر ہوئے حماس کے اس حملے میں انیس یہودی ہلاک اور پچاس زخمی ہوئے۔

فرانسیسی ہِل حملہ: القدس کے شمال مشرق میں اس علاقے میں ہوئے فدائی حملے میں دس یہودی ہلاک اور پینتیس زخمی ہوئے۔

آپریشن ایمانوئل: یہ القسام کا ایک فدائی آپریشن تھا جس میں پہلے فائرنگ اور دستی بموں سے حملہ کیا گیا پھر فدائیوں نے دھماکے کر دیے۔ اس حملے میں دس اسرائیلی ہلاک اور بیس زخمی ہوئے۔

میرون جنکشن آپریشن: یہ حماس کے عسکری ونگ القسام بریگیڈ کا مسلح آپریشن تھا جس میں لبنانی سرحد کے قریب واقع اس علاقے میں اسرائیلی فوج کو نشانہ بنایا گیا۔ اس کارروائی میں پانچ فوجیوں سمیت دس یہودی ہلاک اور بیس زخمی ہوئے۔

ایلن بی اسٹریٹ دھماکا: تل ابیب کے علاقے ایلن بی اسٹریٹ میں ہوئے اس دھماکے میں دو اسرائیلی فوجیوں سمیت چھے یہودی ہلاک اور ستر زخمی ہوئے۔

کرکور جنکشن آپریشن: یہ اسلامی جہاد کے مجاہدین کا اسرائیلی فوج کے خلاف ایک کمانڈو آپریشن تھا جس میں دس فوجیوں سمیت پندرہ یہودی ہلاک اور چالیس زخمی ہوئے۔

کریات میناجیم بس حملہ: یروشلم کے اس علاقے میں بس پر ہونے والے حملے میں پندرہ اسرائیلی ہلاک اور چالیس زخمی ہوئے۔

یشیفا یسرائیل حملہ: یہ الاقصیٰ بریگیڈ کا کمانڈو آپریشن تھا۔ اس حملے میں تین فوجیوں سمیت گیارہ یہودی ہلاک اور پچاس زخمی ہوئے۔

مومنٹ کیفے حملہ: یروشلم کے اس ہوٹل پر حماس کے فدائی حملے میں انٹیلی جنس اہلکاروں سمیت گیارہ اسرائیلی ہلاک اور پینتالیس زخمی ہوئے۔

عیدالفصح آپریشن: یہ ایسٹر ڈے کے دنوں میں ہونے والے دو بڑے حملے تھے۔

پارک ہوٹل نتانیا: ساحلِ سمندر پر واقع اس ہوٹل پر ہونے والے فدائی حملے میں انٹیلی جنس ڈیسک کے افسران سمیت چالیس یہودی ہلاک اور ایک سو پچاس زخمی ہوئے۔

ماتزا ہوٹل: حیفا کے علاقے میں اس ہوٹل پر ہونے والے حملے میں سولہ یہودی ہلاک اور چالیس زخمی ہوئے۔

ریشیون لذیون حملہ: تل ابیب کے قریب واقع اس شہر پر حماس کے حملے میں پندرہ، اسرائیلی ہلاک اور ستاون زخمی ہوئے۔

یاجور جنکشن حملہ: حیفا کے قریب اس علاقے میں حماس کے فدائیوں نے اسرائیلی فوج کو نشانہ بنایا۔ چھے اسرائیلی فوجی ہلاک اور انیس زخمی ہوئے۔

۲۰۰۳ء کے اہم واقعات

۲۰۰۳ء میں بھی اسرائیلی فوج اور یہودیوں پر بڑے بڑے حملے ہوئے۔ جن کی تعداد تیس کے قریب رہی۔ زیادہ مشہور حملے یہ ہیں:

شموئل حناوی بس بم دھماکا: یروشلم کے محلے شموئل حناوی میں حماس نے ایک بس کو دھماکے سے اڑا دیا گیا جس میں تئیس اسرائیلی ہلاک اور ایک سو تیس زخمی ہوئے۔ یہ اس سال کا سب بڑا حملہ تھا۔

ڈیوڈ کا اسکوائر: یروشلم کے اس علاقے میں بھی حماس نے ایک بس کو فدائی حملے میں تباہ کر دیا جس میں اسرائیلی پائلٹوں سمیت بیس یہودی ہلاک ہو گئے۔

میکسم ہوٹل حملہ: حیفا میں ساحلِ سمندر پر واقع اس ہوٹل کو جنین کے رہائشی نوجوان ہنادی تیسیر عبد المالک نے فدائی دھماکے سے تباہ کر دیا جس میں پچیس اسرائیلی ہلاک اور ساٹھ زخمی ہوئے۔ یہ اس نوجوان فلسطینی کا انتقام تھا کیونکہ کچھ عرصہ قبل اسرائیلی فوجیوں نے جنین میں اس کا پورا محلہ تباہ کر دیا تھا جس میں اس کے خاندان کے کئی افراد شہید ہوئے۔

تسریفین اسٹیشن حملہ: حماس کے فدائیوں نے وسطی اسرائیل کے اس علاقے میں اسرائیلی فوجی اڈے کو نشانہ بنایا جس میں بارہ فوجی ہلاک اور سولہ زخمی ہوئے۔

حیفا یونیورسٹی: اس یونیورسٹی کی بس کو نشانہ بنایا گیا جس میں سترہ یہودی ہلاک اور پچپن زخمی ہوئے۔

مرکزی اسٹیشن تل ابیب پر حملہ: یہاں الاقصیٰ بریگیڈ کے فدائیوں نے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر خود کو دھماکے سے اڑا دیا جس میں فوجیوں سمیت پچیس اسرائیلی ہلاک اور سو سے زیادہ زخمی ہوئے۔

فرانسیسی ہل حملہ: یروشلم کے اس علاقے کو ایک بار پھر نشانہ بنایا گیا جہاں ایک بم دھماکے میں دس یہودی ہلاک اور بیس زخمی ہوئے۔

۲۰۰۴ء کے اہم واقعات

۲۰۰۴ء میں بھی یہودیوں پر حملوں کا سلسلہ جاری رہا۔ میڈیا میں ۳۰ حملے رپورٹ ہوئے۔ جن میں سے چند یہ ہیں:

غزہ اسٹریٹ: یروشلم کے اس علاقے میں اسرائیل کے سرکاری دفاتر کے زون میں الاقصیٰ اور القسام کے مشترکہ فدائی حملے میں فوجیوں سمیت بیس سے زائد اسرائیلی ہلاک اور پچاس زخمی ہوئے۔

اشدود بندر گاہ پر حملہ: یہ بھی حماس اور الاقصیٰ کا مشترکہ فدائی حملہ تھا جس میں دس اسرائیلی ہلاک اور بیس زخمی ہوئے۔ اس بندر گاہ پر تمام تجارتی سرگرمیاں بند ہوگئیں۔

شیخ احمد یاسین کی شہادت

حماس کے بانی شیخ احمد یاسین ۲۲، مارچ ۲۰۰۴ء کو اسرائیلی حملے میں شہید ہوئے۔ وہ نمازِ فجر کی ادائی کے بعد اپنے ساتھیوں سمیت مسجد سے نکل رہے تھے جب اسرائیلی گن شپ ہیلی کاپٹر نے میزائل سے نشانہ بنایا۔ وہیل چیئر پر موجود حماس کے یہ روحانی پیشوا تحریکِ آزادیِ فلسطین کی عہد ساز اور عظیم المرتبت شخصیت تھی۔ اہلِ فلسطین آپ کو امام عزالدین قسام کے بعد جدوجہدِ آزادی کا سب سے معتبر رہنما سمجھتے ہیں۔ آپ نے اپنی جدوجہد سے تحریکِ آزادی کو نیا رخ عطا کیا، آپ ہمیشہ صہیونی دشمن کے حلق میں کانٹے کی طرح اٹکے رہے۔ اس حملے میں آپ کے ساتھ آپ کے دس ساتھی شہید اور آپ کے دو بیٹوں سمیت ایک درجن افراد شدید زخمی ہوئے۔ بوقتِ شہادت آپ کی عمر ۶۷ برس تھی۔

عبدالعزیز رنتیسی کی شہادت

اشدود بندر گاہ پر حملے کے بعد آریئل شارون نے حماس کے رہنما عبدالعزیز رنتیسی کی شہادت کا خصوصی حکم جاری کیا، چنانچہ اسرائیل کی اسپیشل فورس نے غزہ میں ڈرون طیاروں اور اپاچی ہیلی کاپٹروں کے

ذریعے ۱۷، اپریل ۲۰۰۴ء کو ایک خصوصی آپریشن میں حماس کے اس عظیم رہنما کو شہید کردیا جو اس سے پہلے کئی حملوں میں بچے تھے۔

حماس کا انتقام: حماس نے اس کے جواب میں پرانی گرین لائن عبور کر کے اسرائیل کے اندر کئی طوفانی حملے کیے جس سے بیس سے زیادہ یہودی ہلاک ہوئے جن میں بڑی تعداد اسرائیلی فوجیوں کی تھی اور سو سے زیادہ یہودی زخمی ہوئے۔

لبرٹی پارک حملہ: القدس کے اس علاقے میں الاقصیٰ بریگیڈ کے حملے میں آٹھ یہودی ہلاک اور ساٹھ زخمی ہوئے۔

آپریشن براکین الغضب (غصے کا آتش فشاں)

القسام اور الفتح فالکنز کے مجاہدین نے رفح کراسنگ کے نیچے چار ماہ لگا کر چھ سو میٹر لمبی سرنگ کھودی اور پھر اس سرنگ سے صرف دو فدائیوں نے نکل کر اسرائیلی فوجیوں پر دھاوا بول دیا۔ دو گھنٹے تک صرف دو مجاہد سینکڑوں اسرائیلی فوجیوں سے برسرِپیکار رہے۔ اس آپریشن میں اسرائیل کے مطابق اس کے چھ فوجی ہلاک ہوئے جبکہ حماس کے مطابق درجن سے زیادہ فوجی مردار ہوئے۔ ایک فدائی شہید ہوا جبکہ دوسرا صحیح سلامت سرنگ کے ذریعے واپس چلا گیا۔

سینا میں دھماکے: اسرائیلی سرحد کے قریب جزیرہ نما سینا کے مصری علاقے میں سیاحتی مرکز کو دھماکوں سے نشانہ بنایا گیا۔ یہاں جسم فروشی کے مشہور اڈے پر ہونے والے کار بم دھماکے میں پینتیس افراد ہلاک اور دو سو سے زیادہ زخمی ہوئے۔ اس کی ذمے داری القاعدہ کی شاخ توحید الاسلام نے قبول کی۔

الاقصیٰ انتفاضہ کے دوران اسرائیلی مظالم

دوسری انتفاضہ کے دوران بھی اسرائیلی جارحیت جاری رہی۔ اسرائیلی افواج کی حماقت تھی کہ تحریکِ آزادی کو ظلم و تشدد سے روکا جا سکتا ہے۔ حق تو یہ ہے کہ ظلم جتنا بڑھتا جاتا ہے آزادی کی جدوجہد بھی اتنی ہی تیز تر ہوجاتی ہے۔ دوسری انتفاضہ کو روکنے میں ناکامی پر غاصب حکومت نے مغربی کنارے کے گرد دیوار کی تعمیر

کے منصوبے کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کا فیصلہ کیا۔

مغربی کنارے کی دیوار کی تعمیر

دنیا میں نسلی اور مذہبی منافرت کی اہم علامت یہ مغربی کنارے کے گرد قائم کردہ اسرائیلی دیوار ہے۔ اس دیوار کی تعمیر کا منصوبہ ۱۹۹۳ء کے اوسلو معاہدے کے بعد سے زیرِ غور تھا۔ ۲۰۰۰ء میں اسرائیلی حکومت نے اس منصوبے کی منظوری دی اور ۲۰۰۲ میں انتفاضہ کے دوران اس کی تعمیر کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ تین اعشاریہ چار بلین ڈالر کی لاگت سے تعمیر ہونے والی اس دیوار کی کل لمبائی آٹھ سو کلومیٹر کے قریب ہے۔ اس میں سے ایک سو بیالیس کلومیٹر القدس کے گرد ہے جس کو غلاف القدس کہا گیا ہے۔ کنکریٹ کی یہ دیوار الخلیل شہر سے شروع ہو کر پورے مغربی کنارے کے گرد گھومتی ہوئی جنین کے آخر میں اردن کی سرحد تک چلی جاتی ہے جس میں بعض مقامات پر باڑ بھی استعمال کی گئی ہے۔ یہ دیوار پانچ سے نو میٹر تک اونچی ہے اور زیرِ زمین بھی سرنگوں سے حفاظت کے لیے پتھر اور کنکریٹ سے رکاوٹ قائم کی گئی ہے۔ اس کے بیش تر حصے پر کام مکمل ہو چکا ہے۔ اس دیوار پر الیکٹرانک باڑ، سینسر ٹاور اور نگرانی کے کیمرے لگائے گئے ہیں۔ اس کے گرد خندقیں اور گشتی سڑکیں بھی بنائی گئی ہیں۔ جگہ جگہ دروازے بھی ہیں جو جدید سیکیورٹی نظام سے لیس ہیں۔ اس دیوار سے مغربی کنارے کے شہروں کو بیت المقدس سے الگ کر دیا گیا ہے اور اس دیوار کی وجہ سے مغربی کنارے کا بارہ فیصد حصہ بھی کٹ گیا ہے۔ اسرائیل کے اس ظالمانہ منصوبے سے فلسطینی خاندانوں کو جدا کر کے ان کی اپنی زمینوں تک رسائی بھی ختم کر دی گئی ہے۔ اس دیوار کی تعمیر کے دوران فلسطینیوں کے کھیت کھلیان اور لاکھوں پھل دار درخت اکھاڑ دیے گئے۔ بین الاقوامی عدالتِ انصاف اور اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی نے اس دیوار کو غیر قانونی قرار دیا ہے۔

اسرائیلی بربریت

اسرائیل نے اس انتفاضہ کو کچلنے کے لیے بڑی تعداد میں فوج طلب کی، ٹینکوں اور توپ خانوں سے فلسطینی

آبادیوں کو تباہ کیا۔ فلسطینی اتھارٹی کے زیرِ انتظام مغربی کنارے کے تمام شہروں میں ایمرجنسی نافذ کر کے فلسطینیوں کا قتلِ عام کیا۔ انتفاضہ کے ان پانچ سالوں میں ساڑھے چار ہزار فلسطینی شہید اور چھیالیس ہزار زخمی ہوئے جبکہ دس ہزار سے زیادہ فلسطینیوں کو گرفتار کیا گیا۔ فلسطینیوں کے ہزاروں مکانات تباہ ہوئے۔ مارچ ۲۰۰۲ء میں اسرائیل نے ڈیفنس شیلڈ کے نام سے فلسطینیوں کے خلاف جس بربریت کا آغاز کیا اس پر مغربی میڈیا بھی چیخ اٹھا۔ حالانکہ اس دوران مغربی کنارے میں صحافیوں اور مبصرین کے داخلے پر پابندی لگادی گئی تھی۔

معرکۂ جنین: ۳، اپریل ۲۰۰۲ء کو اسرائیلی فوجیوں نے جنین کیمپ کا محاصرہ کر کے فلسطینی آبادیوں کو تباہ کرنا شروع کیا۔ فلسطینی بھی طاقت ور فوج کے سامنے نہتے ہونے کے باوجود سینہ سپر ہوگئے۔ انتہائی پامردی سے مقابلہ کرتے ہوئے پچیس اسرائیلی فوجیوں کو جہنم واصل کیا اور پیٹرول چھڑک کر کئی ٹینکوں کو آگ لگائی۔ اسرائیلی فوجیوں نے پندرہ دن تک یہاں تباہی مچائی اور اس دوران فلسطینیوں کے پانچ سو مکانات مکمل تباہ کر دیے گئے۔ ساٹھ سے زیادہ فلسطینی شہید ہوئے۔ یہ بربریت پندرہ دن جاری رہی۔

چرچ آف دی نیٹی ویٹی (کلیسائے پیدائش) پر اسرائیلی دھاوا: بیتِ لحم میں اسرائیلیوں کے اندھا دھند تشدّد اور شدید مظالم کے بعد مجاہدین، عیسائیوں کے اس مقدس مقام میں پناہ لینے پر مجبور ہوئے۔ عیسائیوں نے بھی ان کے لیے کلیسا کے دروازے کھول دیے۔ اسرائیل نے درجنوں ٹینکوں، فوجی گاڑیوں اور سینکڑوں فوجیوں کے ساتھ اس چرچ کا محاصرہ کر لیا۔ مزاحمت کاروں نے ہتھیار ڈالنے سے انکار کر دیا۔ یہ محاصرہ انتالیس دن جاری رہا۔ اس دوران چرچ میں کھانے پینے کی فراہمی بند کر دی گئی۔ دو سو کے قریب عیسائی اور پادری بھی محصور رہے۔ اسرائیلی فوجیوں نے کئی بار چرچ پر گولہ باری کی، اس کا جنوبی دروازہ تباہ کر دیا گیا۔ آرمینیائی راہب زخمی ہوا۔ اسرائیلی پروپیگنڈہ یہ تھا کہ مزاحمت کاروں نے چرچ میں گھس کر راہبوں اور دیگر عیسائیوں کو یرغمال بنالیا ہے۔ جبکہ حقیقت یہ تھی کہ چرچ کے پادریوں نے خود ان کو پناہ دی تھی کیونکہ ان کے بہت سے ساتھی زخمی اور لہولہان تھے اور جب بھی اسرائیلی فوج اندر داخل ہونے کی کوشش کرتی تو ایک عیسائی چرچ کی گھنٹیاں بجادیتا جس پر اسرائیلی فوجیوں نے نشانہ لے کر سلمان نامی اس عیسائی راہب کو بھی قتل کر دیا۔ شدید محاصرے کی وجہ سے محصورین پر فاقوں کی نوبت آئی اور لوگ گھاس تک چباتے رہے۔ لیکن مزاحمت

کاروں نے کسی صورت بھی ہتھیار ڈالنے سے انکار کر دیا۔ آخر کیتھولک مرکزویٹی کن کی براہِ راست مداخلت پر مذاکرات کا آغاز ہوا۔ اور ان محصورین میں سے چھبیس مجاہدین کو غزہ اور تیرہ کو قبرص جلاوطن کیا گیا جو وہاں سے یورپی ممالک منتقل ہوئے۔

غزہ ایئرپورٹ کی تباہی

یہ ایئرپورٹ غزہ میں فلسطینی ریاست کی خود مختاری کی علامت کے طور پر تعمیر ہوا تھا۔ اس انتفاضہ کے دوران اسرائیل نے وحشیانہ بمباری سے اس ایئرپورٹ کو بھی مکمل طور پر تباہ کر دیا۔ اس ایئرپورٹ کا افتتاح ۱۹۹۸ء میں عرفات نے کیا تھا۔ مزید یہ کہ جنوری ۲۰۰۲ء میں اسرائیل نے دعویٰ کیا کہ اس نے بحیرۂ روم میں اسلحے سے لدا بحری جہاز قبضے میں لے لیا ہے جو فلسطینیوں کے لیے اسلحہ لا رہا تھا اور براہِ راست یاسر عرفات کی نگرانی میں تھا۔ کیرن اے نامی اس جہاز تک اسرائیل نے میڈیا کو بھی رسائی دی۔

یاسر عرفات کا محاصرہ

اس کے بعد اسرائیلی فوجیوں نے رام اللہ میں یاسر عرفات کے ہیڈ کوارٹر کا محاصرہ کر لیا۔ ان کے دفتر کے دروازے توڑے، اردگرد کی عمارتیں تباہ کیں، ایک ماہ تک محاصرہ جاری رہا۔ اس کے بعد بھی وقتاً فوقتاً محاصرہ ہوتا رہا۔ اکتوبر ۲۰۰۴ء میں ان کی طبیعت زیادہ بگڑ گئی جس پر انھیں عمان منتقل کیا گیا اور وہاں سے فرانسیسی طیارے کے ذریعے پیرس منتقل کیا گیا۔

یاسر عرفات کی وفات

۱۱، نومبر ۲۰۰۴ء کو فلسطینی رہنما یاسر عرفات پیرس کے ایک اسپتال میں دل کا دورہ پڑنے سے انتقال کر گئے۔ ان کا جسدِ خاکی پہلے مصر لایا گیا جہاں نمازِ جنازہ میں کئی رہنما شریک ہوئے۔ یاسر عرفات نے مسجدِ اقصیٰ میں دفنانے کی وصیت کی تھی لیکن اسرائیل نے اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ آپ کو رام اللہ میں الفتح کے ہیڈ کوارٹر کے احاطے میں امانتاً دفن کر دیا گیا اور مسجدِ اقصیٰ کی مٹی لا کر آپ کی قبر کے اندر بکھیری گئی۔

عرفات کی موت اسرائیلی سازش

فلسطینی حکام اور مرحوم کی بیوہ سُہیٰ عرفات نے یاسر عرفات کی موت کو زہر دیے جانے کی اسرائیلی سازش قرار دیا جو بعد میں درست ثابت ہوئی۔ کیونکہ سہیٰ عرفات کی درخواست پر جب ۲۰۱۲ء میں انکوائری کے دوران عرفات مرحوم کی قبرکشائی کی گئی تو سوئزر لینڈ کے فارنزک ماہرین نے عرفات کے جسم میں تابکار مادے پلوٹنیم کی کافی زیادہ مقدار کی تصدیق کی۔ بعض محققین کے مطابق فلسطینی مجاہدین کے حملوں سے اسرائیل عاجز آ چکا تھا اور یاسر عرفات کو اس تحریک کا اہم کردار تصور کرتا تھا۔ عین ممکن ہے کہ اس بپھرے سمندر میں سکوت لانے کے لیے اسرائیل نے یہ اقدام کیا ہو کیونکہ ۱۹۹۳ء میں اوسلو معاہدے کی صورت میں ایک سنگین غلطی کے بعد ۲۰۰۰ء میں کیمپ ڈیوڈ میں اسرائیلی وزیرِ اعظم کے جارحانہ رویے اور صدر کلنٹن کے دباؤ اور انتفاضہ اقصیٰ کے دوران اسرائیلی حکام کے مسلسل دباؤ کے سامنے عرفات ثابت قدم رہے تھے۔ دوسری انتفاضہ کے دوران اگرچہ یہودیوں پر ہونے والے کئی حملوں کی جناب عرفات مرحوم نے مذمت بھی کی لیکن براہِ راست اسرائیلی افواج پر ہونے والے حملوں پر وہ خاموش ہی رہے۔ اس لیے فلسطین کے بہت سے حلقوں میں مرحوم کو پذیرائی اور عزت ملی اور بہت سے عوامی حلقے بھی انھیں اس تحریک کا اہم رہنما سمجھتے تھے۔ ان حالات میں ممکن ہے اسرائیل نے یہاں کی غضب ناک فضاؤں میں عرفات کی موت سے سوگ کا سماں پیدا کر کے انتفاضہ کی اس آگ کو ٹھنڈا کرنے کی سازش کی ہو اور عرفات کی شخصیت میں پیدا ہونے والی تبدیلی پر انتقام لیا ہو۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ عرفات کی موت کے بعد انتفاضہ کی تپش ماند پڑنے لگی تھی کیونکہ ۲۰۰۵ء میں حملوں کی شرح بہت کم ہو گئی تھی، اگرچہ تحریک شرم الشیخ کے اجلاس تک جاری رہی۔ بہر حال عرفات کی موت سے عوامی جوش و ولولے میں نمایاں کمی دیکھنے میں آئی۔ مرحوم کے نظریات و اقدامات سے لاکھ اختلاف مگر ان کی عمرِ عزیز کا اہم حصّہ جلاوطن رہ کر اسرائیل کے خلاف مزاحمتی جد وجہد میں دربدر کی خاک چھانتے ہوئے گزارا تھا۔ لیکن اس سوال کا جواب باقی ہے کہ سہیٰ عرفات نے فلسطینی حکام کے اصرار کے باوجود اس وقت فوری پوسٹ مارٹم کی اجازت کیوں نہ دی تھی؟

۲۰۰۵ء کے واقعات

اگرچہ اس سال حملوں میں کمی آگئی۔ لیکن اس کے باوجود کچھ بڑے حملے بھی ہوئے:

الحضیرہ حملہ: اسلامی جہاد نے یہاں سبزی منڈی کے مین گیٹ پر ایک بڑا دھماکا کیا جس سے آٹھ اسرائیلی ہلاک، ساٹھ زخمی ہوئے۔

نتانیا دھماکا: اس ساحلی شہر میں اسلامی جہاد کے حملے میں چھے اسرائیلی ہلاک اور سو کے قریب زخمی ہوئے۔ اس شہر کو دوسری بار بھی اسلامی جہاد تنظیم نے نشانہ بنایا۔ جب ایک فدائی حملے میں فوجیوں سمیت چھے اسرائیلی ہلاک، دس زخمی ہوئے۔

طولکرم حملہ: مغربی کنارے کے اس علاقے میں حماس کے فدائی حملے میں تین فوجی ہلاک اور دس زخمی ہوئے۔

تل ابیب: اس سال اسرائیلی دار الحکومت میں اسلامی جہاد نے ایک نائٹ کلب کو نشانہ بنایا جہاں فدائی حملے میں شراب وشباب کے نشے میں مدہوش چھے یہودی ہلاک اور پچاس زخمی ہوئے۔

کرنی کراسنگ حملہ: یہاں غزہ پٹی کی سرحدی چوکی پر حماس کے عسکری ونگ القسام بریگیڈ کے حملے میں فوجیوں سمیت چھے یہودی ہلاک اور دس زخمی ہوئے۔ اس کے علاوہ قطیف اور بئرِ سبع میں بھی حملے ہوئے۔

اقصیٰ انتفاضہ میں اسرائیلی نقصان: اسرائیل کے اپنے میڈیا کے مطابق اس انتفاضہ کے دوران اس کے تین سو چونتیس فوجی اور سات سو شہری ہلاک ہوئے جبکہ اس کے پچاس میر کا فا ٹینک اور بیس بکتر بند کے علاوہ کئی فوجی جیپیں اور ٹرک بھی تباہ ہوئے۔

اسرائیل کے کئی ہوٹل، بنک، نائٹ کلب، سیاحتی پارک، ریلوے و بس اسٹیشن اور تجارتی مراکز بھی فلسطینیوں کے حملوں میں تباہ ہوئے۔ اس انتفاضہ نے اسرائیلی معیشت میں بھونچال پیدا کر دیا تھا۔ شرم الشیخ کی یقین دہانیاں، قیدیوں کی رہائی، غزہ سے انخلا اور دیگر اقدامات اسی بھونچال کی واضح عکاسی کرتے ہیں۔

شرم الشیخ سربراہی کانفرنس اور انتفاضہ کا اختتام

۸، فروری ۲۰۰۵ء کو مصر کے شہر شرم الشیخ میں منعقد ہونے والی سربراہ کانفرنس میں یاسر عرفات کے

بعد منتخب ہونے والے فلسطین کے صدر محمود عباس، اسرائیلی وزیرِاعظم آریئل شارون، اردن کے شاہ عبد اللہ اور مصری صدر حسنی مبارک شریک ہوئے۔ اس کانفرنس میں محمود عباس اور شارون نے ایک دوسرے کے خلاف تمام پُرتشدد کارروائیاں بند کرکے قیامِ امن کالائحۂ عمل طے کرنے پر اتفاق کیا۔ آریئل شارون نے انتفاضہ ختم کرنے کے بدلے اسرائیلی جیلوں سے ایک ہزار کے قریب فلسطینی قیدیوں کی رہائی کا بھی اعلان کیا جن میں سے پانچ سو کو اس کانفرنس کے فوری بعد رہا کر دیا گیا۔ اس کے علاوہ شارون نے فلسطینی صدر کو غزہ سے یہودی بستیاں ختم کرکے وہاں سے اسرائیلی فوجی انخلا کی بھی یقین دہانی کروائی۔ خوشگوار ماحول میں منعقد ہونے والی اس کانفرنس میں اسرائیلی اعلانات اور یقین دہانیوں کے بعد محمود عباس نے دیگر علاقائی رہنماؤں کے تعاون سے انتفاضہ کو ختم کرنے میں بھرپور کردار ادا کیا۔ اس طرح ان رہنماؤں کی یقین دہانیوں کے بعد حالات معمول پر آنا شروع ہو گئے۔

دوسرے صدارتی انتخابات ۲۰۰۵ء

یاسر عرفات کی وفات کے بعد ۲۰۰۵ء میں دوسری بار صدارتی الیکشن ہوا جس میں محمود عباس باسٹھ فیصد ووٹ لے کر فلسطین اتھارٹی کے صدر منتخب ہوئے جبکہ ان کے مقابلے میں حزب الشعب الفلسطيني کے سربراہ مصطفیٰ برغوثی صرف انیس فیصد ووٹ لے سکے۔

غزہ سے اسرائیلی بستیوں کا خاتمہ اور فوج کا انخلا

۱۵، اگست ۲۰۰۵ء کو اسرائیل نے غزہ سے یہودی آبادیاں خالی کرنے کا آغاز کیا اور ایک ماہ کے اندر تمام بستیاں مسمار کرکے اپنی فوج بھی غزہ سے نکال لی۔ غزہ میں یہودی آباد کاروں کی تعداد نو ہزار کے قریب تھی۔ یہ غزہ کے تین سو ساٹھ مربع کلومیٹر کے کل علاقے کے پینتیس فیصد پر قابض تھے۔ ان کی پچیس بستیاں تھیں۔ غزہ سے انخلا کا بنیادی سبب فلسطینی مجاہدین کے بڑھتے حملے تھے۔ ان حملوں کے نِت نئے طریقے خود اسرائیلی فوج کے لیے حیران کن تھے۔ سرنگوں سے نکل کر بجلی کی کوند کی طرح حملہ آور ہو کر غائب ہونے والے جنگجو اور

آبادیوں پر راکٹ، مارٹر حملوں، فدائی دھماکوں نے یہودی آبادیوں کو شدید خوف وہراس میں مبتلا کر دیا تھا۔ ان حالات میں ان کی نقل وحرکت کے لیے جو سیکیورٹی کا کڑا انظام قائم کیا گیا تھا، خود اسرائیلی میڈیا نے بھی اس کو ''پر تشدد سیکیورٹی معمول'' قرار دیا تھا۔ وزیرِاعظم شارون نے اس انخلا کی وجہ اسرائیل کے داخلی حالات کو بھی قرار دیا تھا کیونکہ اس نے اپنے خطاب میں کہا تھا کہ اب سے معیشت، سماجی بہبود، تعلیم اور سلامتی پر توجہ مرکوز کرنا زیادہ اہم ہے۔ اوسلو معاہدے کے تحت اسرائیل نے غزہ کو فلسطینی ریاست کا حصہ قرار دے کر انخلا کا وعدہ کیا تھا۔ اب خود اس کے بقول اس کی وہاں موجودگی فلسطینیوں کی مزاحمتی صلاحیت ختم کر کے امن قائم کرنے کے لیے تھی۔ جب یہ مزاحمتی صلاحیت ختم ہونے کے بجائے مزید بڑھنے لگی تو مزید رسوائی سے بچنے کے لیے اپنے حصّے کا کام فلسطینی اتھارٹی سے لینے کا منصوبہ بنا کر غزہ سے بھاگنے میں ہی عافیت سمجھی۔ اسرائیل کو امید تھی کہ پی ایل او کی عمل داری اسرائیل کو اہلِ غزہ کی دراندازی سے بچائے گی۔ اس منصوبے کے لیے محمود دحلان، صائب عریقات اور محمود عباس جیسے لوگ اسرائیل سے رابطے میں تھے۔ اسرائیل کا یہ بھی خیال تھا کہ اگر پی ایل او کو استحکام نہ بھی ملا تو سب کو باہم لڑانے کے نقد منصوبے سے بھی وہ مطلوبہ نتائج حاصل کر لے گا۔ اسرائیل اپنے اس اقدام سے انتفاضہ کی آگ بھی مکمل بجھانا چاہتا تھا اور شرم الشیخ میں اس نے فلسطینی اور عرب رہنماؤں کو اس کی یقین دہانی بھی کروائی تھی۔ اسرائیل پر، فلسطینی ریاست کے قیام کا منصوبہ طے کرنے اور اس کی راہ میں حائل رکاوٹیں دور کرنے کے لیے امریکی دباؤ بھی تھا۔ کیونکہ عراق و افغانستان کو تباہ کرنے کے بعد صدر بش کو مسلم دنیا میں اپنا امیج بہتر بنانے کا چیلنج درپیش تھا۔ تل ابیب کے منصوبہ سازوں کا یہ بھی خیال تھا کہ انخلا کے بعد غزہ کے گرد فولادی دیوار کی تعمیر سے اسرائیل محفوظ ہو جائے گا۔ اور ساتھ غزہ کی بری و بحری ناکہ بندی سے معاشی صورتِ حال اتنی ابتر ہو جائے گی کہ فلسطینیوں کے لیے مزاحمت کے بجائے دو وقت کے کھانے کا بندوبست ہی اصل ترجیح قرار پائے گا۔ اور رہی سہی کسر وقتاً فوقتاً فضائی حملوں سے پوری کر دی جائے گی۔

حزب اللہ اسرائیل جنگ ۲۰۰۶ء

۱۲، جولائی ۲۰۰۶ء کو حزب اللہ کے جنگجوؤں نے اسرائیل میں داخل ہو کر اسرائیلی فوج کے ایک دستے پر

حملہ کیا جس میں تین اسرائیلی فوجی ہلاک ہو گئے۔ اس کارروائی میں حزب اللہ نے دو اسرائیلی فوجی گرفتار کر کے لبنان منتقل کر دیے۔ اسرائیلی فوج نے فوری طور پر ان فوجیوں کی رہائی کے لیے کارروائی کی لیکن اس کو مزید پانچ فوجیوں سے ہاتھ دھونا پڑے۔ اسی روز اسرائیلی وزیرِ اعظم ایہود اولمرٹ نے اس کارروائی کو اسرائیل کے خلاف اعلانِ جنگ قرار دے کر لبنان پر حملے کا حکم دے دیا۔ اسرائیل کے جنگی طیاروں نے بیروت سمیت ملک کے بیش تر حصوں پر بمباری شروع کر دی۔ لبنان کے ہوائی اڈوں، سڑکوں، پُلوں اور عسکری تنصیبات کو بھی نشانہ بنایا۔ اسرائیلی توپ خانے نے جنوبی لبنان میں حزب اللہ کے ٹھکانوں پر شدید شیلنگ کی۔ اسرائیلی فوجیں پیش قدمی کرتے ہوئے لبنانی سرحد سے چند کلو میٹر اندر تک آ گئیں۔ جواب میں حزب اللہ نے بھی اسرائیل پر راکٹوں سے تابڑ توڑ حملے شروع کر دیے۔ حزب اللہ نے اپنے جدید اور تباہ کن میزائلوں سے حیفا اور تل ابیب سمیت کئی شہروں کو نشانہ بنایا۔ اینٹی شپ گائیڈڈ میزائلوں سے اسرائیلی بندر گاہوں پر بھی حملے کیے۔ اسرائیلی سرحد پر فوجیوں کو شدید نقصان سے دو چار کیا۔ سرحدی علاقے کریات شمونہ سمیت کئی علاقوں میں حزب اللہ کے راکٹوں سے آگ بھڑک اٹھی۔ یہ جنگ تینتیس دن جاری رہی اور ۱۴، اگست ۲۰۰۶ء کو اقوامِ متحدہ کی قرارداد نمبر ۱۷۰۱ کے ساتھ ختم ہوئی۔ اس جنگ میں حزب اللہ کے پانچ سو جنگجو مارے گئے۔ لبنانی فوج کو بھی کافی نقصان پہنچا جبکہ ایک ہزار لبنانی شہری بھی مارے گئے۔ اسرائیل کے مطابق اس کے ایک سو بیس فوجی ہلاک اور ایک ہزار کے قریب زخمی ہوئے۔ پچاس سے زیادہ اسرائیلی شہری ہلاک اور ایک ہزار زخمی ہوئے۔ اس جنگ میں حزب اللہ کو ایران، شام، عراق اور لبنان آرمی کی حمایت حاصل رہی۔ امل تحریک، پاپولر فرنٹ فار دی لبریشن آف فلسطین، لبنان کمیونسٹ پارٹی اور چند دوسرے گروپ بھی اس جنگ میں حزب اللہ کے شانہ بشانہ شریک رہے۔

پارلیمانی انتخابات ۲۰۰۶ء

فلسطین کے ان پارلیمانی انتخابات میں حماس نے واضح کامیابی حاصل کی۔ حماس نے ایک سو بتیس نشستوں میں سے چوہتر نشستیں جیت لیں جبکہ الفتح نے پینتالیس نشستیں جیتیں۔ حماس نے الفتح کو ساتھ ملا

کر قومی حکومت قائم کرنے کی پیشکش کی لیکن الفتح نے اس پیشکش کو یک سر مسترد کر دیا۔ حماس نے اپنی حکومت تشکیل دی اور اسماعیل ہنیہ کو وزیرِ اعظم مقرر کیا جنھوں نے مارچ ۲۰۰۶ء میں حلف اٹھالیا۔

الفتح کی حماس دشمنی

حماس کی یہ کامیابی سب کے لیے ناقابلِ یقین اور حیرت انگیز تھی۔ کیونکہ حماس کو انتخابات میں شرکت کی اجازت ہی اس لیے ملی تھی کہ کسی کو بھی اس کی کامیابی کا یقین نہیں تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ الیکشن سے پہلے اس کی انتخابی مہم میں رکاوٹیں پیدا کرکے اس کے کارکنوں اور رہنماؤں کو گرفتار کرکے اپنے طور پر اس کی کامیابی کے امکانات معدوم کر دیے گئے تھے۔ اسماعیل ہنیہ نے جب اپنی کابینہ تشکیل دے دی تو الفتح اور اسرائیل نے حماس کی حکومت گرانے کے منصوبے کا فوری آغاز کر دیا۔ اسرائیل نے حماس کے رہنماؤں پر غزہ اور مغربی کنارے کے درمیان سفر کرنے پر پابندی عائد کر دی۔ اس کے کئی رہنما گرفتار کر لیے گئے۔ فلسطین کی بین الاقوامی امداد بند کر دی گئی۔ الفتح نے پبلک سیکٹر کو تنخواہوں کے مسئلے پر اکسا کر ہڑتالیں اور مظاہرے شروع کر دیے اور نوبت حماس کے رہنماؤں اور کارکنوں پر براہِ راست حملوں تک آ پہنچی۔ حماس نے مصالحت کی ہر ممکن کوشش کی اور عرب ممالک کی ہر مصالحتی کوشش کا بھی خیر مقدم کرتے ہوئے اس میں بھرپور شرکت کی۔ اس دوران سعودی فرماں رواشاہ عبداللہ نے مکہ معاہدے کے ذریعے حالات سدھارنے کی پوری کوشش کی۔ لیکن الفتح کسی صورت بھی حماس کو اقتدار میں دیکھنے کے لیے تیار نہ تھی۔ آخر جون ۲۰۰۷ء میں امریکہ اور اسرائیل کی آشیرباد سے صدر محمود عباس نے حماس کی منتخب حکومت گرا کے سلام فیاض کو وزیرِ اعظم نامزد کرکے نئی کابینہ تشکیل دینے کا اعلان کیا۔

غزہ سے الفتح کا خاتمہ

حماس کی حکومت گرانے کے بعد غزہ کے عوام کا الفتح کے خلاف کارروائی کے لیے حماس پر دباؤ مسلسل بڑھ رہا تھا۔ بالآخر حماس کے فوجی دستے حرکت میں آئے، باقی کا کام عوام نے کر دکھایا اور صرف چند دنوں

میں بھرپور عوامی حمایت سے غزہ سے الفتح کا بوریا بستر گول کر کے اسے بے دخل کر دیا گیا۔ اس کے بعد سے آج تک غزہ حماس کے قبضے میں ہے جبکہ الفتح مغربی کنارے تک محدود ہے۔

۲۰۱۴ء میں فلسطینی قومی معاہدے کے تحت رامی حمداللہ کی قیادت میں بننے والی وفاقی حکومت کا حماس نے خیر مقدم کرتے ہوئے بھرپور تعاون کیا۔ لیکن صدر عباس حماس کو اس کا حقِ نمائندگی دینے پر کبھی تیار نہ ہوئے۔ یہ وفاقی حکومت بھی محمود عباس نے تین بار تبدیل کی۔ ۲۰۰۷ء سے آج تک غزہ پر حماس کی حکومت ہے اور موجودہ حکومت اس کی تیسری حکومت ہے۔ اس وقت حماس اور غزہ کے عوام باہم لازم و ملزوم ہو چکے ہیں۔ الفتح کے معاشی بائیکاٹ اور تمام تر سازشی ہتھکنڈوں کے باوجود حماس کی قیادت نے کوئی بھی جذباتی فیصلہ نہیں کیا، بلکہ وہ آج بھی غزہ کو مغربی کنارے کا اٹوٹ انگ قرار دیتے ہیں۔

غزہ کی ناکہ بندی

اسرائیل نے ۲۰۰۸ء میں غزہ کی مکمل ناکہ بندی کا اعلان کرتے ہوئے اس کی زمینی اور سمندری حدود بند کر کے اہلِ غزہ کو مکمل محصور کر دیا۔ مصر کے ساتھ ملنے والی تقریباً سات میل کی سرحدی پٹی پر بھی مصر اور اسرائیل کی مشترکہ سیکیورٹی قائم کر دی گئی۔ یوں غزہ کو تین سو ساٹھ مربع کلومیٹر پہ محیط جیل میں تبدیل کر کے قیدیوں کے قتلِ عام اور ان کی نسل کُشی کی بھیانک مہم شروع کر دی گئی۔

غزہ کے خلاف اسرائیل کے فوجی آپریشن، ۲۰۰۶ء سے طوفان الاقصیٰ تک

ذیل میں صرف غزہ کے خلاف اسرائیل کے بڑے اور مشہور فوجی آپریشن کا ذکر ہے جن میں غزہ کو تاراج کیا جاتا رہا۔ جہاں تک معمول کی اسرائیلی دہشت گردی اور جارحیت کا تعلق ہے تو وہ اس عرصے میں غزہ میں روزانہ کی بنیاد پر بدستور جاری رہی۔

آپریشن سمر رینز ۲۰۰۶ء

جولائی ۲۰۰۶ء میں اسرائیل نے غزہ پر ایک بڑے زمینی اور فضائی حملے کا آغاز کیا، اسرائیل کے بقول

اس حملے کا مقصد مجاہدین کے راکٹ داغنے کی صلاحیت ختم کرنا، سرنگوں کے نیٹ ورک کی تباہی اور اپنے فوجی کی رہائی قرار دیا گیا۔ اس دوران اسرائیلی طیارے غزہ پر مسلسل بمباری کرتے رہے اور بھاری توپ خانوں سے بھی گولہ باری جاری رہی۔ کئی بار زمینی فوجوں نے دراندازی کی کوشش کی لیکن حماس اور اسلامی جہاد کے سخت جان مجاہدین نے ہر کوشش ناکام بنائی۔ اس دوران حماس اور القدس بریگیڈ مسلسل راکٹوں اور میزائلوں سے اسرائیلی شہروں کو نشانہ بناتے رہے۔ یہ جنگ چار ماہ تک جاری رہی لیکن اسرائیلی فوج ہزار کوششوں کے باوجود غزہ میں داخل نہ ہوسکی البتہ بمباری سے غزہ کا انفراسٹرکچر تباہ کرتی رہی۔ آخر فریقین میں فائر بندی ہوئی۔ اس جنگ میں پانچ سو سے زیادہ فلسطینی شہید اور پندرہ سو زخمی ہوئے۔ غزہ کا بجلی گھر اور سینکڑوں رہائشی عمارتیں تباہ ہوئیں۔

آپریشن کاسٹ لیڈ ۲۰۰۸ء

دو سال کے عرصے میں یہ اسرائیل کا غزہ کے خلاف دوسرا فوجی آپریشن تھا۔ غزہ کے مجاہدین نے بھی اسرائیل کے خلاف معرکۃ الفرقان کے نام سے جوابی آپریشن شروع کیا۔ یہ جنگ ۲۷، دسمبر ۲۰۰۸ء سے ۱۸، جنوری ۲۰۰۹ء تک یعنی بائیس روز جاری رہی۔ اسرائیلی بمباری سے پندرہ سو فلسطینی شہید ہوئے جن میں ایک تہائی معصوم بچے تھے، ہزاروں فلسطینی زخمی اور ہزاروں بے گھر بھی ہوئے۔ غزہ کے مجاہدین نے راکٹ حملوں سے جنوبی اسرائیل میں کئی مقامات کو نشانہ بنایا۔ چالیس اسرائیلی فوجی اور یہودی شہری ہلاک ہوئے۔

آپریشن پلر آف ڈیفنس ۲۰۱۲ء

۱۴، نومبر ۲۰۱۲ء کو اسرائیل نے حماس کے مذاکرات کاروں احمد الجباری اور محمد الحمس کو مکاری سے شہید کر دیا اور ساتھ ہی اسرائیلی طیاروں نے غزہ پر اندھا دھند بمباری شروع کر دی۔ یہ جنگ ایک ہفتے تک جاری رہی اور سو عورتوں اور بچوں سمیت دو سو سے زائد فلسطینی شہید اور پندرہ سو زخمی ہوئے۔ مجاہدین نے سبیل الحجارۃ (شیل اسٹونز) کے نام سے اسرائیلی بربریت کا جواب دیتے ہوئے اسرائیلی شہروں پر پندرہ سو سے

زیادہ راکٹ و میزائل فائر کیے۔ جس سے پندرہ اسرائیلی فوجی اور سات یہودی شہری ہلاک ہوئے، تین سو کے قریب یہودی زخمی ہوئے۔

آپریشن پروٹیکٹو ایج ۲۰۱۴ء

اسرائیل کا غزہ پر یہ فوجی آپریشن ۸، جولائی ۲۰۱۴ء سے ۲۶، اگست ۲۰۱۴ء تک پچاس دن جاری رہا۔ اسرائیلی بمباری سے ڈھائی ہزار سے زیادہ فلسطینی شہید ہوئے، جن میں تین سو سے زیادہ ایسے بچے تھے جن کی عمریں چھے سال سے کم تھیں۔ بارہ ہزار سے زیادہ زخمی ہوئے جن میں چار ہزار بچے شامل تھے، اسرائیل کی وحشیانہ بمباری سے غزہ کے کئی علاقے کھنڈر بن گئے۔ بیس ہزار گھر مکمل تباہ ہوئے جبکہ ایک لاکھ گھر متاثر ہوئے۔ اسلامی جہاد اور حماس نے العصف المأکول اور البنیان المرصوص نامی آپریشن سے اس کا جواب دیتے ہوئے اسرائیلی شہروں کو نشانہ بنایا۔ جس سے بن گوریان ہوائی اڈہ بند ہو گیا اور اسرائیل میں فضائی سروس شدید متأثر ہوئی۔ غزہ سے ہونے والے میزائل حملوں میں مغربی میڈیا کے بقول اسی کے قریب یہودی ہلاک اور آٹھ سو کے قریب زخمی ہوئے۔

غزہ پر بمباری اور میزائل حملے ۲۰۱۹ء

نومبر ۲۰۱۹ء میں اسرائیل نے غزہ پر میزائل اور ڈرون حملے شروع کیے جن میں اسلامی جہاد کے رہنما ابو العطا اور اکرم الاجوری شہید ہو گئے۔ اس کے بعد غزہ پر فضائی بمباری شروع کر دی جس سے پچاس سے زیادہ فلسطینی شہید اور تین سو سے زیادہ زخمی ہوئے۔ غزہ کے کئی تجارتی مراکز اور رہائشی بلاک بھی تباہ کر دیے گئے۔ اسلامی جہاد اور حماس کے کئی مجاہدین بھی شہید ہوئے۔ اسلامی جہاد اور حماس نے صیحۃ الفجر کے نام سے جوابی کارروائی کا آغاز کیا اور اسرائیل کے سینکڑوں مقامات کو تباہ کن میزائلوں اور راکٹوں سے نشانہ بنایا جس سے اسرائیل کو شدید نقصان پہنچا اور اسرائیلی عوام کے دباؤ کی وجہ سے اسرائیل کو بمباری روکنی پڑی۔

مسجدِ اقصیٰ سے غزہ تک اسرائیلی دہشت گردی ۲۰۲۱ء

اپریل ۲۰۲۱ء میں اسرائیل نے شیخ جراح محلے میں کئی عشروں سے مقیم فلسطینیوں کے سات خاندانوں کو یہاں سے بے دخل کرنے کا منصوبہ بنایا۔ شیخ جراح کا محلہ مشرقی بیت المقدس میں دمشق دروازے کے قریب واقع ہے۔ اس کے بعد اسرائیلی سپریم کورٹ نے بھی ان خاندانوں کی بے دخلی کا فیصلہ سنایا۔ جس پر حالات کشیدہ ہوگئے۔ پورے علاقے کے مسلمان ان کی حمایت میں سڑکوں پر نکل آئے۔ اسرائیلی افواج نے مظاہرین پر شدید مظالم ڈھائے۔ اسرائیلی فوجیوں نے مسجدِ اقصیٰ کے صحن میں نمازیوں پر حملہ کیا جس سے دو سو کے قریب نمازی زخمی ہوئے۔ اس اسرائیلی بربریت اور مسجدِ اقصیٰ کی بے حرمتی کی وجہ سے پورے فلسطین میں احتجاج شروع ہوگیا۔ نابلس، خلیل، رام اللہ، بیتِ لحم اور قلقیلیہ میں بڑے احتجاجی مارچ ہوئے جن پر اسرائیلی فوج کی براہِ راست فائرنگ سے درجنوں مسلمان شہید ہوئے۔

اسرائیل کا غزہ پر حملہ

اسرائیل نے غزہ پر بھی شدید بمباری شروع کردی۔ غزہ کے رہائشی علاقے، سکول اور اسپتال تباہ کردیے گئے۔ ۱۴۰۰ رہائشی عمارتیں ملبے کا ڈھیر بنادی گئیں۔ ۷۵ ہزار فلسطینی بے گھر ہوئے۔ غزہ میں تین سو کے قریب فلسطینی شہید ہوئے جن میں نصف سے زیادہ معصوم بچے، خواتین اور بوڑھے شامل تھے۔ جبکہ دو ہزار سے زیادہ زخمی ہوئے جن میں دو سو سے زیادہ ہمیشہ کے لیے معذور ہوئے۔ ۷، مئی کو اسرائیل نے مسجدِ اقصیٰ میں نمازیوں کے داخلے پر پابندی لگادی۔ ۱۰، مئی کو اسرائیلی افواج نے مسجدِ اقصیٰ پر پھر دھاوا بولا۔ اس بار پہلے سے بھی بڑھ کر تشدّد کیا گیا۔ صحافی اور طبی عملے کے اراکین سمیت تین سو لوگ زخمی ہوئے۔

غزہ کے مجاہدین کا کرارا جواب

حماس اور اسلامی جہاد نے اسرائیلی شہروں پر راکٹوں اور میزائلوں سے تابڑ توڑ حملے شروع کردیے۔ مجاہدین نے چند دنوں میں اسرائیل پر پانچ ہزار راکٹ داغے اور اسرائیل کے اہم مقامات کو نشانے پر لے کر

اسرائیل میں کھلبلی مچادی۔ پورے اسرائیل میں ایمرجنسی لگادی گئی۔ مجاہدین کے تباہ کن راکٹ حملوں کی وجہ سے کئی بین الاقوامی پروازیں منسوخ ہوگئیں۔ کئی شہروں میں پارک سمیت دیگر عوامی مقامات بند کر دیے گئے۔ فلسطینی عوام کی بغاوت اور مجاہدین کے حملوں سے حالات اس قدر کشیدہ ہوئے کہ آخر اسرائیل نے خود مصر سے ثالثی کرواکر حالات بہتر بنائے۔ اس جنگ کو فلسطینی عوام نے مجاہدین کی ایک بڑی فتح قرار دیا۔ عرب میڈیا نے بھی اس جنگ میں حماس اور اسلامی جہاد کو فاتح قرار دیا۔

آپریشن ٹروڈان

۵، اگست ۲۰۲۲ء کو اسرائیل نے غزہ پر ٹروڈان کے نام سے اس آپریشن کا آغاز کیا۔ پہلے ڈرون کے ذریعے غزہ کی مشہور عمارت فلسطین ٹاور کو نشانہ بنایا اس کے بعد جنگی طیاروں سے بمباری شروع کر دی۔ اسرائیل کے فضائی حملوں میں پچاس فلسطینی شہید اور دو سو پچاس سے زیادہ زخمی ہوئے اور ایک بار پھر کئی عمارتیں تباہ کردی گئیں۔ غزہ کے مجاہدین نے ایک بار پھر اسرائیلی شہروں اور قصبوں پر سینکڑوں راکٹ داغے۔

فلسطینیوں کا ردِّعمل

۷، اکتوبر ۲۰۲۳ء کو اسرائیل کی سال ہا سال کی جارحیت کے ردِّعمل میں اور آزادیِ فلسطین کی تحریک کو آگے بڑھانے کے لیے غزہ میں معرکہ طوفان الاقصیٰ کا اعلان کیا گیا۔ فلسطینی مجاہدین نے ایک ہی دن متعدّد اسرائیلی شہروں پر حملہ کردیا۔ اس حملے میں زمینی کارروائی بھی شامل تھی، بحری بھی اور فضائی بھی۔ مجاہدین نے ایک دن میں پانچ ہزار سے زائد راکٹ فائر کیے اور پیراشوٹ کے ذریعے مختلف علاقوں میں داخل ہوکر بڑے پیمانے پر اسرائیل کا نقصان کیا۔ متعدّد شہری اور سپاہی قید ہوئے۔ پندرہ سو سے زائد ہلاک اور بے شمار زخمی ہوئے۔

مغربی کنارے اور مشرقی بیت المقدس میں فلسطینی مزاحمت پر ایک نظر: (۲۰۰۶۔۲۰۲۳ء)

انتفاضہ الاقصیٰ کے دوران مغربی کنارے کے گرد دیوار کی تعمیر کے بعد اسرائیل نے دراندازی پر تو کافی حد تک قابو پالیا، لیکن اب مشرقی یروشلم اور مغربی کنارے میں فلسطینی مزاحمت نے بالکل نیا روپ اختیار کر

لیا۔ یہ مزاحمت اب کسی تنظیمی وابستگی یا ہدایات کے بغیر غیر منسلک افراد کی طرف سے اپنے طور پر بغیر کسی منصوبہ بندی کے تھی۔ مؤرخین اس کو Lone Wolf Attack قرار دیتے ہیں۔ ان علاقوں میں اب فلسطینیوں کی مزاحمت؛ فائرنگ، آپریشن، بمباری یا دھماکوں کے بجائے غیر روایتی ہتھیاروں اور گاڑیوں کے استعمال کی صورت میں تھی۔ یہودیوں کے سفاکانہ قبضے اور مزید توسیع پسندانہ عزائم کی وجہ سے غیظ و غضب سے بپھرے فلسطینی یہودیوں پر گاڑی چڑھا دیتے۔ پتھر مار کر کسی یہودی کا سر توڑ دیا جاتا۔ یہودیوں پر لاتوں، مکوں، ڈنڈوں سے حملہ آور ہو جاتے۔ یا خاموشی سے گزرتے ہوئے اچانک کسی اسرائیلی فوجی کے پیٹ میں چُھرا گھونپ دیا جاتا۔ ان کارروائیوں کا ہدف زیادہ تر اسرائیلی فوجی رہے۔ ''غلیل'' فلسطینیوں کا مشہور ہتھیار بن گئی۔ بالخصوص فلسطینی بچے اس سے تاک تاک کر یہودیوں کو نشانہ بناتے اور یہ سب بغیر کسی تنظیمی وابستگی اور ہدایت کے تھا۔ فلسطینیوں کی اس مزاحمت نے اسرائیلی فوج کو چکرا کر رکھ دیا۔ یہودیوں کی طرف سے سفاکانہ کارروائیوں کے بعد اس مزاحمت میں اور شدت آجاتی۔ پتھروں، ڈنڈوں اور ہاتھوں سے حملے تو معمول بن گئے۔ ۲۰۰۶ سے ۲۰۱۲ء تک مغربی کنارے میں اوسطاً ہر ہفتے چاقو کے دس سے زیادہ حملے ہوئے جبکہ گاڑی سے حملہ آور ہونے کی اوسط فی مہینا دو حملے رہی۔ لیکن ۲۰۱۲ء کے بعد اس میں حیرت انگیز طور پر اضافہ ہونے لگا۔ ۲۰۰۸ء میں غیظ و غضب سے بپھرے چند فلسطینی نوجوان بغیر کسی اسلحے کے مشرقی بیت المقدس میں اسرائیلی فوج کے ایک دستے پر جھپٹ پڑے جنھوں نے لاتوں، مکوں سے اسرائیلی فوجیوں کے ہوش اڑا دیے۔ پتھر کا جواب گولی سے دیتے ہوئے ان فوجیوں نے ان میں سے تین کو شہید اور پانچ کو شدید زخمی کر ڈالا۔ اور سب کے مکانات تباہ کر دیے گئے۔ ۲۰۰۹ء میں خلیل میں غلیل سے ''مسلّح'' بچوں پر اسرائیلی درندے ٹوٹ پڑے، کئی بچوں کو اٹھا اٹھا کر زمین پر پٹخا جس سے ان کے کلیجے پھٹ گئے۔ تین بچے شہید اور کئی زخمی و بے ہوش ہوئے۔ ۲۰۰۸ء میں ایک فلسطینی نے بلڈوزر کے ذریعے چار اسرائیلی ہلاک اور چالیس زخمی کیے۔ ۲۰۱۱ء میں نابلس میں ایک محلّے پر دھاوا بولنے والے اسرائیلی ٹینکوں کے راستے میں نہتے معصوم فلسطینی بچے سینہ تان کر کھڑے ہو گئے۔ اسرائیلی بربریت نے ان معصوم کلیوں کو بھی روند ڈالا۔ ایک بچہ شہید اور کئی شدید زخمی ہوئے۔

اس دوران مجاہدین کی کارروائیاں بھی جاری رہیں، جیسے: ۲۰۰۸ء میں نابلس میں مجاہدین کے مشترکہ حملے

میں چار فوجی ہلاک اور کئی زخمی ہوئے۔ ۲۰۱۱ء میں ایلات میں اسلامی جہاد کے حملے میں فوجیوں سمیت دس یہودی ہلاک اور چالیس سے زیادہ زخمی ہوئے۔ اور بھی چھوٹے پیمانے پر کئی حملے ہوئے۔

تیسری انتفاضہ: انتفاضۃ القدس یا انتفاضۃ السکاکین (۲۰۱۴۔۲۰۱۶ء)

۲۰۱۴ء میں اسرائیلی ٹینکوں پر پتھر مارتے ہوئے ایک معصوم فلسطینی بچے محمد ابو خضیر کو اسرائیلی فوجیوں نے اغوا کر کے زندہ جلا دیا۔ اور اس کی جلی ہوئی لاش دیرِ یاسین کے جنگل میں پھینک دی۔ جولائی ۲۰۱۵ء میں ضلع نابلس میں دعوبشہ خاندان کے ایک گھر کو اسرائیلی فوجیوں نے آگ لگا دی جس میں اٹھارہ ماہ کے بچے سمیت چار افراد زندہ جل گئے اور ایک چار سالہ بچے سمیت پانچ افراد شدید جھلس گئے۔ اس خاندان کا جرم اسرائیلی درندگی کے خلاف مظاہرے تھے۔ اسی سال اسرائیلی جیلوں میں قید فلسطینی قیدیوں نے ہڑتال کر دی جو دو ماہ تک جاری رہی۔ اسی سال ایک بار پھر مسجدِ اقصیٰ پر دھاوا بولا گیا اور وہاں جھنڈا لگانے پر پابندی کے ساتھ ساتھ مرابطات خواتین پر بھی پابندی لگا دی گئی۔ ستمبر ۲۰۱۵ء میں پورے مغربی کنارے اور مشرقی بیت المقدس میں مظاہرے پھوٹ پڑے اور ساتھ ساتھ فلسطین کے شہروں، دیہاتوں اور کیمپوں میں فلسطینیوں نے ڈنڈوں، پتھروں، چُھروں اور گاڑیوں سے اسرائیلیوں پر حملے شروع کر دیے۔ اس انتفاضہ کو سکاکین یعنی چھریوں کی انتفاضہ بھی کہتے ہیں کیونکہ اس دوران فلسطینیوں نے اس ہتھیار کا خوب استعمال کیا۔ کئی مواقع پر فلسطینی نوجوانوں نے اسرائیلی فوجی کو چاقو کے وار سے قتل کر کے اس کا اسلحہ چھین کر اس سے اسرائیلی فوجی جہنم واصل کیے۔ ایسا ہی ایک بڑا حملہ بیت المقدس میں ہوا جہاں کئی اسرائیلی فوجی ہلاک ہوئے۔ یہ واقعات ۲۰۱۶ء کے آخر تک جاری رہے۔ اس دوران یہودیوں نے اسرائیل میں موجود کئی عربوں پر چھریوں کے وار کر کے انھیں شہید کیا جن کا اس لڑائی سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اس انتفاضہ کے دوران فلسطینیوں کی طرف سے چاقو کے دو سو پچاس حملے، فائرنگ کے سو حملے اور گاڑی سے کچلنے کے پچاس واقعات ریکارڈ ہوئے۔ اسرائیلی میڈیا کے مطابق ان حملوں میں پچاس سے زیادہ یہودی ہلاک اور چار سو سے زیادہ زخمی ہوئے۔ جبکہ اسرائیلی حملوں میں مشرقی بیت المقدس اور مغربی کنارے میں تین سو سے زیادہ فلسطینی شہید اور بارہ ہزار سے زیادہ زخمی ہوئے۔ پانچ ہزار سے زیادہ فلسطینی گرفتار ہوئے

جن میں ایک ہزار خواتین شامل تھیں۔ ان میں سے درجنوں فلسطینی قیدیوں کو پھانسیاں بھی دی گئیں۔ اسرائیلی حملوں میں فلسطینیوں کے سینکڑوں مکانات بھی تباہ ہوئے۔

ایک اسرائیلی فوجی کے بدلے ایک ہزار فلسطینیوں کی رہائی

۲۰۱۱ء میں اسرائیل کو اپنے ایک فوجی کے بدلے ایک ہزار ستائیس فلسطینی قیدیوں کو اپنی جیلوں سے رہا کرنا پڑا۔ اس فوجی کا نام گیلا دشالت تھا جسے حماس نے ۲۰۰۶ء میں کریم شالوم (کرم ابوسالم) ملٹری سائٹ میں سرنگ کے ذریعے کیے گئے ایک حملے میں گرفتار کیا تھا۔ حماس کے اس حملے میں اسرائیلی بکتر دستے کے پانچ فوجی ہلاک بھی ہوئے تھے۔

امریکہ کا بیت المقدس کو اسرائیلی دار الحکومت تسلیم کرنے کا اعلان

دسمبر ۲۰۱۷ء میں امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ نے اعلانِ بال فور کے سو سال مکمل ہونے پر القدس کو اسرائیلی دارالحکومت قرار دے کر اپنا سفارت خانہ وہاں منتقل کرنے کا فیصلہ کیا جس پر ایک بار پھر فلسطین میں مظاہرے پھوٹ پڑے۔ یہودی کالونیوں اور فلسطینی آبادیوں کو ملانے والے مقامات پر شدید مظاہرے ہوئے جن پر اسرائیلی فائرنگ سے درجنوں فلسطینی شہید ہوئے۔ اسرائیلی پارلیمنٹ نے ۱۹۸۰ء میں ''یروشلم قانون'' منظور کیا تھا جس میں مشرقی بیت المقدس کا بھی الحاق کر کے پورے بیت المقدس کو اسرائیل کا دار الحکومت قرار دیا گیا تھا۔ لیکن اقوامِ متحدہ نے قرارداد نمبر ۴۷۸ منظور کر کے اس قانون کو کالعدم قرار دیا تھا۔

دیوارِ غزہ

اسرائیل نے غزہ کے گرد شروع سے باڑ قائم کر رکھی ہے جس کو ۱۹۹۴ء کے بعد اپ گریڈ کیا جاتا رہا ہے۔ مگر غزہ کے گرد جدید ترین ٹیکنالوجی سے لیس اس آہنی دیوار پر کام کا آغاز ۲۰۱۶ء میں ہوا۔ اس دیوار کی لمبائی پینسٹھ کلومیٹر ہے۔ یہ دیوار ایک اعشاریہ ایک بلین ڈالر کی لاگت سے ۲۰۲۱ء میں مکمل ہوئی۔ اس کی تعمیر میں ایک لاکھ چالیس ہزار ٹن لوہا اور سٹیل استعمال ہوا۔ جبکہ ساڑھے تین لاکھ ٹرک ریت اور کنکریٹ استعمال

ہوئی۔ بارہ سو کارکنوں نے اس کو چار سال میں مکمل کیا۔ اس دیوار کے دو حصے ہیں: پہلا حصہ زیرِ زمین کنکریٹ کی مضبوط دیوار ہے جو دس میٹر گہری ہے۔ اور یہ سرنگوں سے بچنے کے لیے بنائی گئی ہے۔ جس میں سرنگ کا پتا لگانے کے لیے سینسر نصب کیے گئے ہیں۔ دوسرا حصہ سطحِ زمین پر چھے میٹر اونچی اسٹیل کی باڑ ہے۔ جس پر ریڈار، کیمرے، سینسر اور ریموٹ کنٹرول ہتھیار بھی نصب کیے گئے ہیں اور دیوار کے قریب گارڈ ٹاور بھی قائم کیے گئے ہیں۔ اس دیوار میں دو مشہور کراسنگ پوائنٹ ہیں: ایک کریم شالوم (کرم ابوسالم) کراسنگ ہے جو جنوبی اسرائیل کی طرف ہے اور اس کو مصر کی طرف سے آنے والے سامان کے لیے استعمال کیا جاتا ہے کیونکہ غزہ آنے والے سامان کو اسرائیل کی طرف سے براہِ راست رفح کراسنگ کے ذریعے غزہ میں داخل ہونے کی اجازت نہیں۔ دوسرا اریز کراسنگ پوائنٹ (بیتِ حانون) ہے جو شمال میں عسقلان شہر کی طرف ہے۔ یہاں دیوار ساحل کے ساتھ سمندر کے اندر تک لے جائی گئی ہے۔

غزہ اور مصر کے درمیان زیرِ زمین فولادی دیوار

اسرائیل اور مصر کی سرحد غزہ سے ایلات تک پھیلی ہوئی ہے جس پر اسٹیل کی باڑ نصب کی گئی ہے لیکن مصر اور غزہ کے درمیان سرحد پر زیرِ زمین بھی فولادی دیوار قائم کی گئی ہے جس کا مقصد فلسطینیوں کو سرنگوں کے ذریعے مصر میں داخل ہونے سے روکنا ہے۔ یہ دیوار مصر نے اسرائیل، امریکہ اور فرانس کے ذریعے قائم کی ہے اور اس پر ۲۰۰۹ء میں کام شروع ہوا۔ یہ دراصل امریکہ میں تیار ہونے والے اسٹیل کے پینلز ہیں جو پچاس سینٹی میٹر موٹے ہیں۔ یہ تیس میٹر کے پینلز زیرِ زمین گاڑے گئے ہیں جو اینٹی ڈائنامائٹ ہیں اور ان پر سینسر سسٹم نصب کیا گیا ہے۔ زمین کی سطح کے اوپر بھی دیوار اور باڑ ہے جو جدید ترین سیکیورٹی سسٹم سے لیس ہے اور اس میں الیکٹرانک گیٹ بھی ہیں۔

طوفان الاقصیٰ آپریشن تک

۲۰۱۵ء سے ۲۰۲۳ء تک یہودی قبضے و جارحیت اور آبادیوں میں توسیع کے خلاف فلسطینی مسلسل سراپا

احتجاج رہے۔ جبکہ صیہونی جارحیت اور معصوم فلسطینیوں کے قتلِ عام کی بھیانک مہم بھی بدستور جاری رہی۔ بیت المقدس اور مغربی کنارے کے شہروں، قصبوں اور کیمپوں میں اسرائیلی کارروائیوں سے ہزاروں فلسطینی شہید ہوئے۔ ۲۰۱۵ء سے طوفان الاقصیٰ تک صیہونی فوج کے ہاتھوں دس ہزار سے زائد فلسطینی شہید ہوئے۔ جبکہ اس عرصے میں پچپن ہزار فلسطینی گرفتار ہوکر صیہونی عقوبت خانوں میں بدترین تشدد کا نشانہ بنے۔ زخمی و معذور اور بے گھر ہونے والے فلسطینیوں کی تعداد لاکھوں میں ہے۔ اس دوران فلسطینی مجاہدین کے اسرائیلی فوج پر حملے بھی بدستور جاری رہے۔

۲۰۲۳ء یعنی طوفان الاقصیٰ کے سال بھی پہلے آٹھ مہینوں میں صہیونیوں پر چالیس کے قریب حملے ہوئے حتیٰ کہ دار الحکومت تل ابیب میں بھی چار حملے ہوئے۔ ۲۶، جنوری ۲۰۲۳ء کو اسرائیلی افواج نے جنین کیمپ میں محاصرہ کرکے السباغ خاندان کے گھر کو آگ لگادی جس سے دس افراد جل کر شہید ہوگئے، جن میں بوڑھی خواتین بھی شامل تھیں۔ اس کے ردِّعمل میں دوسرے دن اکیس سالہ فلسطینی نوجوان خیری علقم نے بیت المقدس میں حملہ کرکے سات یہودی ہلاک اور دس زخمی کیے۔ ۲۸، جنوری ۲۰۲۳ء کو تیرہ سالہ فلسطینی بچے نے مشرقی بیت المقدس کے محلے سیلوان میں حملہ کرکے دو یہودی قتل کردیے۔ ۱۳، فروری ۲۰۲۳ء کو تیرہ سالہ فلسطینی بچے محمد باسل فتحی نے القدس کی شعفاط چوکی پر ایک اسرائیلی کمانڈو کے پیٹ میں چھرا گھونپ کر اسے جہنم واصل کردیا۔ ۱۰، فروری ۲۰۲۳ء کو القدس کے محلے راموت میں ایک فلسطینی نوجوان حسین خالد نے گاڑی سے کچل کر چار یہودی ہلاک اور پانچ زخمی کردیے۔

نابلس میں یہودی تشدد

۲۶، فروری ۲۰۲۳ء کو نابلس کے قصبے حوارہ میں میں چار سو یہودیوں نے اپنی فوج کی نگرانی میں اکٹھے ہوکر مسلمانوں کی املاک پر دھاوا بول دیا۔ یہودیوں کے تشدد سے چار سو فلسطینی بوڑھے، بچے اور خواتین زخمی ہوئیں۔ اسکول، املاک اور گاڑیوں کو آگ لگادی گئی۔ اس کے ردِّعمل میں خلیل سے جنین تک فلسطینیوں نے بغیر کسی تنظیمی وابستگی اور ہدایات کے صرف پانچ دنوں میں یہودیوں پر بیس حملے کیے۔

فلسطینیوں کی جدوجہدِ آزادی ایک سو چھے سالوں پر محیط ہے۔ جو مسلسل و مربوط ہونے کے ساتھ ساتھ بہادری و استقامت میں بھی بے مثال ہے۔ تاریخ میں اتنے بڑے ظالموں کے خلاف اتنے کمزور مظلوموں کی اتنی طویل و مسلسل مزاحمت کی مثال نہیں ملتی۔ جیسے جیسے ظلم کے انداز و اوزار بدلتے رہے اسی طرح مزاحمت کے تیور بھی تبدیل ہوتے رہے۔ قتلِ عام کی بھیانک مہمات، نسل کُشی اور جبر و تشدّد کے لرزہ خیز و بدترین مناظر کے باوجود اس مزاحمت کی روانی کبھی متاثر نہیں ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ طاقت ور ظالم اپنی ہر سفاکی کے باوجود ہمیشہ بوکھلاہٹ اور خوف کا شکار رہا۔ کبھی بھی اسے استحکام اور قرار نصیب نہ ہو سکا۔ فلسطین کی جدوجہدِ آزادی کی تحریک پوری دنیا کے محکوموں کے لیے ہمیشہ امید کی کرن اور عزم و ہمت کا سامان رہی۔ آج جب دنیا اس مزاحمت کے ماند پڑنے کی غلط فہمی کا شکار ہونے لگی تھی تو غزہ سے اٹھنے والے طوفان الاقصیٰ انقلاب نے کم از کم مزید ایک سو چھے سالوں کے لیے اس مزاحمت کو زندہ و توانا بنا دیا ہے۔

آزادیِ فلسطین کی جدوجہد میں خواتین کا کردار

فلسطین کی باہمت خواتین آزادی کی جدوجہد میں روزِ اوّل سے مردوں کے شانہ بشانہ شامل رہی ہیں۔ تحریکِ آزادی کے مختلف مراحل کے دوران ہر سطح پر خواتین نے انتہائی مؤثر کردار ادا کیا۔ ۱۹۲۰ء میں برطانوی و یہودی عزائم کے خلاف بیت المقدس میں منعقد ہونے والے ایک بڑے احتجاجی مظاہرے میں خواتین نے بھی بھرپور شرکت کی۔ ۱۹۲۱ء میں نابلس شہر میں فلسطینی خاتون مریم عبدالغنی کی صدارت میں الجمعیۃ النسائیہ کے نام سے خواتین کی ایک انجمن قائم ہوئی۔ اس انجمن نے فلسطین کو لاحق خطرات کے حوالے سے فلسطینی خواتین کے ہاں بیداری پیدا کرنے میں کلیدی کردار ادا کیا۔ خواتین کی یہی انجمن آگے جا کر ایک بڑا عسکری و سیاسی کردار بنی جب اس کی تحریک پر فلسطینی خواتین نے اپنے ملک کو درپیش خطرات پر غور و خوض اور ان سے نمٹنے کے متعلق لائحۂ عمل تشکیل دینے کے لیے بیت المقدس میں ایک تاریخی کانفرنس کا اہتمام کیا۔ یہ کانفرنس جو ۲۶، اکتوبر ۱۹۲۹ء کو بیت المقدس میں عونی عبدالہادی کے گھر شیخ کاظم الحسینی کی اہلیہ رقیہ الحسینی کی صدارت میں منعقد ہوئی، اس وقت کی عرب دنیا میں خواتین کا سب سے بڑا احتجاج ثابت ہوئی۔ جس میں فلسطین بھر سے تین سو

سے زیادہ بااثر اور اعلیٰ تعلیم یافتہ خواتین نے شرکت کی۔ اس کانفرنس میں یہودیوں کا مکمل بائیکاٹ کرنے کے عزم کے ساتھ ساتھ فلسطینی خواتین نے مردوں کے شانہ بشانہ اپنے ملک کے لیے ہر قربانی دینے کی قسم کھائی۔ کانفرنس کے دوران بال فور اعلامیے اور فلسطین میں یہودی آبادکاری کے فیصلے کو یکسر مسترد کرنے کے ساتھ فلسطینی قومی حکومت کے قیام کا بھی مطالبہ کیا گیا۔ ایک ایگزیکٹو کمیٹی کی بھی منظوری دی گئی جس کے تحت فلسطین کے تمام شہروں میں ذیلی شاخیں قائم کرنے اور مسئلۂ فلسطین کو اجاگر کرنے کے لیے عرب اور دیگر ممالک کی خواتین تنظیموں کے ساتھ رابطے قائم کرنے پر زور دیا گیا۔ ایگزیکٹو کمیٹی کے لیے یہ بھی لازم قرار دیا گیا کہ وہ برطانوی و یہودی مظالم کے متاثرین اور مجاہدین کے لیے مالی امداد جمع کرنے کا نظم قائم کرے۔ کانفرنس کے اختتام پر ان خواتین نے ساٹھ گاڑیوں میں سوار ہو کر القدس شہر میں مارچ کیا اور مختلف ممالک کے قونصل خانوں سے گزرتی ہوئی برطانوی ہائی کمشنر کے دفتر پہنچیں، جہاں انھوں نے ایک یادداشت پیش کی جس میں اعلانِ بال فور کی فوری منسوخی اور فلسطین میں یہودی آبادکاری فوری روکنے کا مطالبہ کیا گیا۔ اس کانفرنس کے بعد فلسطینی خواتین ایسی متحرک ہوئیں کہ جدوجہدِ آزادی کی پوری تاریخ کا لازمی حصہ بن گئیں۔ ۱۹۳۳ء میں فلسطینی خواتین نے بیت المقدس میں انگریزوں اور یہودیوں کے خلاف عظیم الشان احتجاجی مظاہرہ کیا۔ ۱۹۳۷ء میں قاہرہ میں منعقد ہونے والی عرب خواتین کی کانفرنس میں فلسطینی خواتین نے بھرپور شرکت کی اور ان کی وجہ سے مسئلۂ فلسطین پوری کانفرنس کے دوران چھایا رہا۔ ۱۹۳۶ سے ۱۹۴۸ء تک جاری رہنے والے جہاد کے دوران فلسطینی خواتین مجاہدین کے لیے مالی امداد جمع کرنے میں پیش پیش رہیں۔ معرکوں میں مجاہدین کے لیے کھانے پینے کا بندوبست کرتیں، ان کو پناہ گاہیں فراہم کرتیں، اسلحہ و گولہ بارود ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرتیں اور زخمی ہونے والوں کے لیے طبی خدمات انجام دیتیں، کئی خواتین نے تو بندوق اٹھا کر میدانِ کارزار میں بھی اپنی بہادری کے جوہر دکھائے۔ مشہور گوریلا خاتون فاطمہ خاصکیہ اسی دور کی عظیم خاتون ہیں۔

۱۹۶۰ء کے بعد سے شروع ہونے والے انقلاب میں فلسطینی خواتین کا کردار ہر سطح پر نمایاں ہونا شروع ہوا۔ اب یہ عسکری شعبے کا اہم حصہ بن گئیں اور مردوں کے ساتھ بڑے بڑے معرکوں میں حصہ لینے لگیں۔ فلسطین کے اندر اور باہر اہم عسکری کارروائیوں میں شامل رہیں۔ کئی گوریلا کارروائیوں کی قیادت خواتین نے

کی۔ طیارہ ہائی جیک مہم سے لے کر بسوں کے اغوا اور فدائی کارروائیوں سمیت اس دور کے مزاحمتی میدان میں خواتین چھائی رہیں۔ کئی خواتین بہادری سے لڑتے ہوئے شہید ہوئیں، گرفتار ہوئیں اور اپنی بہادری کا ڈنکا پوری دنیا میں بجاتی رہیں۔ لیلیٰ خالد، دلال المغربي اور شاذیہ ابوغزالہ اسی دور کے مشہور کردار ہیں۔

فلسطینی خواتین نے ۱۹۶۵ء میں اپنی توانائیوں کو متحد و منظم کرنے کے لیے خواتین کی جنرل یونین GUPW تشکیل دی۔ زلیخا الشهبي اور سمیرا ابوغزالہ کی صدارت میں قائم یہ یونین ۱۹۶۸ء میں خواتین کی عالمی یونین کی بھی رکن بن گئی۔

فلسطین میں پہلی انتفاضہ سے ان عفت مآب خواتین نے اپنے کردار کو اور جامع انداز سے منظم کیا۔ اب یہ بڑے بڑے عسکری منصوبے ترتیب دینے لگیں۔ احتجاجی مظاہروں کی قیادت کرتیں اور مسلح جدوجہد سے لے کر معاشی، سیاسی اور سماجی جدوجہد تک ہر شعبے میں ان کا کردار نمایاں ہوگیا۔ جہادِ آزادی کے ہر دور میں فلسطینی خواتین نے مجاہدین کو محفوظ پناہ گاہوں اور کھانے پینے کی فراہمی کے ساتھ ساتھ ہتھیاروں کی سپلائی میں بھی بھرپور معاونت کی اور تاریخ میں ایسے کئی واقعات ہیں جن میں فلسطینی خواتین نے اپنی جانوں پر کھیل کر مجاہدین کو محفوظ راستہ فراہم کیا۔ اسلامی جہادی تحریکات کے قیام میں بھی ان خواتین کا اہم کردار رہا۔ یہ خواتین مجاہدین کی معلمات و مرّبیات رہیں، اپنے جسموں پر بم باندھ کر اسرائیلی فوجیوں پر حملہ آور ہونے کے ساتھ اپنے جگر گوشوں کو بھی اپنے ہاتھوں سے تیار کر کے معرکوں کی زینت بناتی رہیں۔ اسلامی جہادی تحریکوں کی تیس سالہ تاریخ ایسی عظیم خواتین سے بھرپور ہے۔ یہاں صرف نمونے کے طور پر چند کا ذکر ہے جس سے ان کے عزم و حوصلے کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

اُمِ نضال

غزہ کے محلے شجاعیہ میں پیدا ہونے والی اس عظیم خاتون کو فلسطین کی خنساء کہا جاتا ہے (حضرتِ

خنساء رضی اللہ عنہا وہ صحابیہ ہیں جن کے چار بیٹے جنگِ قادسیہ میں شہید ہوئے)۔[۲] یہ مجاہدین کی روحانی والدہ اور حماس کی بانی خواتین میں سے ایک تھیں۔ مجاہدین کی معلّمہ، مبلّغہ اور مربیہ ہونے کے ساتھ ساتھ عظیم سیاسی و سماجی رہنما اور فلسطینی قانون ساز کونسل کی رکن تھیں۔ ان کا گھر مجاہدین کی پناہ گاہ اور عسکری منصوبوں کا مرکز تھا۔ اس عظیم خاتون نے اپنے چار بیٹوں کی تربیت کرکے ان کو جہاد کے لیے پیش کیا۔

نضال فرحت: یہ امِ نضال کا بڑا بیٹا تھا جس کو ماں نے انجینیرنگ کی اعلیٰ تعلیم دلوا کر میزائل اور راکٹ بنانے پر مامور کیا۔ اسی نضال فرحت نے تیتو مسعود اور عدنان العول کے ساتھ مل کر القسام میزائل ایجاد کیا اور محمد الزواری کے ساتھ "ابابیل 1" کے نام سے ڈرون ڈیزائن کیا۔ نضال عملی طور پر بھی کئی معرکوں میں شریک رہا۔ امِ نضال کا یہ بیٹا فروری ۲۰۰۳ء میں غزہ میں ایک اسرائیلی حملے میں رتبۂ شہادت سے سرفراز ہوا۔

محمد فتحی فرحت: امِ نضال نے اپنے اس سترہ سالہ خوبصورت نوجوان بیٹے کو خود تیار کرکے اسرائیلی افواج پر حملہ آور ہونے کے لیے روانہ کیا۔ چنانچہ محمد فتحی ۷، مارچ ۲۰۰۲ء کی صبح جنوبی غزہ میں غوشِ قطیف نامی اسرائیلی بستی میں قائم اسرائیلی فوج کے ایک تربیتی مرکز پر حملہ آور ہوا اور گیٹ پر محافظوں کو قتل کرکے اسرائیلی فوج کی رہائش گاہوں میں داخل ہو کر ان پر قیامت برپا کر دی۔ اپنا ہتھیار استعمال کر چکا تو مردار فوجیوں کے ہتھیار اٹھا لیے اور صفر کی مسافت سے فوجیوں کو قتل کرتا رہا۔ دو گھنٹوں سے زیادہ جاری رہنے والے معرکے میں درجن سے زیادہ اسرائیلی فوجیوں کو ہلاک کرکے رتبۂ شہادت سے سرفراز ہو گیا۔ اسرائیلی ٹی وی نے اس حملے کو خوفناک ترین حملوں میں سے ایک قرار دیا۔

رواد فرحت: امِ نضال کا یہ تیسرا بیٹا بھی یہودی فوجیوں کے ساتھ کئی معرکوں میں شریک رہا اور ۲۰۰۵ء میں غزہ میں صہیونی بمباری سے شہید ہوا۔ امِ نضال کا چوتھا بیٹا گیارہ سال اسرائیلی جیل میں قید رہا۔ امِ نضال کے گھر کو چار بار بمباری سے تباہ کیا گیا، لیکن ہر بار یہ زندہ سلامت رہیں۔ انھوں نے فلسطینی گوریلا جنگ کے لیجنڈ عماد عقل

---

(۲) فلسطین میں جاری حالیہ جنگ "معرکۂ طوفان الاقصیٰ" کے دوران ۷، جنوری ۲۰۲۴ء کو جنین کی ایک عظیم المرتبت خاتون کے چار جوان بیٹوں علاء ناجح عصعوص، ہزاع ناجح عصعوص، رامی ناجح عصعوص اور احمد ناجح عصعوص نے بیک وقت جامِ شہادت نوش کیا اور سیدہ خنساء رضی اللہ عنہا کی قربانیوں کی یاد تازہ کر دی۔

کو بھی پناہ دی۔ وزیرِاعظم اسماعیل ہنیہ نے جب امِ نضال کے تباہ شدہ گھر کی تعمیر کا اعلان کیا تو امِ نضال نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ جب تک میرے پڑوس کے تمام تباہ شدہ مکان تعمیر نہ ہو جائیں اس وقت تک میرا گھر تعمیر نہیں ہو گا۔ مجاہدین کے لیے سحری تیار کرنا اور رات میں اسرائیلی سرحدوں کا معائنہ امِ نضال کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔

امِ نضال محصور رہ رہ کر شدید بیمار ہوگئیں۔ ۱۷، مارچ ۲۰۱۳ء کو فلسطین کی یہ عظیم المرتبت خاتون غزہ کے الشفا اسپتال میں داعیِ اجل کو لبیک کہتے ہوئے تاریخ میں امر ہوگئیں۔ آپ کے جنازے پر غزہ کے عوام کا سیلاب امڈ آیا۔ ہر شخص آپ کے جنازے کی چارپائی چھونے کی سعادت حاصل کرنا چاہتا تھا۔ القسام بریگیڈ نے آپ کے جنازے کو ہر طرف سے حصار میں رکھا۔ اسلامی جہاد اور حماس کے رہنماؤں نے باری باری جنازے کو کندھا دیا۔ اسماعیل ہنیہ نے نمازِ جنازہ پڑھائی اور مجاہدین نے تکبیر کے فلک شگاف نعروں میں اپنی روحانی ماں کو سپردِ خاک کر دیا۔

ریم الرّیاشی

غزہ کے محلے الزیتون سے تعلق رکھنے والی دو معصوم بچوں کی ماں تئیس سالہ نوجوان خاتون ریم الریاشی چودہ سال کی عمر سے ہی مجاہدین کے ساتھ معرکوں میں شریک ہوتی رہی۔ بالآخر ۱۴، جنوری ۲۰۰۴ء کو اسرائیل اور غزہ کے درمیان کراسنگ پوائنٹ پر اسرائیلی فوجیوں کے ایک اجتماع میں گُھس کر خود کو دھماکے سے اڑا دیا۔ اس فدائی کارروائی میں ایک درجن اسرائیلی فوجی ہلاک اور پندرہ شدید زخمی ہوئے۔

فاطمہ النّجار

غزہ کے علاقے جبالیا سے تعلق رکھنے والی ستر سالہ عظیم خاتون فاطمہ النجار کی پوری زندگی اسرائیل کے خلاف جدوجہد میں گزری۔ پہلی انتفاضہ میں ان کا گھر جہادی سرگرمیوں کا مرکز رہا۔ انھوں نے خود بھی معرکوں میں حصہ لیا۔ اسرائیلی افواج نے ان کا گھر تباہ کر دیا اور ان کے بیٹے محمد کو گرفتار کر کے دس سال قید کی سزا سنائی۔ آخر ۲۳ نومبر کو یہ ستر سالہ خاتون اپنے جسم سے بم باندھ کر مشرقی جبالیا میں اسرائیلی فوج کے ایک دستے پر حملہ آور

ہوئیں اور چھے کمانڈوز کو ہلاک اور دس کو شدید زخمی کرتے ہوئے خود بھی شہادت کے بلند مرتبے پر فائز ہو گئیں۔

*****

کتابیات:

حركة المقاومة الإسلامية، علي الجربادي، مجلة الدراسات الفلسطينية،۱۹۹۳ء

الانتفاضةوالمقاومةوالعمليات الاستشهادية،ماجد كيالي، مجلة الدراسات الفلسطينية،۲۰۲۰ء

المقاومة الفلسطينية بين غزة و لُبنان و الانتفاضة: محمد خالد الأزعر، مركز دراسات الوحدة العربية، بيروت

المقاومة الفلسطينية،مؤسسة الدراسات الفلسطينية

قائمة العمليات العسكرية،مؤسسة الدراسات الفلسطينية

قائمة أهم الأحداث الفلسطينية، مؤسسة الدراسات الفلسطينية

كي لا ننسىٰ قُرى فلسطين التي دمَّرتها إسرائيل۱۹۴۸ء،وليد الخالد، مؤسسة الدراسات الفلسطينية

بلادنا فلسطين،مصطفى مراد الدّباغ، مؤسسة الدراسات الفلسطينية

المجازر الإسرائيلية بحق الشعب الفلسطينية،محسن صالح، مريم غشباني،بيروت

تاريخ العرب الحديث،أحمد عزت عبد الكريم،دار النهضة العربية

الكفاح المسلم و البحث عن دولة الحركة الوطنية الفلسطينية، يزيد صائغ، مؤسسة الدراسات الفلسطينية

حرب العصابات في فلسطين، صبحي ياسين، دار الكتاب العربي، مصر

الطريق إلى القدس، محسن صالح، مكتبة الزيتونة، بيروت

تاريخ فلسطين، تيسير جباره، دار الشروق، عمان، أردن

شہرِ قدس تہذیبی چیلنج کے نشانے پر، مترجم: عبدالحمید اطہر ندوی، ادارہ احیاے علم، لکھنؤ

جہادِ آزادی کی نئی منزل فلسطین، شمیم فیضی، کمیونسٹ پارٹی پبلی کیشنز

المیہ فلسطین، محمود جاوید، کتب خانہ جمہوریہ، کراچی

مسئلہ فلسطین، ایڈورڈ سعید، مترجم شاہد حمید

الشرق الأوسط مجلة ۲۰۱۰ء

وفا نیوز ایجنسی فلسطین

الجزيرة عربي

بي بي سي عربي

بی بی سی اردو

https://www.palestine-studies.org/ar

مولانا حماد احمد ترکؔ
نائب ناظمِ شعبۂ تحقیق و تصنیف، فقہ اکیڈمی

معرکۂ طوفان الاقصیٰ

مجاہدین کے کارنامے اور صیہونی مظالم کی دو ماہ کی روداد

اکتوبر ۲۰۲۳ء کا پہلا ہفتہ اسرائیل میں عیدِ سوکوف کے طور پر منایا جارہا تھا جس دوران اسرائیلی فوج کی طرف سے فلسطینی مسلمانوں پر معمول سے زیادہ پابندیاں عائد کی گئی تھیں۔ مغربی کنارے کے مسلمان آمد و رفت سے قاصر تھے۔ گزشتہ نصف صدی کے ظلم و ستم سے فلسطینی مسلمانوں میں انتقام کی چنگاریاں سلگ رہی تھیں، ان پابندیوں کے سبب وہ آگ بن کر بھڑک اٹھیں، نیز عالمی سطح پر مسئلۂ فلسطین مسلمانوں کی نظروں سے اوجھل ہوتا جارہا تھا، یکے بعد دیگرے عرب ممالک ناپاک صیہونی ریاست سے دوستی کی پینگیں بڑھا رہے تھے۔ مغربی کنارے کا اکثر حصہ یہودیوں کے قبضے میں جاچکا تھا۔ مسجدِ اقصیٰ میں یہودیوں کا جشن اور بار بار کی مداخلت ان کے عزائم کی پیش گوئی کررہی تھی۔ ایسے میں جبکہ یہودیوں کی ہفت روزہ عید کے اختتام پر سات اکتوبر کو رقص و موسیقی کی محفل "نووا فیسٹیول" کا انعقاد کیا گیا تھا، ظالموں کا احتساب شروع ہوگیا۔

صحرائے نقب (نیگیو) کے مغربی حصے میں ریعیم شہر کے قریب، غزہ بیریئر[1] سے پانچ کلومیٹر دور جاری اس فیسٹیول پر صبح ساڑھے چھ بجے حركة المقاومة الإسلامية فلسطين (حماس) کے مجاہدین نے تین اطراف سے حملہ کردیا۔ حماس نے اس حملے کو معرکۂ طوفان الاقصیٰ کا نام دیا۔ بحری راستے سے حماس کے خصوصی بحری دستے ضفادع البشریہ للقسام نے، زمینی راستے سے کتائب القسام نے اور فضائی راستے سے صقر

---

[1] غزہ اور مقبوضہ فلسطین کے درمیان ۱۹۹۴ء میں ایک دیوار بنانے کا فیصلہ کیا گیا تاکہ غزہ کے شہریوں کو اسرائیل کی حدود میں آنے سے روکا جائے۔ اس دیوار کو کئی بار توڑا گیا۔ غزہ سے نکلنے کے بعد اسرائیل نے اس دیوار کو خودکار ہتھیاروں سے مسلح کردیا تھا۔

رجمنٹ کے چھاتا بردار مجاہدین نے غلافِ غزہ[۲] میں مسلح کارروائیوں کا آغاز کر دیا۔ صبح ساڑھے چھے بجے غلافِ غزہ کے متعدّد شہروں میں خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔ سات اکتوبر کے سورج نے مقبوضہ فلسطین پر پہلی نظر ڈالی تو فضا میں ہزاروں راکٹ دیکھ کر اس کی کرنیں دمک اٹھیں۔ کتائب القسام نے محض بیس منٹ کے اندر پانچ ہزار سے زائد راکٹوں سے تل ابیب، عسقلان، اشدود، بئرِ سبع اور دیگر شہروں میں زلزلہ بپا کر دیا۔[۳] ایک طرف راکٹ حملے جاری تھے، دوسری طرف سمندری راستوں سے ضفادع القسام کے متعدّد سپاہی اسرائیلی حدود میں داخل ہو گئے۔ لیکن سب سے حیرت انگیز کارنامہ جسے چشمِ فلک نے کبھی نہ دیکھا تھا وہ یہ تھا کہ صقر رجمنٹ کے مجاہدین نے پیراشوٹ کے ذریعے پرواز کرتے ہوئے متعدّد شہروں پر حملے کر دیے جن میں سب سے بڑا حملہ نووا فیسٹیول پر تھا۔ تین اطراف سے حملہ کر کے غاصب یہودی آبادکاروں کو چوتھی سمت دوڑنے پر مجبور کیا گیا جہاں مجاہدین گاڑیوں اور موٹر سائیکلوں پر ان کے استقبال کے لیے تیار تھے۔ چھاتا بردار مجاہدین نے اترتے ہی فائرنگ شروع کر دی جس سے ہر سمت بھگدڑ مچ گئی۔ رات بھر جاگ کر جشن منانے اور رقص کرنے کے بعد سونے کا وقت آیا تو مجاہدین نے ان یہودیوں کو ابدی نیند سلا دیا۔ پولیس اور فوج کے سپاہیوں سمیت متعدّد شہری جہنم واصل ہوئے۔[۴] راکٹوں کی بارش کے دوران مجاہدین کے متعدّد جتھوں نے خود کار مسلح بیریئر کو مختلف مقامات پر ناکارہ کیا اور دھماکے سے اڑا دیا اور موٹر سائیکلوں پر مقبوضہ

---

[۲] غزہ کی پٹی اور مغربی کنارے کے درمیان مقبوضہ فلسطین کا علاقہ جس میں ۵۰ قصبے اور ۵۵ ہزار شہری آباد ہیں۔ گولائی کی شکل میں واقع یہ ٹکڑا تقریباً ۴۰ کلومیٹر لمبا ہے۔ الجزیرہ کے مطابق اسے تین انتظامی حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے: اشکول، عسقلان اور شارہا-نیگیو۔

[۳] اتنی بڑی تعداد میں پہلی مرتبہ حماس نے راکٹ فائر کیے۔ اس کا سبب یہ تھا کہ اسرائیل نے ۲۰۱۱ء میں اسرائیلی حدود میں اور ۲۰۱۷ء میں سمندری حدود میں ایک خود کار دفاعی نظام "آئرن ڈوم" فعال کر دیا۔ یہ خود کار نظام بیک وقت سینکڑوں راکٹوں کو فضا میں ناکارہ بنانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ ہزاروں کی تعداد میں راکٹ فائر ہوئے جن میں سے اسرائیلی بیان کے مطابق نوے فیصد ناکارہ کر دیے گئے، باقی مختلف شہروں میں ہدف حاصل کرنے میں کامیاب رہے۔

[۴] واضح رہے کہ اسرائیلی شہری بھی اسرائیلی ریاست کی reserved force ہیں۔ ہر شہری جنگی تربیت حاصل کرتا ہے اور ضرورت پڑنے پر فوج کو اپنی خدمات بھی پیش کرتا ہے۔

فلسطین میں داخل ہوگئے۔ جس کے بعد سدیروت، مینوت، کیسوفیم اور زیکیم میں زمینی جنگ کا آغاز ہو گیا۔ واضح رہے کہ معرکۂ طوفان الاقصیٰ میں نووافیسٹیول پر حملہ اس معرکے کا ایک معمولی جز تھا، سات اکتوبر کی کارروائیاں متعدّد شہروں اور مختلف محاذوں پر جاری تھیں جن میں سے ایک فیسٹول پر حملہ تھا۔ لیکن وہاں بڑی تعداد میں گرفتاریاں ہونے کی وجہ سے یہ کارروائی بہت شہرت اختیار کر گئی۔

صبح آٹھ بجے حماس کے رہنما محمد الضیف نے خطاب کیا اور اس حملے کو گزشتہ دہائیوں کا سب سے بڑا حملہ قرار دیا۔ محمد الضیف نے مغربی کنارے اور مقبوضہ فلسطین کے مسلمانوں کو بھی طوفان الاقصیٰ میں شامل ہونے کی دعوت دی۔ دس بجے کے قریب مجاہدین کی ایک جماعت نے بڑی اسرائیلی چھاؤنی ''ریعیم بیس'' پر حملہ کیا اور اس پر قبضہ کر لیا۔ چند گھنٹوں کے بعد مجاہدین نے چھاؤنی کا سامان باندھ کر غزہ کا رخ کیا اور چھاؤنی کو خالی کر دیا۔ الجزیرہ، سی این این اور ٹی آر ٹی عربی کے مطابق سات اکتوبر کے حملے میں تقریبًا پندرہ سو یہودی قتل ہوئے جن میں سے تین سو فوجی تھے۔ دو سو پچاس یہودی گرفتار اور پانچ ہزار زخمی ہوئے۔ واضح رہے کہ مقتول یہودیوں کی ایک بڑی تعداد مجاہدین پر شیلنگ کرنے والے گن شپ ہیلی کاپٹروں کی فائرنگ سے ہلاک ہوئی جس کا اعتراف متعدّد اسرائیلی شہری کر چکے ہیں۔

اسی دن مجاہدین نے جنوبی غزہ میں واقع کرم ابوسالم کراسنگ پر بھی قبضہ کر لیا۔ سات اکتوبر کے حملے میں نحال بریگیڈ کا کمانڈر یوناتان اور رفائیم یونٹ کا کمانڈر کرنل لیوی بھی ہلاک ہوا۔ مجاہدین نے ہزاروں راکٹوں سے فوجی چھاؤنیوں، ہوائی اڈوں اور دیگر سرکاری تنصیبات کو نشانہ بنایا۔ ایک عینی شاہد نے سی این این کو انٹرویو دیتے ہوئے بتایا کہ صبح سات بجے کے قریب اچانک موسیقی بند ہوگئی جس سے تشویش پھیل گئی۔ اس کے بعد فضا میں آبادی کی طرف بے شمار راکٹ جاتے ہوئے دکھائی دیے۔ اسی دوران چھاتا برداروں کی فائرنگ شروع ہوگئی۔ سات بج کر دس منٹ پر بم شیلٹر میں بھیڑ لگ چکی تھی، ہر طرف سے گولیوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اسی دن شام ساڑھے چار بجے اسرائیلی فضائیہ حرکت میں آئی اور غزہ پر بمباری شروع ہوگئی۔ اسرائیلی فوجی ادارے آئی ڈی ایف نے حماس کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کا اعلان کیا اور مسلسل بمباری میں متعدّد شہری عمارتوں کو نشانہ بنایا۔ یہ تھا معرکۂ طوفان الاقصیٰ کا پہلا دن۔

۸، اکتوبر کی صبح کا آغاز ہوا تو لبنانی عسکری تنظیم حزب اللہ کے مارٹر گولوں سے صیہونی فوجیوں کی آنکھ کھلی۔ آرام میں خلل ڈالنے کی پاداش میں بھاری توپ خانے سے جوابی کارروائی کی گئی اور حزب اللہ کے ٹھکانوں کو نشانہ بنایا گیا۔ جنگ کے دوسرے ہی دن امریکی طیارہ امداد کے ساتھ تل ابیب پہنچا۔

۹، اکتوبر کو غزہ کا پانی، خوراک اور انٹرنیٹ بند کر دیا گیا۔ صیہونی فوجی ترجمان نے اعتراف کیا کہ پچاس گھنٹوں میں ایک ہزار ٹن سے زائد بم گرائے گئے۔ اس دوران حزب اللہ نے الظہیرۃ کے علاقے میں اسرائیل پر حملہ کیا اور پرانیٹ اور ابویم کی بیرکوں کو تباہ کر دیا۔ اسرائیل نے تین لاکھ سپاہیوں، ٹینکوں اور جنگی جہازوں کو غزہ پر مسلط کر دیا۔ دس اکتوبر کی رات طیاروں نے غزہ کے ایک بلند ٹاور کو نشانہ بنایا جہاں متعدّد صحافی موجود تھے۔ اس حملے میں تین صحافی شہید ہوئے۔ یہ اس جنگ میں میڈیا ٹیم پر پہلا حملہ تھا۔ حملوں میں شدت آتی گئی اور مصر کو تنبیہ کر دی گئی کہ کسی قسم کی امداد رفح کراسنگ سے غزہ میں نہیں داخل ہوگی۔ ۱۲، اکتوبر کو صیہونی افواج نے درندگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے غزہ اور مغربی کنارے میں فلسطینی مسلمانوں کا قتلِ عام شروع کر دیا۔ مغربی کنارے میں شہریوں کی شہادت اور گرفتاریوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ جبکہ غزہ کی پٹی میں جبالیا، الشاطی کیمپ، دیر البلح اور رفح میں بموں کی بارش کی گئی۔ اسی دن متوقع خطرے کے پیشِ نظر صیہونی طیاروں نے حلب اور دمشق پر بھی بمباری کی۔ ذرا دن ڈھلا تو جرمنی سے ایک جہاز اسلحہ اور امداد لے کر تل ابیب پہنچ گیا۔ اسی روز مغربی کنارے میں فلسطینی مسلمانوں نے صیہونی جارحیت کا انتقام لینے کے لیے ایک تھانے پر حملہ کر دیا۔ اس جنگ میں مغربی کنارے کے مسلمانوں کی یہ پہلی بڑی کارروائی تھی۔

۱۳، اکتوبر کو بہت سے اہم واقعات ہوئے۔ سب سے اہم واقعہ تو یہ ہوا کہ حماس کو اب تک کمزور سمجھا جا رہا تھا۔ حماس نے پہلی مرتبہ ۲۵۰ کلومیٹر تک مار کرنے والے میزائل ”عیاش ۲۵۰“ سے اسرائیل کے انتہائی شمال میں واقع ’صفد‘ شہر کو نشانہ بنایا۔ صفد شہر کا زمینی راستہ بیتِ حانون (شمالی غزہ) سے ۲۳۰ کلومیٹر ہے۔ یہ اعلان تھا کہ غلیل اور پتھر سے لڑنے والے مجاہدین آج ناپاک صیہونی ریاست کے کسی بھی شہر کو نشانہ بنانے کی طاقت رکھتے ہیں۔ دوسرا اہم واقعہ یہ ہوا کہ کتائب القسام کے جوانوں نے جنوبی غزہ کے شہر خان یونس سے باڑ توڑ کر اسرائیلی فوج پر حملہ کر دیا اور تین گاڑیاں تباہ کر کے کامیاب لوٹ آئے۔ اسرائیلی پولیس نے اس کا

انتقام مغربی کنارے کے مسلمانوں سے لیا اور نمازِ جمعہ کے لیے مسجدِ اقصیٰ آنے پر پابندی عائد کردی۔ اس کے باوجود فلسطینی مسلمان بڑی تعداد میں مسجدِ اقصیٰ کی طرف روانہ ہوئے جن پر فائرنگ اور شیلنگ کی گئی۔ جمعے کی نماز کے بعد عالمِ اسلام میں اس جارحیت کے خلاف مظاہرے کیے گئے اور صیہونی افواج کی درندگی پر غم وغصے کا اظہار کیا گیا۔ اسی روز ایک افسوس ناک واقعہ یہ پیش آیا کہ آئی ڈی ایف نے شمالی غزہ کے مسلمانوں کو جنوب میں منتقل ہونے کے لیے چوبیس گھنٹوں کی مہلت دی اور شمال کے اسپتالوں کو خالی کرنے کا پیغام دیا اور تنبیہ کی گئی کہ عن قریب یہاں بمباری کی جائے گی۔ عوام اور طبی عملے نے اس پیشکش کو مسترد کردیا۔ البتہ چند لوگ خواتین اور بچوں کو لے کر آئی ڈی ایف کے بتائے گئے محفوظ مقام پر منتقل ہونے کے لیے روانہ ہو گئے۔ لیکن یہ قافلہ شمال کو جنوب سے ملانے والی مرکزی سڑک شارع صلاح الدین پر پہنچا تو جنگی جہازوں نے ان پر بمباری کردی جس سے کثیر تعداد میں بچے اور خواتین شہید ہوگئیں۔ بزدل صیہونی فوج کے عزائم اس گھٹیا حرکت سے مزید واضح ہوگئے۔ اسی روز اسرائیلی بمباری میں فلسطینی مسلمانوں کے ساتھ ساتھ نو اسرائیلی قیدی بھی جان کی بازی ہار گئے۔

۱۶، اکتوبر کو پہلی مرتبہ طوفان الاقصیٰ کے احوال بتانے کے لیے کتائب القسام کے فوجی ترجمان ابوعبیدہ منظرِ عام پر آئے۔ اس خطاب میں انھوں نے صیہونی افواج کے غزہ میں متوقع داخلے کو اسرائیل کے جنگی جرائم پر اسے سزا دینے کا موقع قرار دیتے ہوئے شایانِ شان یہود کے استقبال کا اعلان کیا۔ اسی روز کولمبیا نے فلسطینی مسلمانوں پر مظالم کے خلاف بیان دیا اور اسرائیلی سفیر کو نکال باہر کیا۔ غزہ کے لیے امداد کا بھی اعلان کیا۔ ۱۷، اکتوبر کو دوبارہ ابوعبیدہ نے خطاب کیا اور عالمِ اسلام کو جہاد میں شامل ہونے کی دعوت دی۔ انھوں نے صیہونی افواج کو مطلع کیا کہ ان کی بمباری سے اب تک ۲۳ یہودی قیدی ہلاک ہوچکے ہیں۔ جو زندہ ہیں وہ ہمارے مہمان ہیں۔ اسی دن قسام کا کمانڈو دستہ عسقلان پر حملہ کرنے میں کامیاب رہا۔ دوسری طرف امریکہ کے دو ہزار سپاہی بحرِ ابیض میں اسرائیل کی مدد کے لیے متعیّن کیے گئے۔ روس نے سلامتی کونسل میں جنگ بندی کی قرارداد پیش کی جسے مسترد کردیا گیا۔ ۱۷، اکتوبر کا دن اہلِ غزہ کے لیے قیامتِ صغریٰ ثابت ہوا۔ بے رحم، سنگ دل اور ذلیل ترین یہودی فوج نے شمالی غزہ کے معمدانی اسپتال کو امریکی میزائلوں سے تہہ و بالا کردیا۔ شمالی غزہ کا معمدانی

اسپتال اہلِ غزہ کی امیدوں کا مرکز تھا۔ وحشیانہ بمباری کے نتیجے میں ایک ہزار فلسطینی مسلمان، جن میں اکثریت بچوں اور خواتین کی تھی، شہید کر دیے گئے۔ جو معذور یا زخمی ہوئے ان کا کوئی شمار نہیں تھا۔ یہ اسپتال جبالیا کے قریب واقع تھا جہاں پہلے روز سے صیہونی جہاز بمباری کر رہے تھے۔ ذرا صورتِ حال کا اندازہ کیجیے کہ کم ظرف دشمن نے جبالیا پر بمباری کی، پھر مجبور شہریوں کو شمال سے جنوب جانے کا حکم دیا، جو اس حکم کو مان کر نکلے انھیں راستے میں شہید کر دیا گیا، جو اپنے گھروں میں مقیم رہے انھیں کارپٹ بمباری سے اس حال میں پہنچایا کہ ہر گلی اور ہر محلے سے زخمی معمدانی اسپتال پہنچے اور پھر اسپتال پر شدید بمباری کر کے انھیں خون میں نہلا دیا۔ اسی اسپتال کے قریب الشفا اسپتال موجود تھا جہاں معمدانی اسپتال، جبالیا، الشاطئ وغیرہ کے زخمی پہنچائے گئے۔ الشفا کے ساتھ جو سلوک کیا گیا اس کا تذکرہ آگے آجائے گا۔ ان واقعات سے یہود کی ذہنی حالت کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ کس جنون میں مبتلا ہیں۔ معمدانی اسپتال پر حملے کے نتیجے میں پوری دنیا اسرائیل کے خلاف اٹھ کھڑی ہوئی۔ مغربی کنارے کے صدر محمود عباس اردن میں موجود تھے اور امریکی صدر سے ملاقات طے تھی۔ اس خبر کو سنتے ہی انھوں نے ملاقات منسوخ کر دی اور فلسطین آ کر تین روزہ سوگ کا اعلان کیا۔ ترک عوام نے استنبول میں اسرائیلی سفارت خانے کا گھیراؤ کر لیا اور اسرائیل نے اپنے شہریوں کو ترکیہ چھوڑنے کا پیغام دیا۔ ۱۸، اکتوبر کو اردن میں اسرائیلی سفارت خانہ نذرِ آتش کر دیا گیا۔ اسی دن جرمنی کا سرکاری وفد اسرائیل سے اظہارِ یک جہتی کے لیے تل ابیب پہنچا۔ عالمی ردِّ عمل پر اسرائیل نے اسپتال پر حملے کی ذمے داری قبول نہیں کی اور اس کا الزام مجاہدین پر لگا دیا۔ لیکن وال اسٹریٹ جرنل نے ملبے سے ملنے والے میزائل کی تصدیق کی کہ وہ امریکی ساختہ MK-84 تھا۔

۱۹، اکتوبر کو یمنی حوثیوں کی جماعت انصار اللہ (القوات المسلحة اليمنية) نے اسپتال پر حملے اور اسرائیلی جارحیت کے خلاف مزاحمت کے آغاز کا اعلان کیا اور فلسطینی بھائیوں کی مدد کو دینی ذمے داری قرار دیا۔ اسی مزاحمت کے تسلسل میں حوثیوں نے دو امریکی بحری جہازوں پر میزائل حملہ کیا۔ پینٹاگون کے مطابق یقینی طور پر یہ حملہ ایرانی پروردہ حوثی گروہ نے کیا تھا جسے فضا میں ہی ناکارہ بنا دیا گیا۔ ۲۰، اکتوبر کو حماس نے خیر

سگالی کے طور پر دو عمر رسیدہ امریکی خواتین کو رہا کیا۔ ۲۱، اکتوبر کو المقاومة الإسلامية في العراق نے بھی مزاحمت کا اعلان کیا اور امریکی اڈے پر ڈرون حملے کر کے فلسطینی مسلمانوں سے یک جہتی کا اظہار کیا۔ اسی دن طوفان الاقصیٰ کے آغاز سے اب تک پہلی مرتبہ بیس امدادی ٹرک غزہ میں داخل ہوئے۔ اسی دن اسرائیل کے فوجی ترجمان نے زمینی جنگ کی (جس کا اعلان کچھ دن پہلے کیا جا چکا تھا) پہلی کارروائی کی اور کئی ٹینک شمالی غزہ میں داخل ہوئے۔ اسی وقت کا قسام کے مجاہدین کو بے تابی سے انتظار تھا۔ انھوں نے اسرائیلی ٹینکوں، بکتر بند گاڑیوں اور بلڈوزروں کو ''الیاسین 105، کارنیٹ، ٹی بی جی، ہاون، تاندوم'' اور دیگر راکٹوں سے تباہ کرنا شروع کر دیا۔

۲۲، اکتوبر کو غزہ کے وزیرِ صحت نے اطلاع دی کہ اب تک ۴۴۰۰ فلسطینی شہید اور ۱۳۶۰۰ زخمی ہو چکے ہیں۔ اسی دن تل ابیب میں اسرائیلی شہریوں نے مغویوں کی رہائی کے لیے احتجاج کیا۔ ۲۴، اکتوبر کو کتائب القسام کے بحری دستے ضفادع القسام نے سمندری راستے سے عسقلان میں داخل ہو کر زیکیم پر قبضہ کر لیا۔ اس معرکے میں کم از کم دس صیہونی فوجی جہنم رسید ہوئے۔ کم از کم اس لیے لکھا کہ دس کا اعتراف اسرائیل نے خود کیا۔ اصل تعداد یقیناً اس سے زیادہ ہوگی۔ اسی دن دوسرا اہم واقعہ یہ ہوا کہ شام سے اسرائیل پر راکٹ حملے کیے گئے۔ اسرائیل نے جوابی کارروائی کی لیکن شام سے اسی دن دوبارہ اسرائیلی تنصیبات کو نشانہ بنایا گیا۔ نیز المقاومة الإسلامية في العراق نے امریکی اڈے پر حملہ کیا۔ مغربی کنارے میں جاری وحشیانہ سلوک کے ردِّ عمل میں فلسطینی نوجوانوں کی مسلح کارروائیوں میں تیزی نظر آئی اور جنین میں بزدل صیہونی فوج کو بھاری نقصان اٹھانا پڑا۔ جب محاصرے کے بعد بھی صیہونی فوج قابلِ ذکر نتائج نہ حاصل کر سکی تو جنین پر طیاروں سے بمباری کر کے شہریوں سے انتقام لیا گیا۔ یہ ہے دنیا کی چوتھی عسکری قوت کی کامیابی کا راز۔ حماس نے ایک بار پھر بزدل فوج کو للکارا اور مطلع کیا کہ مجاہدین دو بدو جنگ کے بے قراری سے منتظر ہیں۔

۲۵ سے ۳۰، اکتوبر کے درمیان قابلِ ذکر واقعات یہ ہوئے کہ اردن سے پہلا میزائل اسرائیلی حدود میں پھینکا گیا۔ اسرائیل کی طرف سے غزہ میں انٹرنیٹ کی مکمل بندش پر ایلون مسک سے درخواست کی گئی اور

مسک نے انٹرنیٹ فراہم کیا۔ ابوعبیدہ نے اعلان کیا کہ اب تک بمباری سے پچاس قیدی ہلاک ہو چکے ہیں۔

۳۱، اکتوبر کو یمن سے انصار اللہ نے اسرائیل پر بیلسٹک میزائلوں اور ڈرون طیاروں سے حملہ کیا۔ انصار اللہ کے میزائل اسرائیل کے شمالی شہر ایلات میں خود کار دفاعی نظام نے تباہ کیے۔ ایلات یمن سے تقریباً ۱۷۰۰ کلو میٹر کے فاصلے پر ہے۔ یمن کے کچھ میزائل اردن میں موجود امریکی چھاؤنی سے ناکام بنائے گئے اور کچھ ایلات پہنچنے پر اسرائیلی فوج نے ناکام بنائے۔ اسی روز حزب اللہ نے اب تک کی کارروائیوں کے اعداد و شمار جاری کیے جن کے مطابق ۱۲۰ اسپاہی ہلاک، ۹ ٹینک اور ایک ڈرون تباہ کیا گیا تھا۔

یکم نومبر کو بولیویا نے اسرائیل سے سفارتی تعلقات منقطع کر دیے۔ ایک اہم واقعہ یہ ہوا کہ حماس نے ڈرون طیارے ''الزواری'' کی نمائش کی۔ ایک خبر کے مطابق معرکۂ طوفان الاقصیٰ میں تیس ''الزواری'' طیارے استعمال ہو رہے ہیں۔

۲، نومبر کو یمن سے اسرائیل پر ڈرون حملہ کیا گیا۔ انصار اللہ کے فوجی ترجمان نے سعودیہ کو پیغام بھیجا کہ وہ یمن کے حملے روکنے میں امریکہ اور اسرائیل سے تعاون نہ کرے لیکن سعودیہ نے اسے مسترد کر دیا۔ اس کے بعد ۴، نومبر کو انصار اللہ نے ایک بیلسٹک میزائل سے ایلات کو ہدف بنایا لیکن سعودیہ نے فضا میں اس میزائل کو تباہ کر دیا اور یہ اعلامیہ جاری کیا کہ اسرائیل جانے والے ہر میزائل کو اسی طرح روکا جائے گا۔ اسی روز حماس نے دوسری بار ''عیاش ۲۵۰'' میزائل استعمال کیا اور 'ایلات' کو جو کہ جنوب میں اسرائیل کا سرحدی شہر ہے، نشانہ بنایا۔ ایلات کا غزہ سے زمینی راستہ تقریباً ۲۶۰ کلو میٹر ہے۔ اس سے قبل حماس نے اسرائیل کے انتہائی شمالی شہر صفد پر عیاش میزائل داغا تھا۔ ان دو حملوں نے واضح کر دیا کہ اسرائیل کے کونے کونے تک مجاہدین کی پہنچ ہے۔ اس ایک دن میں کتائب القسام نے ٹینک اور بلڈوزر سمیت ۲۴ فوجی گاڑیاں مکمل یا جزوی طور پر تباہ کیں۔ وزارتِ صحت غزہ کے مطابق فلسطینی شہدا کی تعداد ۹۵۰۰ تک پہنچ گئی۔

۵، نومبر کو سرایا القدس نے نمایاں کامیابی حاصل کی اور بھاری توپ خانے سے عسقلان، سدیروت، نیر عام، مفلاسیم، کفر عزہ، کفر سعدہ اور نقب الغربی پر حملے کیے اور صیہونیوں کو لرزا کر رکھ دیا۔ دوسری طرف اسرائیلی فضائیہ کے ساتھ ساتھ اسرائیلی بحریہ نے بھی غزہ شہر پر گولہ باری شروع کر دی۔

۶، نومبر کو یہودی مصنوعات کے شاندار عالمی بائیکاٹ کے تسلسل میں ترکش ایئرلائن نے لائقِ تحسین اقدام کیا۔ کمپنی نے اعلان کیا کہ آج سے کسی بھی پرواز میں اسرائیلی مشروبات کی ترسیل نہیں کی جائے گی۔ اسی دن لبنان سے متعدّد اسرائیلی شہروں پر راکٹ حملے کیے گئے۔ المقاومة الإسلامية في العراق نے 'الاقصیٰ 1' میزائل سے شام اور عراق میں امریکی چھاؤنیوں کو نشانہ بنایا۔ دن کے اختتام پر قسام نے بیان جاری کیا کہ سابقہ ۴۸ گھنٹوں میں ۲۷ صیہونی گاڑیاں تباہ ہوئیں۔ دوسری طرف ۷، نومبر کو شہدا کی تعداد ۱۳۵۰۰ تک پہنچ گئی۔ ۸، نومبر کو قسام نے مختلف کارروائیوں میں ٹینک سمیت ۱۶، اسرائیلی گاڑیوں اور متعدّد فوجیوں کو نشانہ بنایا۔

۹، نومبر کو اسرائیلی طیاروں نے شام اور لبنان پر بمباری کی۔ اسی روز المقاومة الإسلامية في العراق نے عین الاسد اور حریر کے امریکی اڈوں پر ڈرون حملے کیے۔ اسرائیل کا ہاروپ طیارہ[۵] ایلات میں گر کر تباہ ہو گیا۔ اسی شہر ایلات میں یمنی انصار اللہ کا بیلسٹک میزائل طویل سفر کر کے پہنچا جسے اسرائیل نے ''ایرو 3''[۶] میزائل کے ذریعے آبادی سے دور گرا دیا۔ قسام نے ایک ویڈیو جاری کی جس میں غزہ شہر کے نواح میں چند سپاہیوں کو باہم گفتگو کرتے ہوئے دکھایا گیا، اسی دوران ایک ڈرون اپنے پنجے میں راکٹ لے کر نمودار ہوا اور عین سپاہیوں کے اوپر ڈرون کا پنجہ کھل گیا اور پھر 'نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز'، کمانڈر سمیت تمام سپاہی جہنم واصل ہو گئے۔ اس ذلت کو مٹانے کے لیے صیہونی طیاروں نے ان شہریوں پر بمباری کی جو انھی کی ہدایت پر شارع صلاح الدین کے ذریعے شمال سے جنوب جا رہے تھے۔ اسی دن حزب اللہ نے اسرائیلی تنصیبات پر تین ڈرون حملے کیے۔ مزید برآں، انصار اللہ، یمن نے اسرائیل کو بیلسٹک میزائل کے بعد کروز میزائل کی دھمکی دی جس پر اسرائیلی میڈیا یدیعوت احرونوت نے خبر شائع کی کہ کروز میزائل روکنا

---

[۵] ہاروپ طیارہ ایک طرح کا خودکش ڈرون طیارہ ہے جو کسی ہدف کو نشانہ بنانے کے لیے فضا میں کھڑا رہنے یا آہستہ پرواز کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور ہدف کو دیکھتے ہی اس پر خود کو گرا دیتا ہے۔

[۶] Arrow 3 امریکہ اور اسرائیل کی مشترکہ کوشش سے تیار کردہ اینٹی بیلسٹک میزائل ہے۔ ایک بیلسٹک میزائل کو تباہ کرنے کے لیے ایرو 3 پر کم از کم چار ملین (چالیس لاکھ) ڈالر لاگت آتی ہے۔

بہت دشوار ہے اور اسرائیل کے لیے پریشانی ہے۔

۱۱، نومبر بالخصوص معرکۂ طوفان الاقصیٰ اور بالعموم امتِ مسلمہ کے لیے بہت ''اہم'' ہے کیونکہ اس روز امتِ مسلمہ کے سربراہان ریاض میں او آئی سی کے اجلاس میں جمع ہوئے اور سب نے متفقہ طور پر قضیۂ فلسطین کے دائمی حل کے لیے 'تاریخی اعلامیہ' جاری کیا۔ وہ اعلامیہ یہ تھا کہ ہم سب مل کر صیہونی جارحیت کی پرزور مذمت کرتے ہیں اور اقوامِ متحدہ سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ اسرائیل کو روکے:

ع اور درویش کی صدا کیا ہے

ایک طرف یہ بازیچۂ اطفال ہو رہا تھا اور دوسری طرف مجاہدین اپنی کارروائیاں جاری رکھے ہوئے تھے۔ سرنگوں کی تلاش میں شمالی غزہ آنے والے خصوصی دستے کو جہنم بھیجنے کے لیے بیتِ حانون میں ایک سرنگ کو چارے کے طور پر استعمال کیا گیا اور ابھی بہادر فوج کا دستہ سرنگ مل جانے پر جشن منانے ہی والا تھا کہ دھماکے سے سرنگ تباہ کر دی گئی۔ جب سرنگ ہی نہ رہی تو دستے کے وجود کا کیا جواز۔ مسلسل ناکامی پر ۱۲ سے ۱۵، نومبر تک الشفا اسپتال کا محاصرہ کر لیا گیا۔ جو شخص بھی اسپتال سے باہر آیا، سنائپر کا نشانہ بن گیا۔ اس کے بعد ذلت کی انتہا کرتے ہوئے اسرائیلی سپاہیوں نے اسپتال کی بجلی منقطع کر دی۔ علاج بند کر دیا گیا۔ متعدّد لوگ گرفتار کر لیے گئے اور انھیں انتہائی حقارت آمیز سلوک کا نشانہ بنایا گیا۔ آکسیجن نہ ملنے سے متعدّد نومولود بچے شہید ہو گئے۔ مزید یہ کہ سپاہی کئی شہدا کی لاشیں اپنے ساتھ لے گئے۔ اس جنون میں مبتلا فوج کا ہر قدم ان کی سفاکیت، نجاست اور بے شرمی کی واضح تصویر پیش کرتا ہے۔ دو سو فلسطینیوں کی گرفتاری، نو سو مریضوں اور پانچ ہزار پناہ گزینوں کی بے دخلی کے بعد الشفا کو فوجی بیرک بنانے کا اعلان کیا گیا۔ لیکن الشفا میں مجاہدین کی موجودگی، سرنگوں میں مغویوں کو رکھنے کا دعویٰ سراسر غلط ثابت ہوا۔

۱۹، نومبر کو القوات المسلحة اليمنية (انصار اللہ) نے بڑی کارروائی کرتے ہوئے ایک تجارتی بحری جہاز گلیکسی لیڈر عملے سمیت قبضے میں لے لیا۔ اس جہاز کا تعلق اسرائیلی ریاست کے ساتھ بتایا گیا۔ یہ جہاز ہنوز انھی کے قبضے میں ہے۔ اسی روز قسام نے جحر الديك میں ایک گھر میں روپوش متعدّد سپاہیوں

کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اسی دن ۵۶ زخمیوں اور متعدّد قبل از وقت پیدا ہونے والے بچوں کو امارات کے تعاون سے رفح سے مصر منتقل کیا گیا۔ شدید نقصان کے بعد بالآخر ۲۰، نومبر کو اسرائیل نے حماس کو قیدیوں کے تبادلے کی پیشکش کی۔ ۲۱، نومبر کو امریکی ترجمان نے سات اکتوبر کے حملے میں چھے امریکی مارے جانے کا اعتراف کیا جن میں پانچ فوجی تھے۔ ابو عبیدہ نے ایک بار پھر اپنے عزائم کا اظہار کیا اور گزشتہ تین دنوں میں ساٹھ عسکری گاڑیوں کی تباہی کی خبر سنائی۔ اسی روز حزب اللہ نے اسرائیل کے مختلف مقامات پر چھے حملے کیے۔ نیز عراق سے امریکی بیس پر میزائل حملے ہوئے۔ اسی روز جنوبی افریقا نے وحشیانہ بمباری نہ روکنے پر اسرائیل سے سفارتی تعلقات ختم کر دیے۔

۲۲، نومبر صیہونی قیادت کی رسوائی میں اضافے کا دن ثابت ہوا اور مصر اور قطر کے اشتراک سے حماس اور اسرائیل کے درمیان قیدیوں کے تبادلے کا معاہدہ طے پا گیا جس کا اطلاق ۲۴ ،نومبر سے ہونا تھا۔ اس معاہدے میں اکثر شرائط حماس کی طے کردہ تھیں۔ اس سے قبل حماس شرائط تسلیم نہ کرنے پر تبادلے کی پیشکش مسترد کر چکی تھی۔ اس معاہدے پر نیتن یاہو کا تبصرہ تھا کہ آج کی رات ایک مشکل رات تھی۔ یہ ایک مشکل فیصلہ ہے لیکن درست ہے۔ اس دوران مجاہدین کی کارروائیاں جاری رہیں اور ۲۲، نومبر کو سرایا القدس نے چند گھنٹوں میں گیارہ گاڑیاں تباہ کرنے کی نوید سنائی۔ یمن سے ایک کروز میزائل ایلات کی فضا میں پہنچا جسے ناکارہ بنایا گیا۔ صیہونی فوجیوں کی بمباری سے کئی ایمبولینس گاڑیاں تباہ ہو چکی تھیں۔ اس دوران پہلی مرتبہ ۱۴، ایمبولینس گاڑیاں اقوامِ متحدہ کی جانب سے ہلالِ احمر کو موصول ہوئیں۔

۲۳، نومبر کو معاہدے کی تکمیل کے لیے قیدیوں کی فہرستوں کا تبادلہ کیا گیا۔ اسی دن لبنان سے ۲۲ حملے ہوئے جن میں صفد شہر اور دیگر اسرائیلی تنصیبات کو نشانہ بنایا گیا۔ پہلی مرتبہ اتنے بڑے پیمانے پر اس معرکے میں حزب اللہ نے کارروائی کی۔ اسی روز المقاومة الإسلامية في العراق نے بھی امریکی اڈوں عین الاسد اور اربیل پر ڈرون حملے کیے۔ ابو عبیدہ نے اپنے خطاب میں بتایا کہ جنگ کے آغاز سے اب تک مجاہدین ۳۳۵ گاڑیاں تباہ کرنے میں کامیاب رہے۔ گاڑیاں خالی نہیں ہوتیں، سپاہی کتنے مرے ہوں گے قارئین بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں۔ مزید یہ کہ فریقین میں قیدیوں کے تبادلے کی شرائط پر اتفاق ہو گیا، شرائط یہ تھیں:

جنگ بندی کے معاہدے کی اہم شرائط

۱) ہر دس مغویوں کے بدلے تیس فلسطینی قیدی رہا ہوں گے۔

۲) تبادلے میں صرف خواتین اور بچے رہا ہوں گے۔

۳) جنگ بندی کے دوران فوجی نقل و حرکت موقوف ہوگی۔

۴) غزہ کے ہر علاقے میں امداد اور ایندھن کی ترسیل بلا روک ٹوک ہوگی۔

۵) جنوب میں کوئی جہاز نہیں آئے گا۔ شمال میں صبح دس سے شام چار تک کوئی جہاز پرواز نہیں کرے گا۔

۶) دورانِ جنگ بندی کوئی گرفتاری، تلاشی یا تفتیش نہیں ہوگی۔

۲۴، نومبر سے ۳۰، نومبر تک سات روز جنگ بندی رہی جس میں اسرائیل نے متعدّد مقامات پر شرائط کی خلاف ورزی کی۔ بہر حال اس عرصے میں ۲۴۰ فلسطینی خواتین اور بچے[۷] اسرائیلی عقوبت خانوں سے رہا ہوئے جبکہ ۱۱۰ مہمانوں کو حماس نے وداع کیا جن میں ۸۰، اسرائیلی شہری تھے۔ بہت سے امداد اور ایندھن کے ٹرک بھی غزہ میں داخل ہوئے۔ اس دوران ۲۶، نومبر کو انصار اللہ نے ایک اور تجارتی بحری جہاز قبضے میں لے کر یمن منتقل کیا اور تمام ممالک کو پیغام دیا کہ ہر وہ جہاز جس کا اسرائیل سے کوئی تعلق ہو، اس کو نشانہ بنایا جائے گا، لہٰذا تمام ممالک اپنے شہریوں کو اور تمام تاجر اپنے جہازوں کو اسرائیلی جہازوں سے دور رکھیں۔ ۳۰، نومبر کو القدس میں دو بہادر نوجوانوں نے بڑی کارروائی کی۔ ایک مقام پر فائرنگ کرکے دس یہودیوں کو زخمی کیا جن میں سے چار جہنم واصل ہوئے۔ ان مرنے والوں میں ایک سن رسیدہ ربی بھی تھا جو پرلے درجے کا متعصب یہودی تھا اور فلسطینیوں کے قتلِ عام کی ترغیب میں پیش پیش رہتا تھا۔ اسے خاص طور پر ہدف بنایا گیا۔

---

[۷] رہائی پانے والے قیدیوں میں ایک بچہ ”نزل“ بھی شامل تھا جو جنین کا رہائشی ہے۔ بی بی سی نے اس بچے سے کی گئی گفتگو شائع کی ہے۔ اس بچے کا کہنا ہے کہ ہمیں جیل میں بستر، کپڑے اور کھانا میسر نہیں تھا۔ بے تحاشا تشدد کیا جاتا تھا۔ کتے چھوڑ دیے جاتے۔ رام اللہ پہنچنے پر محمد نزل کا معائنہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ ان کے دونوں ہاتھوں کی ہڈیاں ٹوٹی ہوئی ہیں۔ بی بی سی نے ایکسرے رپورٹ دو برطانوی ڈاکٹروں کو بھی دکھائی جنھوں نے ہڈیاں ٹوٹنے کی تصدیق کی۔ ایک اور خاتون قیدی ”مرہ باقیر یا مرح بکیر“ نے بھی بی بی سی کے سامنے اسرائیلی قید کے مظالم بیان کیے۔ انھیں ۲۰۱۵ء میں سولہ سال کی عمر میں گرفتار کیا گیا تھا۔

یکم دسمبر کو جنگ بندی ختم ہوگئی، جس کے بعد صیہونی طیاروں نے خان یونس اور رفح پر شدید بمباری کی جبکہ مجاہدین نے سدیروت، عسقلان اور بئر السبع کو راکٹوں سے لرزا کر رکھ دیا۔ اسی دن سرایا القدس نے اسرائیلی ڈرون بھی مار گرایا۔ ۲، دسمبر سرایا القدس کی کامیابیوں کا دن تھا۔ مجاہدین نے تل ابیب، اشدود، عسقلان اور متعدّد دیگر شہروں پر شدید گولہ باری کی۔ عبرانی چینل 3 کے مطابق: آج کے دن آئرن ڈوم پر ستر ملین (سات کروڑ) ڈالر خرچہ آیا۔ واضح رہے کہ مجاہدین کا ۳۶۰۰ ڈالر سے تیار کردہ خود ساختہ ایک راکٹ فضا میں تباہ کرنے پر آئرن ڈوم پچاس ہزار ڈالر صرف کرتا ہے۔ رات کے وقت وزارتِ صحت غزہ نے ۱۵۲۰۷، شہریوں کی شہادت کا اعلامیہ جاری کیا۔ ۳، دسمبر معرکۂ طوفان الاقصیٰ کے لیے بہت مبارک ثابت ہوا جب ایک ہی مقام پر خیموں میں موجود ساٹھ صیہونی سپاہیوں کو دھماکوں میں اڑا دیا گیا۔ صرف یہی نہیں، بیتِ لاہیا میں ایک سرنگ میں بارود بچھا کر صیہونی فوجیوں کی بڑی تعداد کو اس میں داخل ہونے دیا گیا۔ بعد ازاں دھماکے سے سرنگ تباہ کردی گئی اور صیہونی ابدی نیند سلا دیے گئے۔ اسی دن عراق سے امریکی ٹھکانوں پر حملہ کیا گیا۔ ۴ سے ۶، دسمبر کے دوران مجاہدین نے ساٹھ سے زائد گاڑیاں تباہ کیں، متعدّد صیہونی سپاہی صفر کی مسافت سے قتل کیے گئے۔ ایک سرنگ میں داخل ہونے والے سپاہیوں کو دھماکے سے اڑا دیا گیا نیز ایک گھر میں موجود صیہونی سپاہیوں پر حملہ کیا گیا جس میں ۱۸، سپاہی ہلاک ہوئے۔ اس دوران حزب اللہ نے شمالی اسرائیل میں دس حملے کیے نیز یمن سے ایلات پر ایک بیلسٹک میزائل داغا گیا۔ بزدل فوج کا کسی پر بس نہ چلا تو غزہ کے انتہائی شمال میں واقع کمال عَدوان اسپتال کا محاصرہ کر لیا۔ تمام افراد کو نکلنے کا حکم دیا اور جنریٹر تباہ کر دیا۔ اور ان کے بس میں تھا بھی کیا۔ ۷، دسمبر کو بھی شمالی غزہ کے محلے شیخ رضوان میں ایک سرنگ میں داخل ہونے والے فوجیوں کو گھات لگا کر موت کی وادی میں دھکیلا گیا۔ اس روز غزہ سے متعدّد شہری حراست میں لیے گئے۔ اس تاریخ تک غزہ سے گرفتار کیے گئے شہریوں کی تعداد سات سو تک پہنچی۔ وزارتِ صحت کے مطابق شہدا کی تعداد ۱۷۱۷۷ ہو چکی ہے۔

یہ تھی معرکۂ طوفان الاقصیٰ کی دو مہینے کی روداد۔ جنگ اب بھی جاری ہے اور قدس کی آزادی تک جاری رہے گی۔ نہیں معلوم کہ اس میں مہینے لگیں گے یا سال، دہائیاں گزر جائیں گی یا صدیاں، لیکن جدوجہد برقرار

رہے گی۔ شیخ عزالدین القسام کا وہ جملہ جسے ابو عبیدہ اکثر ذکر کرتے ہیں ہمارا مطمحِ نظر ہے: إنه لجهاد، نصر أو استشهاد "بلا شبہہ یہ جہاد ہے، اس میں مدد و فتح ہے یا شہادت"۔ ہم القدس کی آزادی تک لڑتے رہیں گے، فتح یاب ہوں گے یا جان دے کر سرخ رو ہو جائیں گے۔

ایک بات ضرور قابلِ ذکر ہے کہ اس عرصے میں صیہونی جارحیت کے خلاف امریکہ، برطانیہ، فرانس، جرمنی، اسپین، آسٹریلیا، ترکیہ اور دیگر ممالک میں جس بڑے پیمانے پر لاکھوں لوگ احتجاج کے لیے نکلے لائقِ تحسین ہے۔ نیز متعدّد امریکی یہودی بھی اس احتجاج میں نمایاں طور متحرک نظر آئے۔ حتیٰ کہ اسرائیل کے اندر بعض یہودیوں اور عیسائیوں نے احتجاج کیا جس پر انھیں تشدد کا سامنا کرنا پڑا۔

آخری بات یہ ہے کہ اس جنگ کے آغاز میں چند ایک ملکوں نے ڈرتے ڈرتے اسرائیل کے خلاف کچھ آواز اٹھائی تھی، لیکن امریکی بیڑے کی آمد کے بعد وہ گھٹی گھٹی سی آواز بھی دم توڑ گئی، ابو عبیدہ متعدّد بار عرب طاقتوں اور دیگر اسلامی ممالک کو نام لے لے کر بلاتے رہے اور اس سنہری موقعے سے فائدہ اٹھانے کی دعوت دیتے رہے لیکن بلا استثنا سب کے سب طاقت کے سامنے سر جھکائے کھڑے رہے۔ بقولِ اقبال: "تری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے"۔ بحیثیتِ ریاست کسی ایک ملک نے بھی اس جنگ میں حصہ نہیں لیا۔ بظاہر لگتا ہے کہ یہ بھی اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کا ایک نمونہ ہے۔ اگر دیگر ممالک ساتھ ہوتے تو کہنے والے کہہ سکتے تھے کہ سعودیہ یا ترکیہ یا ایران کے تعاون سے فلسطینی یہ جنگ جیت رہے ہیں۔ لیکن بقولِ فیض: اب یہاں کوئی نہیں، کوئی نہیں آئے گا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے تنِ تنہا مجاہدین کی عظیم الشان مدد و نصرت نصیب فرمائی۔

*****

مولانا زاہد الراشدی

القدس کا تاریخی پس منظر اور طوفان الاقصیٰ: ہماری ذمے داری

قضیۂ فلسطین کے موضوع پر لکھے گئے دو مضامین کا مجموعہ

بیت اللہ کی طرح بیت المقدس بھی سیدنا حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تعمیر کیا اور اس کی تعمیر بیت اللہ کے چالیس سال بعد ہوئی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مکہ مکرمہ میں بیت اللہ تعمیر کر کے وہاں اپنے ایک بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو بسایا جبکہ فلسطین میں بیت المقدس تعمیر کر کے وہاں دوسرے بیٹے حضرت اسحاق علیہ السلام کو بسا دیا۔ حضرت اسحاق علیہ السلام کی اولاد میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کا عظیم الشان سلسلہ قائم فرمایا۔ ''اسرائیل'' حضرت یعقوب علیہ السلام کا لقب تھا اور انھی کی اولاد کو بنی اسرائیل کہا جاتا ہے۔ اس خاندان کو اپنے دور میں اللہ تعالیٰ نے بہت سی عظمتوں سے نوازا اور دین و دنیا کی شوکتیں عطا فرمائیں۔ ہزاروں نبی اس خاندان میں پیدا ہوئے، چار بڑی آسمانی کتابوں میں سے تین یعنی تورات، زبور اور انجیل اس خاندان کے نبیوں پر نازل ہوئیں۔ اور اللہ تعالیٰ نے دنیوی بادشاہت بھی ایسی عطا فرمائی کہ پھر ایسی حکومت کسی کو نہ مل سکی۔ قرآنِ کریم کے ارشاد کے مطابق حضرت سلیمان علیہ السلام نے دعا مانگی تھی کہ یا اللہ مجھے ایسی بادشاہت دے جو میرے بعد کسی اور کو نہ ملے۔ یہ دعا قبول کرتے ہوئے اللہ رب العزت نے انھیں انسانوں، جنوں، جانوروں، ہوا اور سمندر پر حکمرانی عطا فرمائی اور بے پناہ قوت و اقتدار سے نوازا۔ لیکن جب یہی بنی اسرائیل سرکشی اور نافرمانی پر آ گئے اور انھوں نے بغاوت کی ساری حدوں کو عبور کر لیا تو اللہ تعالیٰ نے انھیں دوسری اقوام کے ذریعے سزا دی۔ بیت المقدس کئی بار ان کے ہاتھ سے نکلا اور دنیا کی متعدّد جابر قوموں نے عذابِ الٰہی بن کر بنی اسرائیل کو وقتاً فوقتاً برباد کیا۔ لیکن پہلے مرحلے میں جب انھوں نے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کیا اور اپنے گناہوں سے توبہ کی تو خالقِ کائنات نے ان کا ہاتھ تھاما اور ان کی مدد کر کے انھیں بیت المقدس کی حکمرانی پر بحال کر دیا۔ اس سلسلے میں قرآنِ کریم نے دو جنگوں کا تفصیل

کے ساتھ ذکر کیا ہے: ایک بار جب بنی اسرائیل کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قیادت میں فرعون کے مظالم اور غلامی سے نجات ملی اور انھوں نے بحیرۂ قلزم عبور کرتے ہوئے صحراے سینا میں پڑاؤ کیا جبکہ فرعون اپنے لشکر سمیت بحیرۂ قلزم میں غرق ہوگیا تو بنی اسرائیل کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم ملا کہ وہ بیت المقدس کو اس وقت کی جابر قوم سے آزاد کرانے کے لیے جہاد کریں اور اس مقدس شہر پر اپنا اقتدار بحال کریں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے عظیم پیغمبر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذریعے بنی اسرائیل سے اپنی مدد کا وعدہ کیا اور جہاد میں کامیابی کی ضمانت دی مگر غلامانہ ذہنیت کی حامل قوم کی نظر ظاہری اسباب سے آگے نہ بڑھ سکی اور انھیں اللہ تعالیٰ کے وعدے پر یقین نہ آیا۔ چنانچہ انھوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے صاف طور پر کہہ دیا کہ بیت المقدس پر قابض قوم بڑی طاقت ور اور جابر ہے اور ہم کسی طرح اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے اس لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کا خدا دونوں جا کر جنگ کریں، جب وہ کامیاب ہو کر اس طاقت ور قوم کو بیت المقدس سے نکال دیں گے تو ہم وہاں داخل ہو جائیں گے۔ اس وقت تک ہم یہیں بیٹھے ہیں اور جہاد کے لیے جانے کو قطعًا تیار نہیں ہیں۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل پر چالیس سال تک بیت المقدس میں داخلہ حرام قرار دے دیا اور وہ چالیس سال تک صحراے سینا میں بھٹکتے رہے۔ اس کے بعد بنی اسرائیل کی نئی نسل آئی جس نے حضرت یوشع بن نون علیہ السلام کی قیادت میں جہاد کیا اور بیت المقدس کو آزاد کرایا۔

دوسری جنگ جس کا تذکرہ قرآنِ کریم میں ہے وہ جالوت بادشاہ کے زمانے میں ہوئی جو اپنے وقت کا ایک جابر اور ظالم حکمران تھا اور اس نے بنی اسرائیل پر مظالم کی انتہا کر دی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت طالوت کو بنی اسرائیل کا بادشاہ بنا کر جالوت کے خلاف جہاد کا حکم دیا اور وہ عظیم الشان معرکہ بپا ہوا جس میں ایک طرف حضرت طالوت کی کمان میں صرف تین سو تیرہ مجاہد تھے جبکہ دوسری طرف جالوت کم و بیش ساٹھ ہزار کے لشکرِ جرار کی کمان کرتا ہوا میدان میں تھا۔ اس جنگ میں خود جالوت کا مقابلہ حضرت داؤد علیہ السلام سے ہوا جو ابھی نوجوان تھے۔ جالوت سر سے پاؤں تک لوہے میں ڈھکا ہوا بکتر بند لباس میں ملبوس تھا اور دو آنکھوں کے علاوہ اس کے آہنی لباس میں کہیں کوئی سوراخ نہیں تھا اور اس کے دونوں ہاتھوں میں تلواریں تھیں۔ جبکہ حضرت داؤد علیہ السلام سادہ کپڑوں میں ''گوپیا'' ہاتھ میں پکڑے اس کے سامنے جا کھڑے ہوئے۔ گوپیا خاص طرز کی غلیل ہوتی ہے جس

کی ڈوری کے سرے پر چھوٹا سا پتھر لپیٹ کر ڈوری کو گھماتے ہوئے اسے نشانے پر مارتے ہیں اور وہ پتھر گولی کا کام کرتا ہے۔ حضرت داؤد علیہ السلام سامنے آئے تو جالوت نے تلوار کا وار کیا جسے حضرت داؤد علیہ السلام نے پھرتی سے ناکام بنا دیا۔ پھر حضرت داؤد علیہ السلام نے گوپیا کی ڈوری گھماتے ہوئے جالوت کی آنکھ کا نشانہ لے کر پتھر مارا تو وہ سیدھا آنکھ کے سوراخ میں داخل ہو کر دماغ میں گھس گیا اور جالوت وہیں ڈھیر ہو گیا۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو فتح سے ہم کنار کرتے ہوئے بتایا کہ اصل قوت ظاہری اسباب و وسائل میں نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت میں ہے۔ یہ وہ دور تھا جب بنی اسرائیل حضرات انبیائے کرام علیہم السلام کی تعلیمات کے وارث اور علم بردار تھے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے کفر و جبر کے مقابلے میں ان کی بہت سے مواقع پر مدد کی۔ لیکن آج صورتِ حال برعکس ہے۔ بنی اسرائیل کے دونوں گروہ یہودی اور عیسائی آسمانی تعلیمات سے محروم ہو چکے ہیں اور انھوں نے نہ صرف وحیِ الٰہی اور آسمانی تعلیمات کو تاریخ کے دھندلکوں میں گم کر دیا ہے بلکہ وہ انسانی سوسائٹی میں آسمانی تعلیمات کی عمل داری سے اعلانیہ طور پر دست بردار بھی ہو چکے ہیں۔ چنانچہ انبیائے کرام علیہم السلام کے مولد و مسکن اور مرکز و مستقر بیت المقدس پر ان کا کوئی استحقاق باقی نہیں رہا۔ بیت المقدس کے وارث صرف اور صرف وہ مسلمان ہیں جو آسمانی تعلیمات اور وحیِ الٰہی پر ایمان رکھتے ہیں، انسانی سوسائٹی میں وحیِ الٰہی اور خداوندی قوانین کے نفاذ کے علم بردار ہیں اور وحیِ الٰہی ان کے پاس محفوظ حالت میں موجود ہے۔ اس لیے صرف وہی حضرات انبیائے کرام علیہم السلام کی تعلیمات و مشن اور بیت المقدس کے وارث ہیں اور ان شاء اللہ العزیز جلد یا بدیر بیت المقدس پر ان ہی کا اقتدار قائم ہو کر رہے گا۔

آج بیت المقدس کی بازیابی اور فلسطینی مسلمانوں کے حقوق کی بحالی کی جدوجہد کے حوالے سے ہمارا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ دنیا کے بیش تر مسلم ممالک کے حکمران طبقات آسمانی تعلیمات سے دست برداری اور انسانی سوسائٹی پر وحیِ الٰہی کی حکمرانی سے انکار کے معاملے میں یہود و نصاریٰ کے ہم خیال ہو چکے ہیں، وہ عملاً انھی کے کیمپ میں شمار ہوتے ہیں اور وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ان ساتھیوں جیسا کردار ادا کر رہے ہیں جنھوں نے جہاد سے انکار کر کے پیچھے بیٹھے رہنے کا معاملہ کیا تھا، اسی لیے ان سے ”جہادِ فلسطین“ میں کسی مثبت کردار کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ اور اس لحاظ سے اسلامی تحریکات کو بیک وقت دو محاذوں کا سامنا ہے۔

ایک طرف یہود و نصاریٰ کی مشترکہ قوت ہے جبکہ دوسری طرف انھی کے مشن کی حامل نام نہاد مسلمان حکومتیں ہیں۔ اس لیے راستہ بڑا کٹھن اور جدوجہد بہت صبر آزما ہے، لیکن اللہ تعالیٰ آج بھی وہی ہے جس نے جالوت جیسے آہن پوش کمانڈر کے مقابلے میں حضرت داؤد علیہ السلام جیسے نہتے نوجوان کو فتح دی تھی۔ چنانچہ اگر آج بھی ہم اللہ تعالیٰ کے سب سے طاقت ور ''پاور ہاؤس'' کے ساتھ اپنا کنکشن جوڑ لیں اور ایمانی قوت کے ساتھ کفر اور منافقت کے مقابلے میں ڈٹ جائیں تو یقیناً دونوں محاذوں پر فتح ہوگی اور آج بھی صرف غلیل سے لڑنے والے مسلمانوں کے ہاتھوں بیت المقدس آزاد ہوگا بلکہ پورے عالمِ اسلام پر بھی خلافت کا پرچم ایک بار پھر آن بان کے ساتھ لہرا کر رہے گا۔ حضرت حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ غزوۂ خندق کے موقعے پر جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں حکم دیا: «اكتبوا لي من تلفظ بالإسلام» یعنی کلمہ پڑھنے والوں کی تعداد معلوم کرو کتنی ہے۔ یہ پہلی مردم شماری تھی جو غزوۂ خندق کے موقعے پر ہوئی تھی۔ جب مسلمان گنے گئے تو چھوٹے بڑے ملا کر پندرہ سو کے لگ بھگ تھے۔ حضرت حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ نے رپورٹ اس طرح پیش کی کہ یا رسول اللہ! جب ہم تین سو تیرہ تھے تو کافر ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکے تھے، آج تو ہم پندرہ سو ہیں۔ اس پر ہم ذرا غور کریں کہ آج دنیا میں کتنے مسلمان ہیں اور ان کی کیا حالت ہے۔ اصل میں بات یہ ہے کہ ایمان ہو تو پندرہ سو دنیا پر حاوی ہو جاتے ہیں اور ایمان کمزور ہو تو وہی ہوتا ہے جو آج ہمارا حال ہے۔

آج کل ''طوفان الاقصیٰ'' کے متعلق یہ سوال کیا جا رہا ہے کہ حماس نے اسرائیل پر حملے کا اقدام کیوں کیا اور اس سے فائدہ کیا ہوا ہے؟ میرے خیال میں انھوں نے اس سے تین اہداف حاصل کیے ہیں: پہلا یہ کہ حماس نے سات اکتوبر کو اسرائیل پر حملہ اس ماحول میں کیا کہ چند بڑے مسلم ممالک کی طرف سے اسرائیل کو تسلیم کیے جانے کے حوالے سے مذاکرات چل رہے تھے اور خاصی پیش رفت ہو رہی تھی۔ مگر حماس کے حملے نے اس منصوبے کو روک دیا ہے اور اب تک اس پر اسرائیلی ردِعمل کے نتیجے میں ہزاروں فلسطینی قربان ہو چکے ہیں۔ اتنے بڑے منصوبے کو روکنے کے لیے اتنی بڑی قربانی کی ضرورت تھی ورنہ آج صورتِ حال مختلف ہوتی۔ اس حوالے سے میں حماس کو خراجِ عقیدت پیش کرتا ہوں کہ انھوں نے بروقت جرات مندانہ قدم اٹھایا ہے۔

دوسرا یہ کہا جاتا تھا کہ اسرائیل ناقابلِ تسخیر قوت ہے اور اسرائیل کا دفاعی نظام اتنا مضبوط ہے کہ اس پر کوئی حملہ کرنے کی جرات نہیں کر سکتا۔ حماس کے طوفان الاقصیٰ آپریشن سے یہ مغالطہ بھی دور ہو گیا ہے۔ اسرائیل اور اس کے سرپرستوں کو اس وقت شدید پریشانی لاحق ہے کہ اسرائیل سے بھی لڑا جا سکتا ہے اور اس کے ناقابلِ تسخیر ہونے کا تصور پاش پاش ہو کر رہ گیا ہے۔ درمیان میں یہ بات عرض کروں گا کہ اس طرح کے سوالات اس لیے پیدا ہوتے ہیں کہ نئی نسل اپنی تاریخ سے واقف نہیں ہے۔ ہم نے صلاح الدین ایوبی اور نور الدین زنگی رحمۃ اللہ علیہما کا نام سن رکھا ہے لیکن ان کی زندگی کے بارے میں ہم نہیں جانتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے ریاستی نظامِ تعلیم میں ہماری نئی نسل کو دانستہ طور پر اپنے ماضی سے بے خبر رکھا گیا ہے جبکہ ہمارے دینی مدارس میں بھی یہ ذوق نہیں ہے اور ہماری غفلت ہے کہ ہم اس کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔

تیسرا یہ کہ اب نوبت یہاں تک آگئی تھی کہ ہماری ایک بڑی شخصیت نے کہہ دیا تھا کہ یہ فلسطین میں اسرائیل اور حماس کے دو گروہوں کا جھگڑا ہے۔ میرے خیال میں حماس نے ثابت کر دیا ہے کہ یہ دو گروہوں کا جھگڑا نہیں ہے اور یہ صرف فلسطین کا جھگڑا بھی نہیں ہے، بلکہ یہ جھگڑا جکارتہ کا ہے، استنبول، لاہور، قاہرہ، لندن اور واشنگٹن کا جھگڑا ہے۔ اسرائیل کی بمباری کے نتیجے میں دس ہزار سے متجاوز شہدا ایک بار پھر اس مسئلے کو عالمی منظر پر لے آئے ہیں اور اب یہ مسئلہ فلسطین کا نہیں رہا، بلکہ یہ عالمِ عرب اور عالمِ اسلام کے مسئلے کے طور پر دنیا کے سامنے آیا ہے۔ فلسطینی عوام نے قربانی دے کر عالمی رائے عامہ کو ایک بار پھر فلسطین اور بیت المقدس کے عالمی تنازعے کی طرف متوجہ کر لیا ہے۔ بڑے کام قربانی کے بغیر نہیں ہوتے اور جب مسلم حکومتیں کچھ نہ کریں تو عوام کی قربانی ہی سے مقصد حاصل ہوتا ہے۔ اس صورتِ حال میں ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ اس حوالے سے تین دائرے ہیں:

پہلا دائرہ یہ ہے کہ مسلم حکمران رسم پوری کرنے کے لیے ہی کہیں اکٹھے ہو جائیں۔ عرب لیگ اور اسلامی تعاون تنظیم (او آئی سی) والے مل بیٹھیں۔ مجھ سے ایک دوست نے پوچھا کہ اکٹھے بیٹھ کر وہ کیا کریں؟ میں نے عرض کیا کہ چائے پییں، گپ شپ کریں اور آخر میں تھوڑی دیر مراقبہ کر کے اپنے دل سے پوچھیں کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقعے پر ارشاد فرمایا: «فاستفتِ قلبک» ”اپنے دل سے پوچھو“۔ میرا

ان حکمرانوں سے ایک ہی مطالبہ ہے کہ کچھ دیر کے لیے مل بیٹھیں، کھانے اور چائے کے بعد تھوڑی دیر سر نیچا کر کے اپنے گریبان میں جھانک کر اپنے دل سے پوچھیں کہ کیا کرنا ہے؟ میں نے کہا کہ آپ ان حکمرانوں سے مایوس ہوں گے لیکن میں ان کے دل سے مایوس نہیں ہوں۔

دوسرا دائرہ عوامی بیداری کا ہے اور آپ دیکھ رہے ہیں کہ اس مسئلے پر دنیا بھر میں آواز بلند ہو رہی ہے۔ اس سلسلے کو اور زیادہ منظم کرنے کی اور مزید پھیلانے کی ضرورت ہے۔ جتنی زیادہ آواز بلند ہو گی اتنا ہی فلسطینی مسئلے کو تقویت ملے گی اور حماس کا حوصلہ بڑھے گا۔ ہماری ذمے داری ہے کہ ہم فلسطینی مسلمانوں کی حمایت کریں اور انھیں حوصلہ دلائیں۔ گزشتہ دنوں حماس کے نمائندے ڈاکٹر خالد صاحب کا پیغام ملا کہ جب آپ لوگ جلوس نکالتے ہیں، سڑکوں پر آتے ہیں تو ہمارا حوصلہ بڑھتا ہے کہ ہم اکیلے نہیں ہیں، بلکہ لاہور، جکارتہ اور استنبول وغیرہ ہمارے ساتھ ہیں۔ ان مظاہروں، سیمیناروں اور پروگراموں نے فلسطین اور حماس کو حوصلہ دیا ہوا ہے کہ ہمارے مسلمان بھائی ہماری پشت پر ہیں۔ ہم اس سیاسی جنگ میں اپنا کردار ادا کریں، باہمی تقسیم چھوڑ کر فلسطین کی حمایت کے حوالے سے مذہبی، سیاسی یا سماجی جو پارٹی بھی کام کر رہی ہے اس کے ساتھ شریک ہوں اور جو کچھ بھی ہم کر سکتے ہیں اس سے دریغ نہ کریں۔

تیسرا دائرہ اپنے مظلوم بھائیوں، بہنوں اور بچوں تک امداد پہنچانے کا ہے۔ جو بھی قابلِ اعتماد ذرائع ہوں ان کے ذریعے فلسطینی مسلمانوں کی جتنی بھی مدد کر سکیں ہمیں کرنی چاہیے۔ اللہ رب العزت فلسطینیوں کی غیبی نصرت و مدد کے ساتھ انھیں اس جہاد میں کامیابی سے ہم کنار فرمائیں اور ہمیں اس سلسلے میں اپنی ذمے داریاں ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائیں۔

* * * * *

ماخذ: https://zahidrashdi.org/773

https://zahidrashdi.org/4543

ادا جعفری

مسجدِ اقصیٰ

ایسا اندھیرا تو پہلے نہ ہوا تھا لوگو!
لو چراغوں کی تو ہم نے بھی لرزتے دیکھی
آندھیوں سے کبھی سورج نہ بجھا تھا لوگو!
آئینہ اتنا مکدر ہو کہ اپنا چہرہ
دیکھنا چاہیں تو اغیار کا دھوکا کھائیں
ریت کے ڈھیر پہ ہو محملِ اَرماں کا گماں
منزلیں کاسۂ دریوزہ گری بن جائیں
قافلے لٹتے ہی رہتے ہیں گزر گاہوں میں
لوٹنے والوں نے کیا عزمِ سفر بھی لوٹا؟
دَجلۂ خوں تو نئی بات نہیں ہے، یہ کہو
وہ جو ڈوبا ہے، سفینہ ہے کہ ساحل ڈوبا
جادۂ شوق ہے کہ مسجدِ اقصیٰ پہلے
دل بھی قبلہ ہے، یہ قبلہ نہ ڈھا تھا پہلے
نامناسب تو نہ تھا شعلہ بیاں بھی ہوتے
تم مگر شعلہ بہ دل، شعلہ بہ جاں بھی ہوتے
تم تو خورشید بکف تھے سرِ بازارِ وفا
کیوں حریفِ نگہِ چشمِ تماشا نہ ہوئے
کِس کی جانب نگراں تھے کہ لگی ہے ٹھوکر
تم تو خود اپنے مقدر کی عَناں تھامے تھے
اِس صحیفے میں ندامت کہیں مفہوم نہ تھی
اِس خریطے میں ہزیمت کہیں مرقوم نہ تھی
رَن سے آتے تھے تو باطبلِ ظفر آتے تھے
ورنہ نیزوں پہ سجائے ہوئے سر جاتے تھے
مِٹ نہ پائے تھے بگولوں سے نقوشِ کفِ پا
اِن راہوں میں ہیں رسولوں کے نقوشِ کفِ پا
محترم ہے مجھے اِس خاک کا ذرہ ذرہ
ہے یہاں سرورِ کونین کے سجدے کا نشاں
اِس ہوا میں مِرے آقا کے نفَس کی خوشبو
اِس حرم میں مِرے مولا کی سواری ٹھہری
اِس کی عظمت کی قسم اَرض و سما نے کھائی
تم نے کچھ قبلۂ اوّل کے نگہبان! سنا؟
حرمتِ سجدہ گہِ شاہ کا فرمان سنا؟

زندگی مرگ عزیزاں کی تو سہہ جاتی ہے
مرگِ ناموس مگر ہے وہ دہکتی بھٹی
جس میں جل جائے تو خاکسترِ دل بھی نہ ملے
اور تپ جائے تو کندن ہے وجودِ انساں
پھر یہ پگھلے ہوئے لمحاتِ کراں تا بہ کراں
آپ مینارۂ انوار میں ڈھل جاتے ہیں
عرش سے خاک نشینوں کو سلام آتے ہیں
خار زاروں کو کسی آبلہ پا کی ہے تلاش
وادیِ گل سے ببولوں کا خریدار آئے
دَلق پوش آئے، غلاموں کا جہاں دار آئے
پا پیادہ کوئی پھر قافلہ سالار آئے
ریگ زاروں میں کوئی تشنہ دہن آجائے
ہوش والو! کوئی تلقینِ جنوں فرمائے

❊ ❊ ❊ ❊ ❊

اے خاصۂ خاصانِ رسل وقتِ دعا ہے
امّت پہ تری آ کے عجب وقت پڑا ہے

fiqhacademy.com.pk info@fiqhacademy.com.pk FiqhAcademy
FiqhAcademy FiqhAcademyPK fiqhacademy +92 330 3474223

فقہ اکیڈمی: C-335، بلاک-1، گلستانِ جوہر، بالمقابل جامعہ کراچی، یونیورسٹی روڈ